رسائل و مسائل

حصہ چہارم

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳ - ای - شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

برانچ :- ۱۶ - بیت المکرم (پہلی منزل) ڈھاکہ

41
S
11B

رسائل و مسائل

حصّہ چہارم

از

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳۔ ای۔ شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

برانچ :۔ ۱۶۔ بیت المکرم (پہلی منزل)، ڈھاکہ

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

طابع : اخلاق حسین ڈائریکٹر

ناشر : اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مطبع : ایورگرین پریس لاہور

اشاعت اوّل ______ ۱۱۰۰

〃 دوم اکتوبر ۱۹۶۷ء ۲۰۰۰

قیمت :
اعلیٰ ایڈیشن ۵٫۷۵ روپے
پلاسٹک کور ۱٫۰۰ روپیہ
} ۶.۷۵ روپے
سستا ایڈیشن ۳٫۵۰ روپے

فہرست

عام مسائل

دلچسپ یمین میخ 11
سپاسنامے اور استقبال 14
غلط الزامات 17
غیر اسلامی نظام میں اجرائے حدود شرعیہ 18
جنت کا محل وقوع 19
فتنہ پردازی کا مرض لاعلاج 20
ناقابلِ توجیہ حوادثِ حیات 22
خواب میں زیارتِ نبوی ﷺ 26
گول مول جوابات 29
مباہلہ و مناظرہ 31
اعتراض کے پردے میں بہتان 34
بیوی اور والدین کے حقوق 35
اذکارِ مسنونہ 38

افسرانِ بالا کے آنے پر مستعدی کی نمائش ۴۰
مصائب کے ہجوم میں مومن کا نقطۂ نظر ۴۲
نظامِ تعلیم سے متعلق چند بنیادی سوالات ۴۵
شیطان کی حقیقت ۵۲
لفظ فطرت کا مفہوم ۵۶
فتنۂ تصویر ۵۸
قرآن اور سائنس ۵۹
مسئلہ ارتقا ۶۰
انسان کے مورث اعلیٰ حضرت آدمؑ ۶۲
مسئلہ تقدیر ۶۶
اجنبی ماحول میں تبلیغِ اسلام ۶۷
پردہ اور اپنی پسند کی شادی ۷۴
ڈاڑھی پر مسلمانوں کے اعتراضات ۸۴
ڈاڑھی اور فوجی ملازمت ۸۷
چند جدید ملحدانہ نظریات کا علمی جائزہ ۹۱
پاکستان میں مسیحیت کی ترقی کے وجوہ ۱۰۱
تصویر سے اظہارِ برأت ۱۰۶
لفظ نکاح کا اصل مفہوم ۱۰۷

حقیقی توبہ ۱۱۱
عورت کی عصمت و عفت کا مستقبل ۱۱۲
اُردو زبان اور موجودہ حکمران ۱۱۴
غلافِ کعبہ کی نمائش اور جلوس ۱۱۷
امر بالمعروف کا فریضہ کیسے انجام دیا جاتے؟ ۱۳۷
حجرِ اسود اور خانہ کعبہ کے متعلق غیر مسلموں کی غلط فہمیاں ۱۴۱

معاشی مسائل

معاشی مسائل سے متعلق چند عملی سوالات ۱۴۷
سود کے بغیر معاشی تعمیر ″
اسلامی حکومت اور قومی ملکیت ۱۴۹
اسلامی حکومت اور فرض ناشناس ملازمین ۱۵۰
پیشگی سودے بازی ۱۵۳
سود اور غیر ملکی تجارت ″
غیر ملکی سرمایہ پر سود ۱۵۴
کیا زکوٰۃ کے علاوہ انکم ٹیکس عائد کرنا جائز ہے؟ ۱۵۵
مسئلہ سود کے متعلق چند اشکالات۔ ۱۵۶
زیادہ سے زیادہ صرف کرو کی پالیسی ۱۵۷
بینکنگ کا نشوونما ۱۶۳
تخلیقِ زر ۱۶۸

ترجیحی حصص ۱۷۴
غیر مسلم ممالک سے اقتصادی اور صنعتی قرضے۔ //

سیاسی مسائل

سیاسی انقلاب پہلے یا سماجی انقلاب؟ ۱۷۹
اسلام میں قطع ید کی سزا ۱۸۱
اسلام میں شاتم رسول ذمی کی حیثیت ۱۸۳
اسلامی جمہوریت اور ملازمین حکومت کی حیثیت ۱۸۶
اسلامی نظریہ جہاد سے متعلق ایک شبہ ۱۸۹
دارالاسلام کی ایک نئی تعریف ۱۹۲
"اسلامی حکومت یا فرقہ وارانہ حکومت" کی مزید وضاحت ۲۰۰
طریقِ انتخاب کے مسئلے میں ریفرنڈم ۲۲۰
اسلامی ریاست اور خلافت کے متعلق چند سوالات ۲۳۳
دورِ جدید کی رہنما قوت ـــــ اسلام یا عیسائیت؟ ۲۳۸
الخلافت یا الحکومت؟ ۲۴۱
اسلامی ریاست میں ذمیوں کے حقوق ۲۴۴
اسلامی حکومت میں متعصب مستشرقین کے افکار کی اشاعت ۲۴۸
نظامِ عدل میں تغیرات اور ان کی نوعیت ۲۴۹
سائنسی دور میں اسلامی جہاد کی کیفیت ۲۵۳
اسلامی حکومت میں خواتین کا دائرہ عمل ۲۵۶

اسلامی حکومت میں معاشرہ کی اصلاح و تربیت ۲۶۱
پاکستان میں شرعی سزاؤں کے نفاذ کا مسئلہ ۲۶۶
تعبیر دستور کا حق ۲۷۶
اسلام اور جمہوریت ۲۷۹
صدر ریاست کو ویٹو کا حق ۲۸۳

تحریک اسلامی سے متعلق

اقامتِ دین کے بارے میں چند ذہنی اشکالات ۲۸۹
ایک مصالحانہ تجویز ۲۹۱
بے بنیاد اندیشے ۲۹۵
اللہ کے حقوق اور والدین کے حقوق ۲۹۷
طریقِ انتخاب ۲۹۹
جماعت کا موقف اور طریقِ کار ۳۰۲
کیا اقامتِ دین فرضِ عین ہے؟ ۳۳۶
تبلیغی جماعت کے ساتھ تعاون ۳۵۰
امارتِ شرعیہ بہار کا سوالنامہ اور اس کا جواب ۳۵۷

عرضِ ناشر

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کی دینی و علمی بصیرت کا ہر شخص، خواہ وہ موافق ہو یا مخالف، معترف ہے۔ احکامِ اسلامی کو صحیح شکل اور صورت میں جدید حالات پر منطبق کرنے کی جو خداداد صلاحیت آپ کو حاصل ہے، اس کی مثال عصرِ حاضر میں مشکل سے ملے گی۔ اسلام کی روشنی میں زندگی کے نئے اور اُلجھے ہوتے مسائل کو حل کرنے میں آپ کا جو ممتاز مقام ہے وہ اہلِ علم و نظر سے مخفی نہیں۔

عالمِ اسلامی کے اس مایۂ ناز عالم کے رشحاتِ قلم کو زیورِ طباعت سے آراستہ کرنے کا جو شرف ہم کو حاصل ہے ہم اس پر فخر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں یہ سعادت بخشی ہے۔

اس سے قبل ہم اس کتاب کے ۳ حصے شائع کر چکے ہیں اور اب اس کا چوتھا حصہ پیش کر رہے ہیں۔ زندگی کے مختلف مراحل پر اسلامی احکام کو جاننے اور سمجھنے کے لئے یہ کتاب ایک بہترین رہنما ثابت ہو گی اور اس میں ہر سوال کا تشفی کن اور اطمینان بخش جواب ملے گا۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مختصر کتاب قارئین کو اس موضوع پر بہت سی ضخیم کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔

اخلاق حسین : ڈائرکٹر اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور

عام مسائل

دلچسپ ملین منخ

سوال: مہربانی فرماکر نہایت صاف اور سادہ الفاظ میں مندرجہ ذیل سوالات کا جواب تحریر فرماکر مشکور فرمائیں، تاکہ ان معاملات میں ہماری غلط فہمی اور لاعلمی دُور ہو جاتے :۔

۱۔ جب سابق دستوریہ نے قرارداد مقاصد پاس کی تھی تب جماعت اسلامی نے پاکستان کو دارالاسلام تسلیم کیا تھا۔ اب جبکہ گورنر جنرل صاحب بہادر نے دستوریہ کو بمعہ اپنی تمام قراردادوں اور نامکمل آئین کے ختم کر دیا ہے، موجودہ دَور میں آپ کے نزدیک پاکستان دارالاسلام ہے یا دارالحرب؟

۲۔ آپ نے ابھی تک حج کیوں نہیں کیا؟ کیا آپ نے اس سوال کے جواب میں یہ الفاظ کہے تھے؟ یا آپ کا یہی نظریہ ہے۔ "موجودہ جدوجہد ہمارے نزدیک حج سے زیادہ اہم ہے"؟

۳۔ پہلا حج فرض ہے اور دوسرا نفل۔ وہ کون کون سے ملکی ہنگامی یا مذہبی فرائض اور سنت ادا کرنے ضروری ہیں جن کے پورا کیے بغیر دوسرا حج جائز نہیں؟ جس ملک کے باشندے بھوک، افلاس اور بدحالی کی زندگی گزارتے ہیں، اس ملک کے لوگوں پر دوسرا حج جائز ہے یا نہیں؟

۴۔ شہیدانِ ختم نبوّت کو آپ کی جماعت کے ارکان و متفقین حرام موت مرنا کہتے رہے ہیں۔ کیا یہ آپ کی جماعت کا ہی نظریہ ہے، یا ان لوگوں کا ذاتی نظریہ؟ اگر ذاتی ہے تو کیا اس مقدس تحریک میں ذاتی طور پر حصّہ لینے والے لوگوں کے خلاف جماعتی کارروائی کی تھی۔ اسی طرح ایسا کرنے والوں کے خلاف آپ کوئی جماعتی کارروائی کریں گے؟

۵۔ آپ کے ہمارے شہر میں آنے پر جو ہزاروں روپے ناجائز تصرّف کیے گیے، وہ غلط نہیں؟ آپ کے آنے کی خوشی اگر لازم تھی تو آپ کے ہاتھوں سے اتنی رقم کا اناج غریبوں اور مساکین میں تقسیم کرا دیا جاتا تو بہتر نہ تھا؟

۶۔ آپ کی جماعت تعصب اور تنگ نظری پر کیوں قائم ہے۔

جواب: ۱۔ یہ بات خلاف واقعہ ہے کہ گورنر جنرل نے سابق دستوریہ کی تمام قراردادوں اور نامکمل مسودہ آئین کو ختم کر دیا ہے۔ ایسا کوئی اعلان اب تک نہیں ہوا۔ قرارداد مقاصد اور دوسرے سابق فیصلے اپنی جگہ پر قائم ہیں، البتہ نئی دستوریہ اس اختیار کی حامل ہے کہ کسی چیز کو جوں کا توں قائم رکھے یا اسے منسوخ کر کے اس کا کوئی بدل پیدا کر دے۔ لہٰذا آپ کا سوال بے محل ہے۔

۲۔ میں نے نہ کبھی یہ بات کہی اور نہ میں اس کا کبھی خیال کر سکتا ہوں۔ میرے حج نہ کرنے کے وجوہ مالی مشکلات، بیماری اور بار بار قید ہوتے رہنا ہیں۔ کئی سال سے ارادہ کر رہا ہوں، مگر ان وجوہ میں سے کوئی وجہ مانع ہو

جاتی ہے۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آئندہ سال حج کرنے کی توفیق بخشے۔

۳۔ آپ کا تیسرا سوال تفصیلی بحث چاہتا ہے، مختصر جواب ممکن نہیں ہے۔ میں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ ملکی افلاس کو دوسرے حج کے عدم جواز کی دلیل ٹھہرانا غلط ہے۔

۴۔ میرے علم میں کبھی یہ بات نہیں آئی کہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے کسی شخص نے تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں شہید ہونے والوں کی موت کو حرام قرار دیا ہے۔ اگر کسی نے آپ کے سامنے یہ بات کہی ہے تو آپ مجھے اس کا نام بتائیں تاکہ میں اس کی تحقیق اور اس سے باز پرس کرسکوں۔

۵۔ "ہزاروں روپے کے ناجائز تصرف"۔ سے آپ کی مراد غالباً اس گارڈن پارٹی کے مصارف ہیں جو میری آمد کے موقع پر آپ کے شہر کے بعض اصحاب نے دی تھی۔ اگر یہی آپ کی مراد ہے تو یہ کام آپ ہی کے شہر کے کچھ لوگوں نے کیا ہے، اور غالباً آپ ان سے ناواقف نہیں ہیں۔ آپ ان سے باز پرس کریں۔ میرا گناہ اگر کوئی ہے تو وہ صرف یہ کہ میں نے ان کی دعوت کو قبول کرلیا۔ کیا آپ کا منشا یہ ہے کہ مجھے جو شخص بھی کھانے یا چائے پر مدعو کرے، میں اس کی دعوت رد کردیا کروں؟

۶۔ یہ سوال تو نہیں ہے بلکہ ایک الزام ہے۔ پہلے آپ الزام کی وضاحت فرمائیں کہ تعصب اور تنگ نظری سے آپ کی مراد کیا ہے، پھر اس کا ثبوت دیں کہ یہ چیز جماعت اسلامی میں پائی جاتی ہے، تب کہیں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ جماعت اس پر کیوں قائم ہے۔ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ اس تکلیف فرمائی سے

پہلے آپ اپنے ضمیر سے یہ سوال کر لیں کہ کہیں آپ خود تو تعصب اور تنگ نظری میں مبتلا نہیں ہیں؟

ترجمان القرآن جولائی ۵۵ء

سپاسنامے اور استقبال

سوال: ماہر القادری صاحب کے استفسار کے جواب میں اصلاحی صاحب کا مکتوب جو فاران کے تازہ شمارے میں شائع ہوا ہے، شائد آپ کی نظر سے گزرا ہو۔ میرا خیال ہے کہ زیر بحث مسئلہ پر اگر آپ خود اظہار رائے فرمائیں تو یہ زیادہ مناسب ہوگا اس لیے کہ یہ آپ ہی سے زیادہ براہ راست متعلق ہے۔ اور آپ کے افعال کی توجیہہ کی ذمہ داری بھی دوسروں سے زیادہ خود آپ پر ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جب آپ کی خدمت میں یہ سپاسنامے خود آپ کی رضامندی سے پیش ہو رہے ہیں تو آپ اس تمدنی، اجتماعی اور سیاسی ضرورت کو جائز بھی خیال فرماتے ہوں گے۔ لیکن آپ کن دلائل کی بنا پر اس حرکت کو درست سمجھتے ہیں؟ میں دراصل یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں اور غالباً ایک ایسے شخص سے جو ہمیشہ معقولیت پسند (REASONABLE) ہونے کا دعویدار رہا

ہو، یہ بات دریافت کرنا غلط نہیں ہے۔ جواب میں ایک بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے گا اور وہ یہ کہ اگر آپ سپاسنامہ کے اس پورے عمل کو جائز ثابت فرما بھی دیں تو کیا خود آپ کے اصول کے مطابق، احتیاط، دانش کی روش اور شریعت کی اسپرٹ کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ فتنہ میں مبتلا ہونے سے بچنے کے لیے اس سے پرہیز کیا جائے اور کنوئیں کی منڈیر پر چہل قدمی کرنے کے بجائے ذرا پرے رہا جائے تاکہ پھسل کر کنوئیں میں گر جانے کا اندیشہ نہ رہے؟

استقبال کے موقع پر پھول برسانے کو میں برا نہیں سمجھتا تھا لیکن اصلاحی صاحب اس کے جواز میں جو ثبوت لاتے ہیں، اس نے مجھے یہ ضد کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ تحفہ، تحفہ ہے اور کسی بڑے آدمی کے استقبال کے موقع پر پھول برسانا اس کی عظمت کا اعتراف اور اس سے اپنی عقیدت کا اظہار ہے اور اس بڑے آدمی کی موجودگی میں، یہ فعل غالباً پسندیدہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور نہ ہی کسی کی عالی ظرفی اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ اگر اسے عام قاعدوں سے مستثنیٰ قرار دیا جائے تو وہ بگڑ نہیں جائے گا اور نہ ہی ہمارے پاس کسی کی عالی ظرفی اور اس کے باطن کا حال معلوم کرنے کا کوئی آلہ ہے۔

اگر جواب دیتے وقت جولائی کا فاران پیش نظر رہے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اس لیے کہ اس میں مخالف و موافق دونوں نقطہ ہائے نظر کسی قدر تفصیل کے ساتھ آ گئے ہیں۔ اس کا جواب میں آپ ہی سے

چاہتا ہوں۔ آپ کے کسی معاون سے نہیں۔ امید ہے کہ آپ اپنی پہلی فرصت میں اس کا جواب دے دیں گے اور اس استفسار کو لغو سمجھ کر ٹال نہیں گے!

جواب: مولانا امین احسن صاحب تو اپنے کلام کے خود ہی شارح ہو سکتے ہیں' ان کی طرف سے جواب دہی کا فریضہ مجھ پر عائد نہیں ہوتا۔ البتہ میں خود نہ سپاسناموں کو پسند کرتا ہوں نہ پھولوں کے ہاروں اور ان کی بارش کو۔ یہ سب کچھ میری مرضی کے بغیر، بلکہ اس کے خلاف ہی ہوتا رہا ہے اور مجھے مجبوراً اس لیے گوارا کرنا پڑا ہے کہ ایک طرف سے اخلاص و محبت کا اظہار اگر کسی نامناسب صورت میں ہو تو دوسرا فریق بسا اوقات سخت مشکل میں پڑ جاتا ہے۔ آپ ہی بتائیے کہ اگر میں کسی جگہ جا کر اتروں اور وہاں بہت سے لوگ ہار لے کر آگے بڑھیں تو کیا یہ کوئی اچھا اخلاق ہوگا کہ میں ان لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دوں اور ان سے کہوں کہ لے جاؤ اپنے ہار۔ میں انہیں قبول نہیں کرتا۔ یا میں کسی دعوت میں بلایا جاؤں اور عین وقت پر مجھے معلوم ہو کہ داعیوں نے ایک سپاسنامہ نہ صرف تیار کرا رکھا ہے بلکہ طبع بھی کرا لیا ہے اور میں کہوں کہ رکھو اپنا سپاسنامہ۔ یہ چیزیں اگر قطعی حرام ہوتیں تو میں ان کو رد کر دینے اور ان کے مرتکبین کو ملامت کرنے میں حق بجانب بھی ہوتا۔ مگر محض کراہت اور خوف فتنہ کم از کم میرے نزدیک اس بات کے لئے کافی نہیں ہے کہ میں اس پر سختی برتوں اور ان لوگوں کی دل شکنی کروں جو بہر حال مجھ سے کسی دنیوی غرض کی بنا پر محبت نہیں رکھتے میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں اور یہی کر بھی رہا ہوں کہ لوگوں سے یہ

طریق اظہارِ اخلاص چھوڑ دینے کی گزارش کروں۔ اس سے زیادہ اگر مجھے کچھ کرنا چاہیئے تو وہ آپ مجھے بتادیں

ترجمان القرآن محرم ۱۳۷۵ھ۔ ستمبر ۱۹۵۵ء

غلط الزامات

سوال :- ہمارے علاقہ میں ایک مولوی صاحب آپ کے خلاف تقریریں کرتے پھر رہے ہیں۔ ان میں جو الزامات وہ آپ پر لگاتے ہیں وہ یہ ہیں :-

۱- آپ نے اپنی کتاب تفہیمات میں سرقہ کے جرم پر ہاتھ کاٹنے کی سزا کو ظلم قرار دیا ہے۔

۲- آپ نے ترجمان القرآن میں لکھا ہے کہ قیامت کے بعد یہ زمین جنت بنادی جائے گی، یعنی جنت آئندہ بننے والی ہے، اب کہیں موجود نہیں ہے، نہ پہلے سے بنی ہوئی ہے۔

۳- آپ نے ترجمان القرآن میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت آدمؑ جس جنت میں رکھے گئے تھے وہ اسی زمین پر تھی حالانکہ یہ معتزلہ کا عقیدہ ہے۔

براہ کرم ان الزامات کی مختصر توضیح فرمادیں تاکہ حقیقت حال معلوم

ہو سکے۔

جواب: اللہ تعالیٰ ان حضرات کو راست بازی و دیانت داری کی توفیق بخشے۔ افسوس ہے کہ یہ یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ کی عجیب مثالیں پیش کر رہے ہیں اور کچھ نہیں سوچتے کہ سب کچھ یہی دنیا تو نہیں ہے۔ کبھی خدا کے سامنے بھی حاضر ہونا اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ جو الزامات آپ نے نقل کیے ہیں ان کا مختصر جواب یہ ہے:۔

غیر اسلامی نظام میں اجرائے حدود شرعیہ:

۱۔ صاحب موصوف کا اشارہ تفہیمات جلد دوم کے اس مضمون کی طرف ہے جو صفحہ ۲۸۰ تا ۲۸۵ پر درج ہے۔ آپ اسے خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ سارا مضمون ان لوگوں کے شبہات کی تردید میں لکھا گیا ہے جو موجودہ تہذیب سے متاثر ہو کر حدود شرعیہ کو ظالمانہ اور وحشیانہ سزائیں قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں اپنے دلائل دیتے ہوتے میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی قانون فوجداری کی دفعات اُس مملکت کے لیے ہیں جس میں پورا اسلامی نظام زندگی قائم ہو نہ کہ اس مملکت کے لیے جس میں سارا نظام کفر کے طریقوں پر چل رہا ہو اور صرف ایک چوری یا زنا کی سزا اسلام کے قانون سے لے لی جائے۔ چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا عین انصاف ہے اگر ملک کا معاشی نظام بھی اس کے ساتھ اسلامی احکام کے مطابق ہو، اور یہ قطعی ظلم ہے اگر ملک میں اسلام کے منشا کے خلاف سود حلال اور زکوٰۃ متروک ہو اور حاجت مند انسان کی دست گیری کا کوئی انتظام نہ ہو۔ اس ساری گفتگو میں سے اگر کوئی شخص صرف

اتنی سی بات نکال لے کہ چوری پر ہاتھ کاٹنے کو یہ شخص ظلم کہتا ہے تو آپ خود ہی سوچتے کہ اس کی سخن فہمی کا ماتم کیا جائے یا دیانت کا۔

جنت کا محل وقوع:

۲۔ یہ مضمون ترجمان القرآن بابت ماہ مئی ۱۹۵۵ء میں دو مقامات پر بیان ہوا ہے۔ ایک صفحہ ۱۱۹۔ ۱۲۰ پر۔ دوسرے صفحہ ۱۸۸۔ ۱۹۰ پر دونوں جگہ قرآن سے استدلال کرتے ہوئے میں نے یہ تو ضرور کہا ہے کہ یہ زمین عالم آخرت میں جنت بنا دی جائے گی اور صرف صالحین ہی اس کے وارث ہوں گے، مگر یہ کہیں نہیں کہا کہ کوئی جنت اب موجود نہیں ہے نہ پہلے سے بنی ہوئی ہے آخر یہ دوسرا مضمون میرے قول میں سے کس طرح نکل آیا اور کہاں سے نکل آیا؟ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں جگہ مکان بنایا جائے گا تو اس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ اس وقت کسی جگہ کوئی مکان نہیں ہے نہ پہلے کبھی بنایا گیا ہے۔ دوسرے کی بات میں ایک بات اپنی طرف سے بڑھا کر الزام کی گنجائش نکالنے کا یہ عجیب طریقہ ہے۔

۳۔ اس خیال کا اظہار بے شک میں نے کیا ہے کہ حضرت آدمؑ جس جنت میں رکھے گئے تھے وہ اسی زمین پر تھی، مگر یہ آخر کونسا گناہ ہے اور کس عقیدے سے ٹکراتا ہے۔ مفسرین نے اس مسئلے میں تین مختلف قول اختیار کئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ جنت آسمان پر تھی۔ دوسرا یہ کہ وہ زمین پر تھی۔ تیسرا یہ کہ اس معاملہ میں سکوت ہی بہتر ہے۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ فلاں قول واجب الاذعان اسلامی عقیدہ ہے اور اس کے خلاف کہنے والا قابلِ الزام

ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دوسرا قول بعض معتزلی علماء نے اختیار کیا ہے۔ مگر یہ معتزلہ کے ان مخصوص مسائل میں سے نہیں ہے جن کی بنا پر وہ معتزلی قرار دیئے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ ان کی ہر بات اعتزال اور ہر ایک رد کر دینے کے لائق تھی تو یہ بڑی زیادتی ہے۔ ان کے شدید ترین مخالف امام رازی تک نے ابو مسلم اصفہانی اور زمخشری جیسے معتزلیوں کی بہت سی باتوں کو قبول کیا ہے اور دوسرے اہل علم نے بھی ان کو علمی اچھوت نہیں سمجھا کہ ایک بات کو صرف اس لئے رد کر دیں کہ وہ کسی معتزلی نے کہی ہے۔

ترجمان القرآن ربیع الاوّل ۱۳۷۵ھ نومبر ۱۹۵۵ء

فتنہ پردازی کا مرض لاعلاج

سوال: رسائل و مسائل حصہ اول میں صفحہ ۵۲ پر آپ نے لکھا ہے کہ "یہ کانا دجال وغیرہ تو افسانے ہیں جن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے" ان الفاظ سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ آپ سرے سے دجال ہی کی نفی کر رہے ہیں۔ اگرچہ اسی کتاب کے دوسرے ہی صفحہ پر آپ نے توضیح کر دی ہے کہ جس چیز کو آپ نے افسانہ قرار دیا ہے وہ بجائے خود دجال کے ظہور کی خبر نہیں بلکہ یہ خیال ہے کہ وہ آج کہیں مقید ہے، لیکن کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ آپ مقدم الذکر عبارت ہی میں

ترمیم کردیں، کیونکہ اس کے الفاظ ایسے ہیں جن پر لوگوں کو اعتراض کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

جواب :۔ جس عبارت کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے وہ کوئی مستقل مضمون نہیں ہے بلکہ ایک سوال کا جواب ہے اور ہر صاحبِ عقل آدمی جانتا ہے کہ جب کوئی بات کسی سوال کے جواب میں کہی جائے تو سوال سے قطع نظر کر کے محض جواب سے ایک مطلب نکال لینا صحیح نہیں ہو سکتا۔ سائل کا سوال یہ تھا کہ کانا دجال کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہیں مقید ہے، تو آخر وہ کون سی جگہ ہے؟ آج تو دنیا کا کونہ کونہ انسان نے چھان مارا ہے، پھر کیوں کانے دجال کا پتہ نہیں چلتا؟ (رسائل و مسائل حصہ اوّل صفحہ ۵۱) اس کے جواب میں جو کچھ میں نے لکھا اس کا تعلق لازماً اسی بات سے تھا جو سوال میں پیش کی گئی تھی، یعنی یہ کہ دجال آج کہیں مقید ہے اور بعد میں دوسرے ہی صفحہ پر خود میں نے اپنی مراد کی صراحت بھی کر دی تھی۔ مگر اس پر بھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں کو فتنہ پردازی پر اصرار ہے۔ وہ خدا کے خوف اور خلق کی شرم سے بے نیاز ہو کر اس عبارت کو غلط معنی پہنائے چلے جا رہے ہیں۔ اب کیا آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ آج میں اس عبارت میں ترمیم کر دوں تو یہ لوگ اپنی روش سے باز آ جائیں گے؟ آپ کے مشورے کی میں قدر کرتا ہوں اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ رسائل و مسائل کے آئندہ ایڈیشن میں یہ عبارت بدل دی جائے گی۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ مریض القلب لوگ اس ترمیم کا کوئی نوٹس نہ لیں گے اور سابق عبارت ہی سے مطلب برآری کرتے رہیں گے۔

ترجمان القرآن ربیع الاول ۱۳۷۵ھ - نومبر ۱۹۵۵ء

ناقابل توجیہ حوادثِ حیات

سوال: انسانی زندگی میں بہت سے واقعات و حوادث ایسے رونما ہوتے رہتے ہیں کہ جن میں تخریب و فساد کا پہلو تعمیر و اصلاح کے پہلو پر غالب نظر آتا ہے۔ بہت سے واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کی کوئی حکمت و مصلحت سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر زندگی کا یہ تصوّر ہو کہ یہ خود بخود کہیں سے وجود میں آگئی ہے اور اس کے پیچھے کوئی حکیم و خبیر اور رحیم طاقت کارفرما نہیں ہے، تب تو زندگی کی ہر پریشانی اور اُلجھن اپنی جگہ صحیح ہے کیونکہ اس کو پیدا کرنے میں کسی عقلی وجود کو دخل نہیں ہے، لیکن مذہب اور خدا کے بنیادی تصورات اور ان واقعات میں کوئی مطابقت نہیں معلوم ہوتی۔

اگر یہ کہا جاتے کہ ان مسائل کے حل کرنے کے ذرائع ہمارے پاس نہیں ہیں، تو یہ چیز بھی عجیب ہے کہ ذہن انسانی کو ان سوالات کی پیدائش کے قابل تو بنا دیا جاتے، لیکن ان کا جواب دینے یا سمجھنے کے قابل نہ بنایا جاتے، اور سب ضروریات کا خیال رکھا جاتے مگر ان ذہنی ضروریات کو نظر انداز کر دیا جاتے۔ اس طرح تو خالق کی پالیسی میں بظاہر جھول معلوم ہوتا ہے (نعوذ باللہ)

جواب:۔ آپ جن الجھنوں میں پڑے ہوتے ہیں ان کے متعلق میرا اندازہ یہ ہے

کہ میں ان کو سلجھانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ میرے نزدیک آپ کی فکر کا نقطۂ آغاز صحیح نہیں ہے۔ آپ جن سوالات سے غور و فکر کا آغاز کرتے ہیں وہ بہر حال کلّی سوالات نہیں ہیں بلکہ کُل کے بعض پہلوؤں سے متعلق ہیں اور بعض سے کُل کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ آپ پہلے کُل کے متعلق سوچیے کہ آیا یہ بغیر کسی خالق اور ناظم اور مدبر کے موجود ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر خلق بے خالق اور نظم بے ناظم کے وجود پر آپ کا قلب مطمئن ہو جاتا ہے تو باقی سب سوالات غیر ضروری ہیں۔ کیونکہ جس طرح سب کچھ الل ٹپ بن گیا اسی طرح سب کچھ الل ٹپ چل بھی رہا ہے اس میں کسی حکمت، مصلحت اور رحمت و ربوبیت کا کیا سوال۔ لیکن اگر اس چیز پر آپ کا دل مطمئن نہیں ہوتا تو پھر کُل کے جتنے پہلو بھی آپ کے سامنے ہیں۔ ان سب پر بحیثیت مجموعی غور کر کے یہ جاننے کی کوشش کیجیے کہ ان اشیاء کی پیدائش، اِن کا وجود، ان کے حالات اور ان کے اوصاف میں ان کے خالق و مدبّر کی کن صفات کے آثار و شواہد نظر آتے ہیں۔ کیا وہ غیر حکیم ہو سکتا ہے کیا وہ بے علم و بے خبر ہو سکتا ہے؟ کیا وہ بے رحم اور ظالم اور تخریب پسند ہو سکتا ہے؟ اُس کے کام اِس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ بنانے والا ہے یا اس بات کی کہ وہ بگاڑنے والا ہے؟ اس کی بنائی ہوئی کائنات میں صلاح اور خیر اور تعمیر کا پہلو غالب ہے یا فساد اور شر اور خرابی کا پہلو؟ ان امور پر کسی سے پوچھنے کے بجائے آپ خود ہی غور کیجیے اور خود رائے قائم کیجیے۔ اگر بحیثیت مجموعی اپنے مشاہدے میں آنے والے آثار و احوال کو دیکھ کر آپ یہ محسوس کر لیں کہ وہ حکیم و خبیر ہے، مصلحت

کے لیے کام کرنے والا ہے، اور اس کے کام میں اصل تعمیر ہے نہ کہ تخریب تو آپ کو اس بات کا جواب خود ہی مل جائے گا کہ اس نظام میں جن جزوی آثار واحوال کو دیکھ کر آپ پریشان ہو رہے ہیں وہ یہاں کیوں پائے جاتے ہیں۔ ساری کائنات کو جو حکمت چلا رہی ہے اس کے کام میں اگر کہیں تخریب کے پہلو پائے جاتے ہیں تو لامحالہ وہ ناگزیر ہی ہونے چاہئیں۔ ہر تخریب تعمیر ہی کے لیے مطلوب ہونی چاہیے۔ یہ جزوی فساد کلی صلاح ہی کے لئے مطلوب ہونا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ ہم اس کی ساری مصلحتوں کو کیوں نہیں سمجھتے تو بہر حال یہ واقعہ ہے کہ ہم ان کو نہیں سمجھتے۔ یہ بات نہ میرے بس میں ہے اور نہ آپ کے بس میں کہ اس امر واقعی کو بدل ڈالیں۔ اب کیا محض اس لئے کہ ہم ان کو نہیں سمجھتے یا نہیں سمجھ سکتے، ہم پر یہ جھنجھلاہٹ طاری ہو جانی چاہیے کہ ہم حکیم و خبیر کے وجود ہی کا انکار کر دیں؟ آپ کا یہ استدلال کہ یا تو ہر جزوی حادثے کی مصلحت ہماری سمجھ میں آتے یا پھر اس کے متعلق کوئی سوال ہمارے ذہن میں پیدا ہی نہ ہو، ورنہ ہم ضرور اسے خالق کی پالیسی میں جھول قرار دیں گے، کیونکہ اس نے ہمیں سوال کرنے کے قابل تو بنا دیا لیکن جواب معلوم کرنے کے ذرائع عطا نہیں کیے، میرے نزدیک استدلال کی بہ نسبت جھنجھلاہٹ کی شان زیادہ رکھتا ہے۔ گویا آپ خالق کو اس بات کی سزا دینا چاہتے ہیں کہ اس نے آپ کو اپنے ہر سوال کا جواب پا لینے کے قابل کیوں نہ بنایا، اور وہ سزا یہ ہے کہ آپ اسے اس بات کا الزام دے دیں گے کہ تیری پالیسی میں جھول ہے۔ اچھا یہ سزا آپ اس کو دے دیں۔ اب مجھے بتائیے کہ اس سے آپ کو کس نوعیت کا اطمینان حاصل ہوا؟ کس مسئلہ کو آپ

نے حل کر لیا؟ اس جھنجلاہٹ کو اگر آپ چھوڑ دیں تو بآسانی اپنے استدلال کی کمزوری محسوس کر لیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ سوال کرنے کے لئے جس قابلیت کی ضرورت ہے، جواب دینے یا جواب پانے کے لئے وہ قابلیت کافی نہیں ہوتی۔ خالق نے سوچنے کی صلاحیت تو آپ کو اس لئے دی ہے کہ اس نے آپ کو "انسان" بنایا ہے اور انسان ہونے کی حیثیت سے جو مقام آپ کو دیا گیا ہے اس کے لئے یہ صلاحیت آپ کو عطا کرنا ضروری تھا۔ مگر اس صلاحیت کی بنا پر جتنے سوالات کرنے کی قدرت آپ کو حاصل ہے ان سب کا جواب پانے کی قدرت عطا کرنا اُس خدمت کے لیے ضروری نہیں ہے جو مقام انسانیت پر رہتے ہوتے آپ کو انجام دینی ہے۔ آپ اس مقام پر بیٹھے بیٹھے ہر سوال کر سکتے ہیں، لیکن بہت سے سوالات ایسے ہیں جن کا جواب آپ اس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک کہ مقام انسانیت سے اٹھ کر مقام الوہیت پر نہ پہنچ جائیں، اور یہ مقام بہر حال آپ کو نہیں مل سکتا۔ سوال کرنے کی صلاحیت آپ سے سلب نہیں ہوگی، کیونکہ آپ انسان بنائے گئے ہیں، پتھر یا درخت یا حیوان نہیں بنائے گئے ہیں۔ مگر ہر سوال کا جواب پانے کے ذرائع آپ کو نہیں ملیں گے، کیونکہ آپ انسان ہیں خدا نہیں ہیں۔ اسے اگر آپ خالق کی پالیسی میں "جھول" قرار دینا چاہیں تو دے لیجئے۔

(ترجمان القرآن جمادی الاخریٰ ۱۳۷۵ھ فروری ۱۹۵۶ء)

خواب میں زیارتِ نبویؐ

سوال: براہ کرم مندرجہ ذیل سوال کے بارے میں اپنی تحقیق تحریر فرما کر تشفی فرمائیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو درحقیقت اس نے مجھے ہی دیکھا۔ کیونکہ شیطان میری تمثال میں نہیں آسکتا۔ او کما قال۔

اس حدیث کی صحیح تشریح کیا ہے؟ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جس شکل و شباہت میں بھی خواب میں دیکھا جائے تو یہ حضورؐ ہی کو خواب میں دیکھنا سمجھا جائے گا؟ کیا حضورؐ کو یورپین لباس میں دیکھنا بھی آپ ہی کو دیکھنا سمجھا جائے گا؟ اور کیا اس خواب کے زندگی پر کچھ اثرات بھی پڑتے ہیں؟

جواب: اس حدیث کی صحیح تشریح یہ ہے کہ جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حضورؐ کی اصلی شکل و صورت میں دیکھا اُس نے درحقیقت آپ ہی کو دیکھا۔ کیوں کہ شیطان کو یہ قدرت نہیں دی گئی ہے کہ وہ آپ کی صورت میں آکر کسی کو بہکا سکے۔ اس کی یہی تشریح حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ نے کی ہے۔ امام بخاری کتاب التعبیر میں ان کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ اذا رآہ فی صورتہ (جب کہ دیکھنے والے نے آپ کو آپ ہی کی صورت میں دیکھا ہو) علامہ ابن حجر صحیح

سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص ابن سیرین سے کہتا کہ میں نے خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے تو وہ اس سے پوچھتے تھے کہ تو نے کس شکل میں دیکھا۔ اگر وہ آپ کی کوئی ایسی شکل بیان کرتا جو آپ کے حلیہ سے نہ ملتی تھی تو ابن سیرین کہہ دیتے تھے کہ تو نے حضورؐ کو نہیں دیکھا ہے۔ یہی طرزِ عمل حضرت ابن عباس کا بھی تھا جیسا کہ حاکم نے بسند نقل کیا ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ خود حدیث کے الفاظ بھی اسی معنی کی توثیق کرتے ہیں۔ جن مختلف الفاظ میں یہ حدیث صحیح سندوں سے منقول ہوتی ہے ان سب کا مفہوم یہی ہے کہ "شیطان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں نہیں آسکتا"۔ نہ یہ کہ شیطان کسی شکل میں آکر آدمی کو یہ دھوکہ نہیں دے سکتا کہ وہ آنحضور کو دیکھ رہا ہے۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی جان لینی ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھے اور آپ سے کوئی امر یا کوئی نہی کا حکم سنے، یا دین کے معاملے میں کسی قسم کا ایما۔ آپ سے پائے تو اس کے لئے اس خواب کی پیروی اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک وہ اس تعلیم یا ایما کے مطابق کتاب وسنت ہونے کا اطمینان نہ کرلے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہمارے لئے دین کا معاملہ خوابوں اور کشفوں اور الہاموں پر نہیں چھوڑا ہے۔ حق اور باطل اور صحیح اور غلط کو ایک روشن کتاب اور ایک مستند سنت میں پیش کر دیا گیا ہے جسے بیداری میں اور پورے شعور کی حالت میں دیکھ کر راہ راست معلوم کی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی خواب یا کشف یا الہام اس کتاب اور اس سنت کے مطابق ہے تو خدا کا شکر ادا کیجئے کہ اللہ نے حضور کی زیارت نصیب کی،

یا کشف والہام کی نعمت سے نوازا۔ لیکن اگر وہ اس کے خلاف ہے تو اسے رد کر دیجئے اور اللہ سے دعا مانگیے کہ وہ ایسی آزمائشوں سے آپ کو اپنی پناہ میں رکھے۔

ان دو باتوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بکثرت لوگ گمراہ ہوتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ متعدد آدمی میرے علم میں ایسے ہیں جو صرف اس بنا پر ایک گمراہ مذہب کے پیرو ہو گئے کہ انہوں نے خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مذہب کے بانی کی توثیق کرتے یا اس کی طرف التفات فرماتے دیکھا تھا۔ وہ اس گمراہی میں نہ پڑتے اگر اس حقیقت سے واقف ہوتے کہ خواب میں کسی شکل کے انسان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے دیکھ لینا درحقیقت حضور کو دیکھنا نہیں ہے۔ اور یہ کہ خواب میں واقعی حضور ہی کی زیارت نصیب ہو تب بھی کوئی حکم شرعی اور امر دینی ایسے خواب سے اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر شیطان کے فریب سے تحفظ صرف اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ آدمی حضور کو آپ کی اصلی شکل میں دیکھے تو اس کا فائدہ صرف انہی لوگوں کو حاصل ہو سکتا تھا جنہوں نے آپ کو بیداری میں دیکھا تھا۔ بعد کے لوگ آخر کیسے جان سکتے ہیں کہ جو شکل وہ خواب میں دیکھ رہے ہیں وہ حضورؐ ہی کی ہے یا کسی اور کی؟ ان کو اس حدیث سے کیا تسلی ہوتی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعد کے لوگ اس بات کا اطمینان تو نہیں کر سکتے کہ انہوں نے جو شکل خواب میں دیکھی وہ حضورؐ ہی کی شکل تھی، مگر یہ تو معلوم کر سکتے ہیں کہ خواب کے معنی اور مضمون کی مطابقت قرآن و سنت کی تعلیم سے ہے یا نہیں

مطابقت پائی جاتی ہو تو پھر زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ انہوں نے خواب میں حضورؐ ہی کی زیارت کی ہے، کیونکہ شیطان کسی کو راہ راست دکھانے کے لئے تو بہروپ نہیں بھرا کرتا۔

(ترجمان القرآن ذی القعدہ ۱۳۷۵ھ جولائی ۱۹۵۶ء)

گول مول جوابات

سوال: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ ہمیشہ ہر مسئلہ کا گول مول جواب دیتے ہیں، اور اگر مزید وضاحت چاہی جاتے تو آپ بگڑ جاتے ہیں یا پھر جواب سے بے بس ہو کر انکار کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں ہنوز ایسے انسانوں کا ہم خیال نہیں ہوں، کیونکہ جہاں تک میں جانتا ہوں آپ ہمیشہ مسئلہ کو دو ٹوک اور وضاحت سے سمجھاتے ہیں۔ خدا کرے میرا یہ حُسنِ ظن قائم رہے۔

گذارشات بالا کا لحاظ رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجئے:

۱۔ کوئی تارکِ سنت بزرگ ولی ہو سکتا ہے یا نہیں؟

۲۔ حضرت رابعہ بصریؒ نے کیوں سنت نکاح کو ترک کیا تھا؟

۳۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہی کے متعلق کہا جاتا

ہے کہ انہوں نے اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ سیّد بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے ایک باطنی اشارہ پر تاعمر شادی نہ کی تھی۔ آپ کے نزدیک پیر و مرشد کا خلاف سنت اشارہ کرنا اور مرید کا باوجود استطاعت کے سنتِ نکاح کو ترک کرنا کس حد تک درست ہے؟

جواب: میں معقول اور ضروری سوالات کا جواب تو ہمیشہ وضاحت کے ساتھ دینے کی کوشش کرتا ہوں، مگر بیکار اور غیر ضروری سوالات کے معاملہ میں پیچھا چھڑانے کے سوا مجھے اور کوئی صحیح طریقہ معلوم نہیں ہے۔ اب آپ خود اپنے سوالات پر غور کیجیے۔ اگر آپ صرف پہلے سوال پر اکتفا کرتے تو میں بآسانی یہ جواب دے سکتا تھا کہ تارکِ سنت ولی نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ تیسرے سوال کا صرف آخری حصہ پوچھتے تو اس کا بھی یہ جواب دیا جا سکتا تھا کہ کسی کے مشورے یا حکم سے ترکِ سنت جائز نہیں ہے۔ مگر آپ اس سے آگے بڑھ کر دو مرحوم بزرگوں کا بھی مقدمہ پیش کر دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں ان کے مقدمے کا فیصلہ سناؤں۔ آپ بتائیے کہ آپ کا خود اس بحث میں پڑنا اور پھر مجھے بھی اس میں الجھانے کی کوشش کرنا کہاں تک صحیح ہے؟ میرے یا آپ کے پاس یہ جاننے کا کیا ذریعہ ہے کہ حضرت رابعہ بصریہ نے اس قدر متبع سنت ہونے کے باوجود کیوں شادی نہ کی اور حضرت نظام الدین کو ان کے شیخ نے کن مخصوص حالات یا اسباب کی بنا پر مشورہ دیا اور دیا بھی تھا یا نہیں دیا۔ سارے حالات نہ میرے سامنے ہیں نہ آپ کے سامنے اگر میں حالات سے واقفیت کے بغیر ان بزرگوں پر کوئی حکم لگاؤں تو زیادتی کروں گا۔ اگر ان کے فعل کی تاویل کروں تو دوسرے لوگوں کے لئے بھی ترکِ سنت کی

ترغیب کا ذریعہ بنوں گا۔ اور پھر نفس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے اس کی کوئی حاجت بھی نہیں ہے کہ آج میں یا آپ پچھلے بزرگوں کے معاملات کا فیصلہ کریں۔ آپ خود مجھے بتائیے کہ اس طرح کے سوالات سے اگر میں پیچھا چھڑانے کی کوشش نہ کروں تو کیا کروں؟ اسی طرح کے سوالات و جوابات کے بارے میں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے۔ فَلَا تُمَارِ فِیهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ فِیهِمْ مِنْهُمْ أَحَدًا (ان کے معاملے میں صرف سرسری بحث کیجیے اور ان سے متعلق ان میں سے کسی سے پوچھ گچھ نہ کیجیے۔ الکہف)

(ترجمان القرآن ذی القعدہ ۱۳۷۵ھ جولائی ۱۹۵۶ء)

مباہلہ و مناظرہ

سوال: میرے ایک عزیز نے جو ایک دینی مدرسے کے فارغ ہیں، مجھ سے یہ دریافت کیا ہے کہ مولانا مودودی دعوتِ مباہلہ و مناظرہ کو کیوں قبول نہیں کرتے حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہود سے مباہلہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اور انبیاء و سلف صالحین بھی مناظروں میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ مخالفین بار بار آپ کو چیلنج کرتے ہیں لیکن آپ ان سے نہ مباہلہ کرتے ہیں اور نہ ہی مناظرہ کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی حد تک اپنے عزیز کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے اور ان سے کہا ہے

کہ ہر مباہلے یا مناظرے کی دعوت قبول کرنا فرض یا سنت نہیں ہے
تاہم اگر آپ بھی اس بارے میں اپنا عندیہ بیان کر دیں تو وہ مزید موجب
اطمینان ہوگا۔

جواب: آپ کے جن عزیز نے فرمایا ہے کہ آنحضورؐ نے یہود سے مباہلہ کا فیصلہ فرمایا تھا ان کی معلومات ناقص ہیں۔ مباہلہ کا فیصلہ حضورؐ نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا اور یہ مباہلہ یہود سے نہیں بلکہ عیسائیوں سے کیا گیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں مباہلہ کا صرف یہی ایک واقعہ ملتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے مباہلے کو نزاعی امور کے فیصلے کا مستقل طریقہ قرار نہیں دیا ہے کہ جب کبھی کسی کافر یا مسلمان سے کسی قسم کا اختلاف ہو تو فوراً مباہلے کی دعوت دے ڈالی جائے۔ پیشہ ور مناظرین نے آجکل مباہلے کو کُشتی کے داؤں میں باضابطہ طور پر شامل کر لیا ہے۔ لیکن پوری تاریخ اسلام میں مباہلے کی دعوت دینے اور اسے قبول کرنے کی مثالیں مشکل ہی سے مل سکیں گی۔ صحابہ کرام میں بڑے بڑے اختلافات ہوتے، حتّٰی کہ بعض اوقات لڑائیوں تک کی نوبت آئی لیکن مباہلہ کرنے کی نوبت شاذونادر ہی آئی ہے تابعین تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہوتے، بڑے بڑے مسائل پر بحثیں بھی ہوتیں۔ لیکن مباحثہ کے بجائے مباہلہ کا طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ بعد کے زمانوں میں بھی علما کے مابین اختلاف رائے کا ظہور ہوا۔ تکفیر و تفسیق کا بازار بھی گرم ہوا لیکن مباہلے کو کبھی کسی نے اپنا معمول نہیں بنایا۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ کے مخالفین کثیر تعداد میں موجود

تھے، یہود، نصاریٰ، منافقین ہر ایک نے قدم قدم پر آپ کی مخالفت کی مگر ایک نجران کے نصاریٰ کے سوا اور کسی سے مباہلہ کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ اس سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ مباہلہ ایک استثنائی طریق کار تھا جسے بعض خاص وجوہ وحالات کی بنا پر صرف نجران کے عیسائیوں کے معاملے میں خود اللہ تعالیٰ نے متعین فرمایا تھا اور یہ مسائل کے تصفیے کا کوئی مقرر قاعدہ وضابطہ نہیں ہے جسے ہمیشہ ہر متنازع فیہ معاملے میں اختیار کیا جا سکے۔ نجران کے معاملے میں کیوں خاص طور پر یہ شکل اختیار کی گئی اس کی ایک وجہ جو احادیث سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نجران کے تین دینی پیشوا جو وفد کی شکل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے وہ اپنے دلوں میں آپ کی نبوت کے قائل اور معترف ہو چکے تھے، لیکن صرف اپنی قوم میں اپنا وقار برقرار رکھنے کے لئے ایمان لانے سے پرہیز کر رہے تھے۔ سفر کے دوران میں ان میں سے جب ایک نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ناشائستہ الفاظ اپنی زبان سے نکالے تو دوسرے نے فوراً ٹوک دیا اور کہا کہ اس شخص (رسول اللہ صلعم) کے متعلق نازیبا کلمات استعمال نہ کرو کیونکہ یہ وہی نبی ہیں جس کے بارے میں پیشین گوئیاں ہماری کتابوں میں مذکور ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو چونکہ علم غیب کی بنا پر ان کے دلوں کا چور معلوم تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ یہ لوگ اس دلی اعتراف کے بعد مباہلے کی دعوت قبول کرنے اور لعنۃ اللہ علی الکاذبین کہہ کر اپنے اوپر لعنت مسلط کرنے کی جرأت کبھی نہیں کریں گے، اس لیے ان کی باطنی کیفیت کو بے نقاب کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ شکل تجویز

فرمائی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ وہی نکلا۔ وفد نجران نے مباہلہ کرنے سے گریز کیا اور ان کا کذاب و نفاق بالکل عیاں ہو گیا۔

آپ کے عزیز نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ میں مناظرہ کیوں نہیں کرتا، حالانکہ انبیاء و صلحا اپنے مخالفین سے مناظرے کرتے رہے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مناظرہ یا مجادلہ صرف بحث و استدلال کی حد تک محدود تھا اور آجکل عرف عام میں جس چیز کو مناظرہ کہا جاتا ہے اس کی نوعیت مرغ بازی کی سی ہے۔ معقول طریق پر اگر کوئی آدمی کسی مسئلے پر زبانی یا تحریری بحث کرے تو مجھے اس پر اعتراض نہیں ہوتا اور اگر ممکن اور ضروری سمجھوں تو ایسی بحث میں حصہ بھی لے لیتا ہوں۔ لیکن پیشہ ور اور جھگڑالو مناظرے بازوں سے چونچیں لڑانا میرا کام نہیں ہے۔ یہ مشغلہ جن لوگوں کو زیب دیتا ہے وہ بخوشی اسے اختیار کئے رہیں

(ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۷۵ھ ۔ اگست ۱۹۵۶ء)

اعتراض کے پردے میں بہتان

سوال: ترجمان۔ رمضان ۱۳۷۵ھ میں آپ نے کسی کے چند اعتراضات شائع کر کے ان کے جواب دیتے ہیں۔ اعتراض نمبر ۱۲ کے جواب میں آپ نے لکھا ہے کہ "یہ اعتراض نہیں بلکہ صریح بہتان ہے۔ میں نے اشارۃً و کنایۃً بھی یہ بات نہیں لکھی۔۔۔" در اصل اس معترض مذکور

نے حوالہ دینے میں غلطی کی ہے۔ عزیز احمد قاسمی بی۔ اے نے اپنی کتاب "مودودی مذہب حصّہ اوّل" میں اس عبارت کے لیے ترجمان ربیع الثانی ۷۰ھ کا حوالہ دیا ہے۔ براہ کرم اس حوالے کی مدد سے دوبارہ تحقیق فرمائیں اور اگر عبارت منقولہ صحیح ہو تو اعتراض کا جواب دیں۔

جواب: میں پہلے ہی حیران تھا کہ میرے قلم سے تو کبھی وہ باتیں نکلی نہیں جو اس اعتراض میں میری طرف منسوب کی گئی ہیں تو اس الزام کا آخر ماخذ کیا ہے۔ اب آپ کے حوالے کو نکال کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی کے ایک مضمون کے اقتباسات کو صرف اس بنا پر بلا تکلف میرے سر منڈھ دیا گیا ہے کہ وہ مضمون ترجمان القرآن میں شائع ہوا تھا۔ حالانکہ ہر مضمون کا مصنف خود ہی اپنے اقوال کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کے ہر ہر لفظ کو اس رسالے کے ایڈیٹر کی طرف تو منسوب نہیں کیا جا سکتا جس میں وہ شائع ہوا ہو۔

(ترجمان القرآن محرم صفر ۱۳۷۶ھ۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء)

بیوی اور والدین کے حقوق

سوال: میں نے آپ کی کتابیں پڑھی ہیں، جن سے ذہن کی بہت سی گرہیں کھل گئی ہیں۔ لیکن ایک چیز جو پہلے بھی دل میں کھٹکتی تھی اور اب بھی کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام نے جہاں عورتوں کا درجہ

کافی بلند کیا ہے، وہاں بحیثیت بیوی کے بعض امور میں اس کو حقیر بھی کر دیا ہے۔ مثلاً اس پر تین تین سوکنوں کا جلاپا جائز کر دیا ہے، حالانکہ قدرت نے عورت کی فطرت میں حسد بھی رکھا ہے۔ اسی طرح جہاں بیوی کو شوہر کے قبضہ و اختیار میں رکھا گیا ہے، وہاں شوہر کو اپنے والدین کے قبضہ و اختیار میں کر دیا ہے۔ اس طرح شوہر والدین کے کہنے پر بیوی کی ایک جائز خواہش کو بھی پامال کر سکتا ہے۔ ان امور میں بظاہر بیوی کی حیثیت چار پیسے کی گڑیا سے زیادہ نظر نہیں آتی۔ میں ایک عورت ہوں اور قدرتی طور پر عورت کے جذبات کی ترجمانی کر رہی ہوں۔ آپ براہِ کرم اس بارے میں میری تشفی فرمائیں۔

جواب: آپ نے دو وجوہ کی بنا پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ عورت کی پوزیشن خانگی زندگی میں فروتر رکھی گئی ہے۔ ایک یہ کہ مرد کو چار چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے دوسرے یہ کہ شوہر کو والدین کا تابع رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے بسا اوقات وہ اپنی بیوی کے جذبات اور اس کی خواہشات کو والدین کی رضا پر قربان کر دیتا ہے۔ ان وجوہ میں سے پہلی وجہ پر اگر آپ غور کریں تو یہ بات بہت آسانی کے ساتھ آپ کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ عورت کے لئے تین سوکنوں کا برداشت کرنا جتنا تکلیف دہ ہے، اس سے بدرجہا زیادہ تکلیف دہ چیز اس کے لیے یہ ہو سکتی ہے کہ اس کے شوہر کی کتنی محبوبائیں اور داشتائیں ہوں۔ اسلام نے اسی کو روکنے کے لئے مرد کو ایک سے زائد نکاح کرنے کی اجازت دی ہے۔ ایک مرد ناجائز تعلقات میں جتنا بے باک ہو سکتا ہے، شادیاں رچانے میں اتنا نہیں ہو سکتا، کیوں کہ

شادی کی صورت میں مرد کی ذمّہ داریوں میں اضافہ ہوتا ہے اور طرح طرح کی پیچیدگیوں سے اسے سابقہ پیش آتا ہے۔ یہ دراصل عورتوں ہی کے فائدے کے لیے ایک روک تھام ہے نہ کہ مردوں کے لئے بے جا رعایت۔ دوسرے طریقے کا تجربہ آجکل مغرب کی سوسائٹی کر رہی ہے وہاں ایک طرف تو جائز سوکنوں کا سدباب کر دیا گیا ہے لیکن دوسری طرف ناجائز سوکنوں سے عورت کو بچانے کا کوئی انتظام اس کے سوا نہیں کیا گیا کہ وہ انہیں برداشت نہ کر سکے تو شوہر سے طلاق حاصل کرنے کے لئے عدالت میں نالش کر دے۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ اس سے عورت کی مصیبت کچھ کم ہوگئی ہے؟ چھڑی چھٹانک عورت تو شاید سوکن سے بچنے کے لئے طلاق کو آسان سمجھ لے مگر کیا بچّوں والی عورت کے لیے بھی یہ نسخہ آسان ہے؟

دوسری جس شکایت کا اظہار آپ نے کیا ہے اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ غالباً آپ ابھی تک صاحبِ اولاد نہیں ہیں، یا اگر ہیں تو آپ کے کسی لڑکے کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ آپ اس خاص معاملے کو ابھی تک صرف بہو کے نقطۂ نظر سے دیکھ رہی ہیں۔ جب آپ اپنے گھر میں خود بہو لے آئیں گی اور اس معاملے پر ماں کی حیثیت سے غور کریں گی تو یہ مسئلہ اچھی طرح آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ بیوی کے حقوق کتنے ہونے چاہئیں اور ماں باپ کے کتنے، بلکہ اس وقت شاید آپ خود انہی حقوق کی طالب ہوں گی جن پر آج آپ کو اعتراض ہے۔

(ترجمان القرآن ربیع الاول ۱۳۷۶ھ۔ نومبر ۱۹۵۶ء)

اذکار مسنونہ

سوال : آج آپ کی خدمت میں ایک خلش پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ توقع ہے کہ میری پوری مدد فرمائیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں ایک بریلوی خاندان کا فرد ہوں۔ بچپن میں غیر شعوری حالت میں والد بزرگوار نے حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ کے سجادہ نشین سلطان امیر مرحوم کے ہاتھ پر میری بیعت کرائی۔

حضرت سلطان باہوؒ ضلع جھنگ کے ایک مشہور با خدا بزرگ ہیں جو حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں گزرے ہیں حضرت نے تبلیغ واشاعتِ دین میں پوری ہمت دکھائی اور جہاد میں بھی شرکت فرمائی۔

سجادہ نشین سلطان امیر مرحوم فرائض کے پابند، کبائر سے مجتنب خدا یاد آدمی تھے۔ دربار پر جاتے تو مسنون طریقے سے دعا ئے مغفرت کرتے۔ لوگوں نے دربار کا طواف شروع کر دیا تو موصوف نے دربار کے اندر ایک ایسی دیوار بنوادی جس سے طواف ناممکن ہو گیا۔ اُن کے ان اعمال اور خدا یاد ہونے کی وجہ سے مجھے ان سے بے حد عقیدت تھی۔ مگر افسوس کہ اکتساب سے قبل میری کم عمری میں انتقال فرما گئے۔ پھر ایک اور بزرگ سے کچھ اوراد حاصل کئے جنہیں

باقاعدگی سے پڑھتا تھا کہ ۴۳ء میں جماعت کی رکنیت سے سرفراز ہوا اس کے بعد میرے اندر ایک زبردست کشمکش ہوئی۔ وہ یہ کہ سکونِ قلب کے لیے رکنیت اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنا کافی محسوس ہوتا رہا۔ مگر ساتھ ہی اپنی توجہات کو سمیٹ کر ایک مرکز پر مجتمع رکھنے کے لئے اوراد و وظائف کی تشنگی محسوس ہوتی۔ اس مقصد کے لیے جب مختلف حضرات کی طرف نظر دوڑاتا تو اقامتِ دین کے بنیادی تقاضوں سے ان کی غفلت ان کی ساری وقعت گھٹا دیتی۔ اس کشمکش میں مدت ہوئی مبتلا ہوں۔ بعض دوستوں سے اپنی حالت کا ذکر بھی کر چکا ہوں۔ بالآخر طبیعت کا رجحان اس طرف ہوا کہ اس معاملہ میں بھی آپ ہی کی طرف رجوع کروں۔

میری درخواست ہے کہ اذکار و اوراد مسنونہ میں سے کچھ ایسی چیز یا چیزیں میرے لئے تجویز فرمائیں جو:

۱۔ میری طبیعت سے مناسبت رکھتی ہوں اور ......

۲۔ جن سے پندرہ بیس پچیس منٹ صرف کر کے اپنی توجہات کو سمیٹنے میں مدد لیا کروں۔ مجھے پوری توقع ہے کہ اس معاملہ میں بھی رہنمائی کریں گے۔

جواب: ذکر کے معاملے میں دو باتیں پیشِ نظر رہنی چاہئیں۔ ایک یہ کہ ذکر تکلف نہ ہونا چاہیے بلکہ دلی رغبت اور شوق کے ساتھ ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ ذکر کا انتخاب اپنے دلی ذوق کی بنا پر کرنا چاہیے۔ ذکر وہ کیجیے جس سے خود

اپنی روح کی مناسبت آپ کو محسوس ہو، اور اس وقت کیجیے جب پوری توجہ اور رغبت کے ساتھ آپ کر سکیں۔ ان دو باتوں کو ذہن میں رکھ کر آپ مشکوٰۃ میں سے تین مقامات کو بغور پڑھیں۔ کتاب الصلوٰۃ میں سے باب الذکر بعد الصلوٰۃ اور باب صلوٰۃ اللیل، باب القصد فی العمل اور کتاب الدعوات پوری۔ ان حصوں میں آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ذکر و دعا کس طرح فرماتے تھے اور دوسروں کو آپ نے کیا کیا چیزیں اس سلسلہ میں بتائی ہیں۔ ان میں سے جو جو چیزیں بھی آپ کے دل کو لگیں ان کا انتخاب کر لیجیے۔

(ترجمان القرآن شعبان، رمضان ۱۳۷۶ھ جون ۱۹۵۷ء)

افسرانِ بالا کے آنے پر مستعدی کی نمائش

سوال: میں ایک ورکشاپ میں ملازم ہوں، مگر ہمیں کبھی کبھی باہر دوروں پر بھی جانا پڑتا ہے۔ ان دنوں ہمیں کام بہت کم ہوتا ہے اور اس وجہ سے ہم اپنے اوقات کے اکثر حصے یونہی بیکار بیٹھ کر گزارتے ہیں۔ لیکن جب ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارا کوئی آفیسر یہاں سے گزرنے والا ہے یا گزر رہا ہے تو فوراً ہی ہم اِدھر اُدھر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیتے ہیں تاکہ آفیسر کو

معلوم ہو جاتے کہ ہم کچھ کر رہے ہیں۔ اور جب وہ گزر جاتا ہے تو پھر ہم آرام سے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور بعض مواقع پر ایسا بھی ہوتا ہے کہ پتہ نہیں کہ آفیسر کو ہمارے متعلق کیا خیال گزرے گا۔ اگرچہ میں اس قسم کا مظاہرہ بہت کم کرتا ہوں۔ لیکن کبھی میں بھی ایسے کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں۔ جب بھی اس قسم کی صورتِ حال سامنے آتی ہے تو طبیعت بہت پریشان ہوتی ہے۔ بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ چیز بھی مجھے خدا کی عدالت میں مجرم بنا کر کھڑا کر دے۔ براہ کرم اس سلسلہ میں میری رہنمائی فرمائیں۔

جواب: اگر آپ اپنے کام میں جان بوجھ کر غفلت نہ کر رہے ہوں بلکہ کام نہ ہونے کی وجہ سے بے کار بیٹھے ہوں اور آفیسر کے آنے پر محض مستعدی اور مصروفیت کی نمائش اس لیے کریں کہ آفیسر کی طرف سے ناراضی کا خطرہ ہے تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ جان بوجھ کر کام چھوڑنے کی صورت میں ایسا کرنا ناجائز ہوگا۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ ایک آفیسر ایسا بھی ہے جو ہر وقت ہر حال میں آپ کو دیکھ رہا ہے اور جس کو کسی جھوٹی نمائش سے دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔ نیز جس کو سزا دینے کی طاقت تمام آفیسروں سے بڑھ کر حاصل ہے۔ جب کبھی آپ اور آپ کے ساتھی دنیا کے چھوٹے چھوٹے افسروں کی آمد پر گھبراہٹ میں مبتلا ہوا کریں، اس وقت ذرا اس بڑے افسر کو بھی یاد کر لیا کریں۔

مصائب کے ہجوم میں ایک مومن کا نقطۂ نظر

سوال: میرا تیسرا بیٹا پونے چار سال کی عمر میں فوت ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ یہاں آکر پہلے دو لڑکے فوت ہوتے، اب یہ تیسرا تھا۔ اب کسی نے شبہ ڈالا تھا کہ جادو کیا گیا ہے۔ جس دن سے یہ بچہ پیدا ہوا اسی دن سے قرآن پاک کی مختلف جگہوں سے تلاوت کرکے دم کرتا رہا۔ فرق صرف یہ ہوا کہ پہلے لڑکے پونے دو سال کی عمر میں فوت ہوتے رہے۔ یہ پونے چار سال کو پہنچ گیا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ جادو بھی چند الفاظ ہوتے ہیں۔ اس کے توڑنے کو قرآنِ پاک کے الفاظ تھے۔ پھر دعائیں بھی بہت کیں۔ بوقت تہجد گھنٹوں سجدہ میں پڑا رہا ہوں۔ لیکن کچھ شنوائی نہیں ہوئی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ حاضر و ناظر اور سمیع و بصیر ہے۔ کیا حق تعالیٰ جادو کے اثر کے لئے مجبور ہی ہو جاتے ہیں؟ لوگ قبر والوں کے نام کی بودیاں رکھ کر پاؤں میں کڑے پہنا کر اولاد بچاتے بیٹھے ہیں لیکن ہم نے اسے شرک سمجھ کر اس کی طرف رجوع نہ کیا۔ لیکن ہمیں بدستور رنج اٹھانا پڑا۔ اکٹھے تین داغ ہیں جو لگ چکے ہیں۔ براہ کرم اس غم و افسوس کے لمحات میں رہنمائی فرمائیں۔

جواب: آپ کے صاحبزادے کی وفات کا حال معلوم کرکے بڑا افسوس ہوا اور اس

سے زیادہ افسوس یہ سن کر ہوا کہ اس سے پہلے بھی دو بچوں کا صدمہ آپ کو پہنچ چکا ہے۔ اولاد کے یہ پے در پے غم آپ کے اور آپ کی اہلیہ کے لئے جیسے ناقابلِ برداشت ہوں گے اس کا مجھے خوب اندازہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ دونوں کو صبر عطا فرمائے اور سکینت بخشے۔

آپ کے خط سے مجھے محسوس ہوا کہ دل پر پے در پے چوٹیں کھانے کی وجہ سے آپ غیر معمولی طور پر متاثر ہو گئے ہیں۔ اگرچہ اس حالت میں نصیحت کرنا زخموں کو ہرا کر دیتا ہے، اور مناسب یہی ہوا کرتا ہے کہ رنج و غم کا طوفانی دور ختم ہو جائے۔ مگر مجھے خوف ہے کہ اس دور میں کہیں آپ کے عقائد صالحہ پر کوئی آنچ نہ آ جائے۔ اس لئے مجبوراً کہتا ہوں کہ آفات اور مصائب اور آلام کا خواہ کیسا ہی ہجوم ہو، مومن کو اپنے ایمان اور اللہ کے ساتھ اپنے تعلق پر آنچ نہ آنے دینی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں ہم کو ہر طرح کے حالات میں ڈال کر آزماتا ہے۔ غم بھی آتے ہیں اور خوشیاں بھی آتی ہیں۔ مصیبتیں بھی پڑتی ہیں اور راحتیں بھی میسّر آتی ہیں۔ نقصان بھی ہوتے ہیں اور فائدے بھی پہنچتے ہیں۔ یہ سب آزمائشیں ہیں اور ان سب سے ہم کو بخیریت گزرنا چاہیئے اس سے بڑھ کر ہماری کوئی بد قسمتی نہیں ہو سکتی کہ ہم مصیبتوں کی آزمائش سے گزرتے ہوئے ایسے مضطرب ہو جائیں کہ اپنا ایمان اور اعتقاد بھی خراب کر بیٹھیں۔ کیونکہ اس طرح تو ہم دنیا اور دین دونوں ہی کے ٹوٹے میں پڑ جائیں گے۔ آپ کو جن دل میں دوچار ہونا پڑا ہے وہ واقعی دل ہلا دینے والے ہیں۔ لیکن اس حالت میں ثابت قدم رہنے کی کوشش کیجئے اور کوئی مشرکانہ خیال

یا شرک کی طرف کوئی میلان، یا اللہ سے کوئی شکایت دل میں نہ آنے دیجیے۔ ہم اور جو کچھ بھی ہمارا ہے، سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔ ملکیت بھی اسی کی ہے اور سارے اختیارات بھی اسی کے۔ ہمارا اس پر کوئی حق یا زور نہیں ہے۔ جو کچھ چاہے عطا کرے اور جو کچھ چاہے چھین لے اور جس حال میں چاہے ہم کو رکھے۔ ہم اس پر اس شرط سے ایمان نہیں لاتے ہیں کہ وہ ہماری تمنائیں پوری ہی کرتا رہے اور ہم کو کبھی کسی غم یا تکلیف سے دوچار نہ کرے۔ یہ شان بندگی نہیں ہے کہ اللہ سے مایوس ہوکر ہم دوسرے آستانوں کی طرف رجوع کرنے لگیں۔ دوسرے کسی آستانے پر سرے سے ہے ہی کچھ نہیں۔ وہاں سے بھی اگر بظاہر کچھ ملتا ہے تو خدا ہی کا دیا ہوا ہوتا ہے۔ البتہ وہاں سے مانگ کر ہم جو کچھ پا سکتے ہیں وہ ایمان کھو کر ہی پا سکتے ہیں۔ اور بہت سے بدقسمت ایسے ہیں جو وہاں ایمان بھی کھوتے ہیں اور مراد بھی نہیں پاتے۔ اس لئے آپ ایسے کسی خیال کو اپنے دل میں ہرگز نہ آنے دیں۔ اور صبر و ثبات کے ساتھ اللہ ہی کا دامن تھامے رہیں۔ خواہ غم نصیب ہو یا خوشی۔

جادو اور آسیب اور جفر وغیرہ میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سب پر حاوی ہے۔ آپ اللہ سے دعا مانگتے رہیں۔ اسی سے پناہ طلب کرتے رہیں۔ امید ہے کہ آخرکار اس کا فضل آپ کے شامل حال ہوگا۔ اور کوئی بلا آپ کو یا آپ کی اولاد کو لاحق نہ ہوگی۔

(ترجمان القرآن۔ جمادی الآخرہ ۱۳۷۷ھ جنوری ۱۹۵۸ء)

نظامِ تعلیم کے متعلق چند بنیادی سوالات

سوال: بندہ درس و تدریس کے کام سے ایک عرصہ سے وابستہ ہے اور آجکل یہاں زیرِ تعلیم ہے۔ یہاں ماہرینِ تعلیم سے اکثر تعلیمی موضوعات پر بحث رہتی ہے۔ چنانچہ شکاگو یونیورسٹی کی فرمائش پر بندہ ایک مقالہ قلم بند کرنے کی کوشش کر رہا ہے، جس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ پاکستان کی تعلیمی ضروریات امریکہ اور دیگر ممالک کی ضروریات سے بہت مختلف ہیں۔ پاکستانی ضروریات کا حل اسلام کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں ہونا چاہیے۔ اگر امریکن طرزِ تعلیم بغیر سوچے اختیار کیا گیا تو ناقابلِ تلافی نقصان ہونے کا خطرہ ہے۔

جناب کی بیشتر تصنیفات میری نظر سے گزر چکی ہیں اور اب رہنمائی کر رہی ہیں۔ ایک دو سوال کچھ اس پیچیدہ نوعیت کے درپیش ہوئے کہ میں نے ضروری سمجھا کہ جناب سے براہ راست رہنمائی حاصل کی جائے۔ امید ہے کہ آپ اپنی تمام مصروفیات کے باوجود کچھ وقت نکال سکیں گے۔ اپنی گزارشات سلسلہ وار تحریر کرتا ہوں۔

۱۔ جن ملکوں میں صنعتی ترقی ہوتی وہاں لازمی طور پر عام اخلاقی تنزل ہوا۔ ملوں کارخانوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے عورت، مرد بچے تک مشینوں کے پرزے بن گئے۔ ان ملکوں میں نتیجہ کے طور

پر کچھ مفکر پیدا ہوتے۔ (مثلاً امریکہ میں جان ڈیوی) جنہوں نے نئی طرز کی زندگی کو نظریاتی سہارا دیا۔ روایات کو غلط قرار دیا۔ اور سوسائٹی کی اقدار ہی کو بدل دیا۔ پاکستان میں ایک طرف تو صنعتی ترقی ضروری ہے۔ دوسری طرف اسلامی روایات اور اقدار کو قائم رکھنا فرض ہے۔ براہ کرم فرمائیے کہ یہ بظاہر متضاد مقاصد کیسے حاصل ہو سکتے ہیں؟ مشینی فضا میں روح کیسے تازہ رہ سکتی ہے؟ تبدیلیاں لازمی ہیں مگر کس حد تک قابلِ قبول ہیں؟

۲۔ اسلامی تعلیم کس قسم کی ہو؟ کیا سب کے لئے ہو؟ فری ہو یا نہ ہو وہ نمونے کی شخصیت جو سکول کو پیدا کرنی چاہیئے۔ اس کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں؟ کیا ہمارے دینی مدارس ایسی شخصیتیں پیدا کر رہے ہیں؟

۳۔ نمونے کی اسلامی گھریلو زندگی کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں؟ کیا موجودہ گھریلو زندگی اسلامی ہے؟ کیا شہر اور گاؤں میں ایک طرز کی گھریلو زندگی ہوگی؟ موجودہ گھریلو زندگی میں پرانی ہندوستانی روایات کا کتنا دخل ہے؟

جواب: یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ آجکل امریکہ میں فن تعلیم کی تحصیل مزید کر رہے ہیں۔ جن موضوعات کا آپ نے اپنے عنایت نامے میں ذکر کیا ہے وہ فی الواقع بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے متعلق مختصراً اپنے خیالات عرض کیے دیتا ہوں۔

انسانی تمدن میں مادی تغیرات کی مثال ان تغیرات کی سی ہے جو فرد انسانی کے جسم میں بچپن سے جوانی، جوانی سے کہولت اور کہولت سے بڑھاپے کی طرف منتقل ہوتے وقت رونما ہوتے ہیں۔ ان کا روح اور نفس سے گہرا تعلق ضرور ہے۔ مگر ان تغیرات کے نتائج کا کوئی ایسا متعین اور قطعی ٹھپہ نہیں ہے جو تمام انسانوں کے نفس پر ہمیشہ یکسانیت کے ساتھ لگتا ہو۔ بلکہ ان میں فرد فرد کے لحاظ سے بھی اور انسانی جماعتوں کے لحاظ سے بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔ جس میں بہت سے دوسرے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ اگر تعلیم، تربیت اور معاشرتی ڈھانچہ جو کسی فرد انسانی کو میسر آئے، ایسا صالح ہو کہ فرد کو ارتقاء حیات کی طرف لے جانے کے ساتھ ساتھ وہ ایک عمدہ اور مضبوط سیرت کو بھی اس کے اندر نشو ونما دیتا رہے تو بچپن سے جوانی کی عمر میں داخل ہوتے وقت اس کی طبیعت کی جولانی غلط راہوں پر جانے کے بجائے بہترین تعمیری راہیں اختیار کرتی ہے اور یہی ارتقاء بڑھاپے تک صحیح طریقے سے بڑھتا رہتا ہے۔ لیکن اگر تعلیم کسی صحیح فکر کو نشو ونما دینے والے فلسفے پر مبنی نہ ہو اور تربیت بھی غلط عادات وخصائل پیدا کرنے والی ہو اور پھر معاشرتی ڈھانچہ بھی بگاڑنے والا ہی میسّر آئے، تو ایک بچہ آغازِ ہوش ہی سے مجرم بننا شروع ہوتا ہے۔ جوان ہو کر چور اور ڈاکو بن کر اٹھتا ہے اور بڑھاپے تک اس کی جرائم پیشگی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح انسانی تمدن میں جو مادی تغیر، مثلاً صنعتی انقلاب سے رونما ہوا، اس میں بجائے خود کوئی خرابی نہ تھی۔ اس میں انسان کی بھلائی ہی کا سامان تھا، جیسے جوانی کا آنا بجائے خود کوئی برائی نہیں بلکہ انسان کے

لیے اپنی ذات میں رحمت ہی ہے۔ لیکن قصور اس فلسفۂ حیات کا تھا جو سولھویں سترھویں صدی سے یورپ میں نشو ونما پا رہا تھا۔ اس نے ذہن کو بگاڑا، ذہن کے بگاڑ نے اخلاق خراب کئے، اور اخلاق کی خرابی نے معاشرتی ڈھانچے کو، جو دور جاگیرداری سے بگڑا ہوا چلا آرہا تھا اور زیادہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ اس حالت میں صنعتی انقلاب کی طاقت میسّر آجانے سے قوموں کی قومیں جرائم پیشہ بن گئیں اور اب ایٹم کی طاقت پاکر تہذیب کی ساری نمائشوں کے باوجود اسفل السافلین کی طرف جا رہی ہیں۔ اس حالت میں جو فلاسفر لوگوں کو اس بگاڑ پر مطمئن کرنے کے لیے نئے نئے نظریاتی سہارے دیتے ہیں اور بگڑے ہوتے سانچے سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے سوسائٹی کی اقدار بدلنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی مثال اس دشمن دوست نما کی سی ہے جو ایک بگڑتے ہوئے بچے کو پہلی مرتبہ جیب کاٹنے پر شاباش کہے اور اسے یقین دلائے کہ یہ جیب تراشی تو ایک بہترین آرٹ ہے جس کی مذمت کرنے والے لوگ محض دقیانوسی ہیں۔

میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ مادی ترقی کے مقاصد اور اسلامی اقدار کے مقاصد میں کوئی حقیقی تضاد ہے۔ نہ میں یہ جانتا ہوں کہ یورپ میں صنعتی ترقی کے ساتھ جس مخصوص تمدن و تہذیب نے نشو ونما پایا ہے یہ صنعتی ترقی سے کوئی جوہری تلازم رکھتا ہے اور لازماً جب اور جہاں بھی یہ ترقی ہوگی وہاں یہی تہذیب ظہور میں آئے گی یا آنی چاہیے۔ اسی طرح یہ مفروضہ بھی میرے لیے قابل قبول نہیں ہے کہ انسانی روح چرخے اور چاک اور چکی کے ساتھ تو تازہ دم رہ سکتی

تھی مگر مشین ہی کی فطرت کچھ ایسی ہے کہ اس سے سابقہ پیش آتے ہی اس روح پر مُردنی چھا جاتی۔ میرے نزدیک ایک صحیح فلسفۂ حیات سے اگر ذہن درست کیے جاتیں، ایک صالح نظام اخلاق اگر سیرت گری کے لیے استعمال کیا جاتے، اور ایک معتدل و متوازن معاشرتی ڈھانچہ انسانوں کو سنبھالنے کے لیے موجود ہو تو صنعتی ارتقاء۔ اور سائنس سے حاصل ہونے والی قوتوں کا استعمال موجودہ مغربی تمدن و تہذیب سے بنیادی طور پر بالکل مختلف ایک دوسرے تمدن و تہذیب کو نشو ونما دے سکتا ہے، جو اس سے بدرجہا زیادہ طاقت ور بھی ہو اور پھر انسانیت کے لیے باعث رحمت بھی۔ مجھے یقین ہے کہ اسلام اور صرف اسلام ہی ہمیں اس طرح کا فلسفۂ حیات اور نظام اخلاق دے سکتا ہے اور اس کی رہنمائی عملاً قبول کر کے اگر ہم اس کی ہدایات کے مطابق اپنا نظام تعلیم و تربیت عامہ، اور اپنا معاشرتی ڈھانچہ بنالیں تو ان شرائط کی تکمیل ہوسکتی ہے جو اوپر میں نے مادی ترقی کے ساتھ ایک صالح تہذیب کی تشکیل کے لیے بیان کی ہیں۔ اس معاملے میں یہودیت پہلے ہی مایوس کن تھی، عیسائیت نئے دور کے آغاز ہی میں ناکام ثابت ہو گئی۔ اور بودھ مت سرے سے اس میدان کا مرد تھا ہی نہیں۔ رہے جدید مذاہب، سوشلزم، فاشزم اور کیپٹلزم سو وہ اپنے تمام عیوب و محاسن کھول کر سامنے لا چکے ہیں اور دنیا خوب دیکھ چکی ہے کہ اس کے محاسن کو ان کے عیوب سے کیا نسبت ہے۔ نیا کوئی فلسفہ بھی اب تک ایسا سامنے نہیں آیا ہے جو ایک تہذیب کی بنیاد بننے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اس کو سوچنے والے تمام تر اہل مغرب ہیں اور وہ اپنی اس تہذیب کے

زہریلے پن سے تنگ آنے کے باوجود اس کی بنیادوں میں تغیر کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے ذہن اس کے حدود سے آزاد ہوکر سوچنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ صرف جزوی ترمیمات سے کام چلانا چاہتے ہیں اور ان میں سے اکثر کی تجویز کردہ ترمیمیں مزید بگاڑ ہی کی طرف لے جانے والی ہیں۔

اس مختصر خط میں میرے لیے وہ وجوہ بیان کرنا مشکل ہے جن کی بنا پر میں اس معاملہ میں اسلام کو علی وجہ البصیرت کافی ہی نہیں بلکہ انسانیت کے لئے ایک ہی شعاع امید سمجھتا ہوں۔ ان دلائل کے اعادہ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ میں انہیں اپنی متعدد کتابوں میں بیان کر چکا ہوں، مثلاً اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصّہ سوم وغیرہ، اس کے علاوہ میرے بہت سے مضامین میں بھی اس کی طرف اشارات موجود ہیں۔

آپ کے دوسرے سوالات کا جواب یہ ہے کہ اسلامی تعلیم اس دور کے لیے جس طرز پر دی جانی چاہیئے اسے میں نے اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب تعلیمات میں بیان کیا ہے۔ آپ اسے ملاحظہ فرمالیں۔ میرے نزدیک یہ تعلیم ہر بچے کو ملنی چاہیئے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، البتہ اس کے مدارج میں صلاحیتوں کے لحاظ سے فرق کیا جانا چاہیے۔ اس کو ابتدائی حد تک جبری اور کم از کم ثانوی حد تک سب کے لیے بالکل مفت ہونا چاہیئے، اور آگے کے مدارج میں خاص صلاحیت رکھنے والے نوجوانوں کی کفالت بھی ریاست کو کرنی چاہیئے۔ جو نمونے کی شخصیت ایک مدرسے کو پیدا کرنی چاہیئے اس کی

خصوصیات صرف چار اسلامی اصطلاحوں میں بیان کی جا سکتی ہیں: مومن ہو، مسلم ہو، متقی اور محسن ہو، ان اصطلاحوں کو آپ جتنے زیادہ وسیع معنوں میں لیں گے شخصِ مطلوب اتنا ہی زیادہ جامع کمالات ہوگا۔ تنگ معنوں میں لیں تو صنعتی ترقی کی باتیں اور اس ترقی میں موجودہ تہذیب وتمدّن کے فاسق و فاجر کھلاڑیوں سے مسابقت کا خیال چھوڑ دیں، پھر انشاء اللہ پاکستان و ہندوستان کی ہر مذہبی درسگاہ میں آپ کو نمونے مل جائیں گے۔

ہماری گھریلو زندگی کی بنیادی خصوصیات اسلام کی رُو سے چار ہیں: ایک تحفظِ نسب، جس کی خاطر زنا کو حرام اور جرم قابلِ تعزیر قرار دیا گیا ہے، پردے کے حدود قائم کیے گئے ہیں اور زن و مرد کے تعلق کو صرف جائز قانونی صورتوں تک محدود کر دیا گیا ہے جن سے تجاوز کا اسلام کسی حال میں بھی روادار نہیں ہے۔ دوسرے تحفظِ نظامِ عائلہ جس کے لئے مرد کو گھر کا قوّام بنایا گیا ہے، بیوی اور اولاد کو اس کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور اولاد پر خدا کے بعد والدین کا حق سب سے زیادہ رکھا گیا ہے۔ تیسرے حسنِ معاشرت جس کی خاطر زن و مرد کے حقوق معین کر دیئے گئے ہیں، مرد کو طلاق کے اور عورت کو خلع کے اور عدالتوں کو تفریق کے اختیارات دیئے گئے ہیں، اور الگ ہونے والے مرد و زن کے نکاح ثانی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی ہے تاکہ زوجین یا تو حسنِ سلوک کے ساتھ رہیں، یا اگر باہم نہ نباہ سکتے ہوں تو بغیر کسی خرابی کے الگ ہو کر دوسرا بہتر خاندان بنا سکیں۔ چوتھے صلۂ رحمی جس سے مقصود رشتہ داروں کو ایک دوسرے کا معاون و مددگار بنانا ہے اور اس غرض کے لیے ہر انسان پر اجنبیوں کی بہ نسبت

اس کے رشتہ داروں کے حقوق مقدم رکھے گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس بہترین نظام عائلہ کی قدر نہ پہچانی اور اس کی خصوصیات سے بہت کچھ دور ہٹ گئے ہیں۔ اس نظام عائلہ کے اصولوں میں شہری اور دیہاتی کے لیے کوئی فرق نہیں ہے۔ رہے طرز زندگی کے مظاہر تو وہ ظاہر ہے کہ شہروں میں بھی یکساں نہیں ہو سکتے، کجا کہ شہریوں اور دیہاتیوں کے درمیان کوئی یکسانیت ہو سکے۔ فطری اسباب سے ان میں جو فرق بھی ہو وہ اسلام کے خلاف نہیں ہے بشرطیکہ بنیادی اصولوں میں ردوبدل نہ ہو۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۱۔ عدد ۶۔ مارچ ۱۹۵۹ء)

شیطان کی حقیقت

سوال: لفظ شیطان کی ماہیت کیا ہے جو قرآن میں متعدد مقامات پر مذکور ہے اور یوں بھی عام فہم زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ کیا شیطان ہم انسانوں جیسی کوئی مخلوق ہے جو زندگی و موت کے حوادث سے دوچار ہوتی ہے اور جس کا سلسلہ توالد و تناسل کے ذریعہ قائم ہے؟ کیا یہ بھی ہماری طرح ہم آہنگی میں مرلوط ہوتی ہے جس طرح سے ہم کھانے کمانے اور دیگر لوازمات زندگی میں مشغول رہتے ہیں؟ اس کے انسان کو دھوکہ دینے کی کیا قدرت ہے؟ کیا یہ اعضائے جسمانی میں

سرایت کر جانے کی قدرت رکھتی ہے اور اس طرح انسان کے اعصابی محرکات پر قابو پالیتی ہے اور بالجبر اسے غلط راستے پر لگا دیتی ہے اگر ایسا نہیں ہے تو پھر دھوکا کیسے دیتی ہے۔

یا شیطان عربی زبان کی اصطلاح میں محض ایک لفظ ہے جو ہر اس فرد کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو تخریبی پہلو اختیار کرلے۔ یا یہ انسان کی اس اندرونی جبلت کا نام ہے جسے قرآن نفس امارہ یا نفسِ لوامہ کے الفاظ سے تشبیہہ دیتا ہے۔ یعنی نفس جو غلط کاموں کی طرف اکساتا ہے۔ چونکہ شیطان کا حربہ بڑا خطرناک ہوتا ہے اس لئے اس سے بچنے کی خاطر یہ سوال پوچھا جا رہا ہے۔

جواب: شیطان کے متعلق میرے پاس کوئی ذریعۂ معلومات قرآن اور حدیث کے سوا نہیں ہے۔ اس ذریعہ سے جو کچھ معلوم ہے وہ یہ ہے کہ شیطان محض کسی قوت کا یا انسان ہی کے کسی رجحان کا نام نہیں ہے بلکہ وہ جنوں میں سے ہے اور جن ہماری طرح ایک مستقل مخلوق ہے جس کا ہر فرد افرادِ انسان کی طرح ایک شخصیت PERSONALITY رکھتا ہے۔ اس کی معیشت اور اس کے مشاغل اور توالد و تناسل وغیرہ کے متعلق ہم کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ اس کو ہمارے جسم پر قبضہ کر کے ہم سے بالجبر کوئی کام کرا لینے کے اختیارات نہیں دیئے گئے ہیں۔ وہ صرف ہمارے نفس کو ترغیب دینے، اُکسانے اور بُرے کاموں کی طرف مائل کرنے یا وساوس اور شبہات ڈالنے کا کام کر سکتا ہے۔ اور ہم چاہیں تو اس کی ترغیبات کو رد کر کے اپنے ارادے سے ایک راہ اختیار

کر سکتے ہیں۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۲، عدد ۵۔ اگست ۱۹۵۹ء)

سوال: جب بھی کسی برائی کے سرزد ہو جانے کے بعد مجھے مطالعۂ باطن کا موقع ملا ہے تو میں نے یوں محسوس کیا ہے کہ خارج سے کسی قوت نے مجھے غلط قدم اٹھانے پر آمادہ نہیں کیا بلکہ میری اپنی ذات ہی اس کی ذمّہ دار ہے۔ جب میری جبلّی خواہش میرے فکر پر غالب آجاتی ہے اور میری روح پر میری نفسانیت کا قبضہ ہو جاتا ہے تو اس وقت میں گناہ کا ارتکاب کرتا ہوں۔ باہر سے کوئی طاقت میرے اندر حلول کر کے مجھے کسی غلط راہ پر نہیں لے جاتی۔ مگر جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ان فکری اور عملی گمراہیوں کا محرّک شیطان ہے جو اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے۔ یہ دشمن انسانیت کبھی خارج سے اور کبھی انسان کے اندر گھُس کر اُسے غلط راستوں پر لے جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ آپ بھی شیطان کو ایک مستقل وجود رکھنے والی ایسی ہستی تسلیم کرتے ہیں جو انسان کو بہکاتی اور پھسلاتی ہے۔

جواب:۔ شیطان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہ جن کی نوع کا ایک فرد ہے، اور اس نوع کے بہت سے افراد نوعِ انسانی کی طرح مومن بھی ہیں اور کافر بھی۔ نیز شیاطین جن انہی کافروں میں سے ہیں۔ اسی طرح قرآن یہ بھی بتاتا

ہے کہ جنوں کی نوع ناری الخلقت ہے۔ مجھے اس نوع کے وجود میں کوئی اشکال محسوس نہیں ہوتا۔ مادہ اور قوت ENERGY کے متعلق ہماری معلومات درحقیقت ابھی بالکل ابتدائی ہیں۔ قوت کے مادی صورت اختیار کرنے کے بعد کی حالتوں کے متعلق تو ہم نسبتاً کچھ زیادہ جانتے ہیں، مگر مادی صورت اختیار کئے بغیر محض قوت رہنے کی حالت میں وہ کیا کیا کچھ ہو سکتی ہے، اس علم کی سرحد سے ابھی ہم آگے نہیں بڑھ سکے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے، اور آخر کیوں ممکن نہیں ہے کہ محض توانائی ہونے کی حالت میں بھی مختلف انواع کی موجودات اس کائنات میں ہوں؟ اور ان میں بعض قسم کی موجودات ایسی بھی ہوں جن کے افراد شعور و ارادہ اور حرکت و عمل کی قدرت کے ساتھ اپنی ایک مستقل ذات رکھتے ہوں؟ شیطان میرے نزدیک اسی نوعیّت کی ایک مخلوق ہے اور یہ مخلوق بھی ہماری طرح اس کرۂ زمین میں پائی جاتی ہے۔

رہا ہمارے نفس کے ساتھ اس کا ربط CONTACT اور اس کا ہمارے اندر کے معرکہ خیر و شر میں شر کے رجحانات کو تقویت پہنچانا، تو یہ بھی کوئی ناقابلِ یقین یا ناقابلِ تعقل بات نہیں ہے۔ اپنے نفس کے متعلق ابھی ہماری معلومات بہت کم ہیں اور اس کی ترکیب کی گتھیوں کو ہم سلجھا نہیں سکے ہیں۔ یہ بات بعید نہیں کہ جس وقت ہم اپنے اندر ایک کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں اور یہ آخری فیصلہ ابھی ہم نے نہیں کیا ہوتا ہے کہ خیر اور شر میں سے کس پہلو کو اختیار کریں، اس وقت کوئی غیر محسوس خارجی مؤثر ہمارے رجحاناتِ شر کو تقویت پہنچاتا ہو، اور اسی طرح کوئی دوسرا غیر محسوس خارجی مؤثر (یعنی فرشتہ)

ہمارے رجحانات خیر کو مدد دے رہا ہو، بغیر اس کے کہ ہم اس کے عمل اور طریق عمل کا ادراک کر سکیں۔ اگرچہ اس کا ادراک ہمیں نہیں ہوتا، لیکن اگر ایسی کشمکش کے مواقع پر بہت زیادہ غور سے اپنی اندرونی حالت کا جائزہ لیا جاتے تو ایک دھندلا سا خیال ضرور آتا ہے کہ خارج سے بھی کوئی چیز ہمارے داخلی عوامل کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ میں نے خود کبھی کبھی اس کو محسوس کیا ہے۔ بہر حال کسی غیر مادی صاحب تشخص ہستی کا ہمارے قوائے نفسانی سے براہ راست ربط قائم کرنا اور ان کو متاثر کرنا کوئی بعید از امکان بات نہیں ہے اور نہ اس کا تصور کرنا کچھ مشکل ہے۔ الّا یہ کہ ہم پہلے ہی سے یہ فرض کر بیٹھیں کہ اس کائنات میں ہماری موجودات کے سوا اور کسی قسم کی موجودات نہیں ہیں۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۳، عدد ۲۔ نومبر ۱۹۵۹ء)

لفظ فطرت کا مفہوم

سوال: ایک لفظ "فطرت" کا استعمال بہت عام ہے آخر فطرت ہے کیا چیز؟ کیا یہ انسان کی خود پیدا کردہ چیز ہے؟ یا فطرت انسان کی ان پیدائشی صلاحیتوں کا نام ہے جو وہ ماں کے پیٹ سے لیکر پیدا ہوتا ہے؟ کیا فطرت انسان کی اپنی جد وجہد سے اچھی یا بُری بن سکتی ہے یا انسان اس معاملہ میں بالکل مجبور ہے؟ اگر نہیں تو

کیا فطرت کے نقائص جدوجہد کے ذریعہ دُور کیے جا سکتے ہیں؟ یہ سوال میری اپنی ذات سے متعلق ہے۔ میری فطرت انتہائی ناقص ساخت کی معلوم ہوتی ہے جس کے اثرات میری گھٹی میں سماتے ہوتے ہیں اور باوجود انتہائی کوششوں کے دُور نہیں ہوتے۔ اس لیے آپ سے استدعا ہے کہ مجھے کوئی مشورہ دیں۔

جواب: فطرت کے اصل معنی ساخت کے ہیں۔ یعنی وہ بناوٹ جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے ہر ایک جنس، نوع اور فرد کو عطا کی ہے، اور وہ صلاحیتیں اور قوتیں جو اس نے ہر ایک کی ساخت میں رکھ دی ہیں۔ ایک فطرت بحیثیت مجموعی انسان کی ہے جو پوری نوع انسانی میں پائی جاتی ہے۔ ایک فطرت ہر ہر انسانی فرد کی جدا جدا بھی ہے جس سے ہر ایک کی الگ ایک مستقل شخصیت و انفرادیت تشکیل پاتی ہے۔ اور اسی فطرت میں وہ قوتیں بھی شامل ہیں جن کو استعمال کر کے اپنے آپ کو درست کرنے یا بگاڑنے، اور دوسروں کے مفید یا مضر اثرات کو قبول یا رد کرنے کی قدرت انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے نہ تو یہ کہنا درست ہے کہ انسان اپنی فطرت کو بنانے یا بدلنے پر کامل قدرت رکھتا ہے اور نہ یہ کہنا درست ہے کہ وہ بالکل مجبور ہے اور کوئی قدرت اس کو سرے سے حاصل ہی نہیں ہے بات ان دونوں کے درمیان ہے۔ آپ کوشش کر کے اپنی بعض فطری کمزوریوں کی اصلاح بھی کر سکتے ہیں اور یہ اصلاح کی فطرت بھی آپ کی فطرت ہی کا ایک حصہ ہے۔ آپ نے اپنی جن کمزوریوں کا ذکر کیا ہے اپنے نفس کا جائزہ لے کر اچھی طرح ان کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ پھر اپنی قوتِ فکر و فہم، قوتِ تمیز اور قوتِ ارادی

سے کام لے کر بتدریج ان کو گھٹانے اور اعتدال پر لانے کی کوشش کرتے چلے جائیں آپ کا یہ کہنا کہ میرے اندر یہ یہ کمزوریاں ہیں خود اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ انہیں محسوس کرتے ہیں۔ اب جس وقت بھی ان میں سے کسی کمزوری کا ظہور شروع ہوا، اور آپ کو محسوس ہو جائے کہ اس کمزوری نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا ہے، اسی وقت اپنی ارادی قوت کو اس کی روک تھام کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیجئے اور اپنی قوت فکر و فہم اور قوت تمیز سے کام لے کر معلوم کیجئے کہ نقطۂ اعتدال کونسا ہے، جس کی طرف اپنے آپ کو موڑنے اور آگے بڑھانے کے لیے آپ اپنی ارادی قوت استعمال کریں۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۲، عدد ۲۔ اگست ۱۹۵۹ء)

فتنۂ تصویر

سوال: آج کل تصویروں اور فوٹو گرافی کا استعمال کثرت سے ہے۔ زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں ان کا استعمال ایک تہذیبی معیار بن گیا ہے۔ بازار کی دوکانوں میں، مکانوں کے ڈرائنگ روموں میں، رسالوں کے سرورق پر، اخباروں کے کالموں میں، غرضیکہ جس طرف بھی نگاہ اٹھتی ہے اس لعنت سے سابقہ پڑتا ہے اور بعض اوقات توجہ مبذول ہو کے رہتی ہے۔ کیا نسوانی تصویروں کو بھی پوری توجہ کے ساتھ دیکھنا

گناہ ہے۔

جواب:- تصویروں کا فتنہ فی الواقع ایک بلائے عام بلکہ سیلاب بلا کی صورت اختیار کر گیا ہے جس کا کوئی علاج میرے علم میں اس کے سوا نہیں ہے کہ بحیثیتِ مجموعی نظامِ زندگی میں تغیر واقع ہو اور اس نظام کی زمام کار ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہو جو معاشرے میں تمام منکرات کے ظہور کو روک دیں۔ جب تک یہ سیلاب امنڈ رہا ہے، جو شخص جس حد تک بھی اس سے بچ سکتا ہو بچنے کی کوشش کرے۔ نسوانی تصویروں کے ساتھ بھی وہی غضِ بصر کا معاملہ کرنا چاہیئے جو خود عورتوں کے لیے شریعت نے لازم کیا ہے، کیونکہ جیتی جاگتی عورت کو گھورنے اور اس کی تصویر کو دیکھنے کے اثرات و نتائج قریب قریب یکساں ہیں۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۲، عدد ۵۔ اگست ۱۹۵۹ء)

قرآن اور سائنس

سوال:- مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت اس بات کو صحیح قرار دیتی ہے کہ قرآن میں بعض باتیں ایسی درج ہیں جو سائنس کے بالکل خلاف ہیں۔ بہت سے اصحابِ علم کا کہنا ہے کہ قرآن پاک میں زمین کی گردش کا کہیں نام و نشان تک نہیں بلکہ سورج کا گردش کرنا ثابت ہے۔

جواب:- یہ خیال بالکل غلط ہے کہ قرآن میں کوئی بات سائنس کے ثابت شدہ حقائق

سے ٹکراتی ہے۔ سائنس دانوں کے نظریات اور مفروضات سے تصادم اور چیز ہے اور حقائق وامورِ واقعیہ سے تصادم اور چیز۔ پہلی چیز سے تصادم کی ہمیں کوئی پرواہ نہیں، لیکن دوسری چیز سے تصادم کی کوئی مثال اگر کسی کے علم میں ہو تو ہمیں بتائے۔ زمین کی گردش کے بارے میں آپ نے جو سوال کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن پاک نہ اس کی حرکت کی صراحت کرتا ہے نہ سکون کی۔ البتہ بعض مقامات پر ضمناً جو اشارات نکلتے ہیں ان سے حرکت ہی کے تصوّر کو تقویت ملتی ہے۔ رہا سورج تو یہ خیال خود سائنس میں بہت پرانا ہو چکا ہے کہ وہ ساکن ہے۔ اب تو ہیئت دان خود کہتے ہیں کہ وہ اپنے پورے نظامِ شمسی کو لیے ہوئے حرکت کر رہا ہے۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۲، عدد ۵۔ اگست ۱۹۵۹ء)

مسئلہ ارتقاء

سوال:۔ ارتقاء کے متعلق لوگوں کے اندر مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ بعض مفکّرین انسانی زندگی کا ظہور محض ایک اتفاقی حادثہ خیال کرتے ہیں۔ بعض کے نزدیک (جن میں ڈاروِن سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے) انسان نے زندگی کی اعلیٰ اور ارفع حالتوں تک پہنچنے کے لیے پست حالتوں سے ایک تدریج کے ساتھ ترقی کی ہے اور یہ ترقی تنازع للبقاء اور بقائے اصلح کی رہین منت ہے۔

بعض لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ انسان ہمیشہ جغرافیائی ماحول کے سانچوں میں ڈھلتا رہا ہے جیسا کہ لامارک۔ بعض لوگ برگسان کے تخلیقی ارتقا کے قائل نظر آتے ہیں۔ آپ کی تحریروں کے مطالعہ سے یہ بات منکشف نہیں ہو سکی کہ آپ ارتقاء کے کس پہلو کے مخالف ہیں۔ براہ کرم اس پہلو کی نشاندہی کریں۔

جواب: مسئلہ ارتقاء پر میں نے جو اعتراضات بھی کئے ہیں وہ دراصل ڈارونزم کے خلاف ہیں۔ نفسِ ارتقاء تو ایک امر واقعی ہے جس سے اختلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن ڈارونزم ایک مفروضے سے زیادہ کچھ نہیں ہے، اور مفروضہ بھی ایسا جو تمام مشہود حقائق کی معقول توجیہہ نہیں کرتا، بلکہ بعض حقائق کی قیاسی توجیہہ کرتے ہوتے بہت سے حقائق سے نظر چرانے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر ایک شدید علمی استبداد جو پادریوں کے مذہبی استبداد سے اپنی متعصبانہ نوعیت میں کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، اس کی پشت پناہی کرتا ہے اور اس کے خلاف سائنٹیفک تنقید کو برداشت نہیں کرتا۔ تاہم اس نظریے پر اب تک جو تنقیدیں گہرے علمی استدلال کے ساتھ ہوتی ہیں انہیں نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس پر بکثرت اعتراضات ایسے ہیں جن کو رفع کرنے میں ڈارونزم کے حامی اب تک کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ آپ اس تنقیدی لٹریچر کا مطالعہ کر کے خود دیکھ لیں کہ اعتراضات کتنے وزنی ہیں اور جن چیزوں کو ڈارونزم کا ثبوت کہا جاتا ہے وہ کس قدر کمزور ہیں۔ مثال کے طور پر صرف ایک ہی کتاب (The Revolt Against Reason) کے مطالعہ کا میں آپ کو مشورہ دوں گا۔ میں جس چیز کو

صحیح سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ نباتات وحیوانات کی ہر نوع اور اسی طرح نوع انسانی کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس طرح پیدا کیا ہے کہ ہر نوع کے پہلے فرد کو وہ براہ راست اپنے تخلیقی عمل سے وجود میں لایا اور اس کے بعد خود اسی کے اندر اس نے تناسل کی طاقت رکھ دی، جس سے بے شمار افراد توالد و تناسل کے ذریعہ سے وجود میں آتے چلے گئے۔ یہ نظریہ تمام مشہود حقائق (Observed Facts) کی زیادہ بہتر توجیہہ کرتا ہے اور کوئی اعتراض اس پر ایسا نہیں لایا جا سکتا جس کا جواب اس نظریہ میں موجود نہ ہو، نہ کوئی مشکل اس نظریے کی تفصیلات میں کسی جگہ ایسی سامنے آتی ہے جو حل نہ ہو سکتی ہو۔ سوال یہ ہے کہ ہر ممکن التصور مفروضے کو تو ناقابل غور سمجھا جاتا ہے، مگر اس نظریے سے فرار کیوں کیا جاتا ہے؟

(ترجمان القرآن جلد ۵۳، عدد ۲۔ نومبر ۱۹۵۹ء)

انسانیت کے مورثِ اعلیٰ، حضرتِ آدمؑ

سوال: (۱) قرآن مجید نے حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر جس انداز سے کیا ہے وہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ نوعِ بشری کے یہ سب سے پہلے رُکن بڑے ہی مہذب تھے۔ اس سلسلہ میں جو چیز میرے ذہن میں خلش پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس متمدن انسان کی صلب سے وحشی قبائل آخر کس طرح پیدا ہو گئے۔ تاریخ کے اوراق پر نگاہ ڈالنے

سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قبائلی اخلاق اور انسانیت کی بالکل بنیادی اقدار تک سے ناآشنا ہیں۔ نفسیات بھی اس امر کی تائید کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ وحشی انسانوں اور حیوانوں کے مابین کوئی بہت زیادہ فرق نہیں سوائے اس ایک فرق کے کہ انسان نے اپنی غور وفکر کی قوتوں کو کافی حد تک ترقی دے دی ہے۔ یہ چیز تو مسئلہ ارتقاء کو تقویت پہنچاتی ہے مجھے امید ہے کہ آپ میری اس معاملہ میں رہنمائی فرما کر میری اس خلش کو دور کریں گے اور اس امر کی وضاحت فرمائیں گے کہ ابتدائی انسان کی تخلیق کی نوعیت کیا تھی اور اس کے جبلی قویٰ کس سطح پر تھے؟

(ب) حضرت آدمؑ تاریخ کے کس دور میں پیدا ہوئے؟ اس ضمن میں مذہب جو معلومات ہمیں فراہم کرتا ہے نفسیاتی اور ارضیاتی حقائق ان کی تائید نہیں کرتے۔ کیا آدم اور حوّا کا یہ قصہ ایک تمثیل اور مجازی چیز نہیں؟

جواب: (۱) میں حضرت آدمؑ کو نوع انسانی کا پہلا فرد سمجھتا ہوں اور میرا یہ بھی خیال ہے کہ پہلے فرد کی براہ راست تخلیق (Direct creation) کی گئی تھی، اور یہ کہ اس فرد کو پیدا کر کے یونہی چھوڑ نہیں دیا گیا کہ خود ہاتھ پاؤں مار کر فکری اور عملی تہذیب کی جانب پیش قدمی کرے، بلکہ اسے خداوند تعالیٰ کی رہنمائی ونگرانی میں وہ ابتدائی تربیت بھی دی گئی جو تہذیب انسانی کی داغ بیل ڈالنے کے لئے لازماً درکار تھی۔ آپ غور کریں تو خود سمجھ سکتے ہیں کہ ہر نوع کے افراد کو زندگی کا آغاز کرنے کے لیے کچھ بنیادی رہنمائی درکار ہوتی ہے۔ حیوانات کے افراد کو

یہ رہنمائی بہت کم اور محدود پیمانے پر درکار ہوتی ہے اور وہ ہر بچۂ حیوان کو بالعموم اس کے ماں باپ یا دوسرے افراد نوع سے ملتی ہے۔ انسان کا بچہ اس سے بہت زیادہ اور بڑے پیمانے پر نگہبانی و رہنمائی کا محتاج ہوتا ہے جو اگر نہ ملے تو وہ یا تو زندہ ہی نہیں رہ سکتا یا بچہ انسان کی حیثیت سے نشو ونما نہیں پاسکتا۔ یہ ابتدائی اور ضروری رہنمائی میرے نزدیک ہر نوع کے پہلے فرد کو اور اسی طرح نوعِ انسانی کے بھی اولین فرد کو اس کی ضرورت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی تھی۔

یہ بات کہ انسان کبھی تہذیب سے بالکل عاری اور اپنی حالت میں پوری طرح حیوانات کی سطح پر تھا، محض ایک مفروضہ ہے جو اس دوسرے مفروضے پر قائم کیا گیا ہے کہ انسان حیوانات میں سے ترقی کرتا ہوا حالت انسانی کو پہنچا ہے۔ اس وقت تک کے مشاہدات میں کوئی چیز ان دونوں مفروضات کی تائید کرنے والی، تائید اس معنی میں کہ انہیں ثابت کر دے نہیں ملی ہے۔ اس کے برعکس قدیم ترین آثار میں بھی جہاں کہیں انسان (نہ کہ کوئی خیالی مفقود حلقہ (Missing Link)) ملا ہے، وہیں تہذیب کے بھی نشانات ملے ہیں چاہے وہ کیسے ہی ابتدائی مرحلے کے ہوں۔ خالص غیر مہذب و غیر متمدن انسان مثل حیوان، اب تک کہیں نہیں پایا گیا ہے۔ جن کو آپ غیر متمدن (Savage) کہتے ہیں ان میں اور حیوانی زندگی کی برتر صورتوں میں اگر واقعی تقابل کیا جائے تو ایسے بنیادی فرق پائے جائیں گے کہ حیوان کی کسی اونچی سے اونچی قسم کو انسان کی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ وحشیانہ حالت سے بھی کوئی نسبت نہ ہوگی۔ یہ دراصل

ارتقاء خولیا ہے جس کی وجہ سے کچھ سطحی تشابہات کو انسان و حیوان میں مماثلت کی بنیاد بنایا جاتا ہے۔ بالکل ابتدائی حالت میں بھی چند چیزیں ایسی ہیں جو قطعی طور انسان اور حیوان میں فرق کر دیتی ہیں۔ مثلاً حیا۔ جس کا اظہار اعضائے جنسی کو چھپانے اور مباشرت میں اخفاء سے کام لینے کی صورت میں ہوتا ہے۔ الفاظ اور اشارات کی شکل میں اظہار خیال جو حیوانات کی آوازوں سے بالکل بنیادی طور پر مختلف ہوتا ہے۔ قوتِ ایجاد جو حیوانات کی جبلت کے تحت لگی بندھی صنعتوں سے کلیتہً اپنی نوعیت میں بالکل ایک مختلف چیز ہے۔ ارادی اور غیر ارادی افعال میں فرق کرنا اور ارادی افعال پر اخلاقی احکام لگانا جو حیوانات کی کسی بڑی سے بڑی ترقی یافتہ شکل میں بھی موجود نہیں ہے۔ مذہبی حس جو حیوانات میں معقود ہے مگر انسانوں کا کوئی گروہ انتہائی وحشت کی حالت میں بھی اس سے خالی نہیں پایا گیا ہے۔

(ب) آدم کا زمانہ وجود متحقق کرنے کا ابھی تک کوئی ذریعہ نہیں ملا ہے۔ کوئی علم اس معاملہ میں یقینی یا قریب بہ یقین معلومات فراہم نہیں کرتا۔ یہ علم صرف انبیاء اور کتب آسمانی کے ذریعہ سے ہم تک پہنچا ہے۔ البتہ علم تناسل اور قیاس عقلی کی مدد سے دو نظریے قائم کئے جا سکتے ہیں۔ یا تو یہ کہ موجودہ انسانی نسل متعدد انسانی مورثوں کے نطفے سے نکلی ہو۔ یا پھر یہ کہ اس کا ایک ہی مورث ہو اور اس سے حیاتِ انسانی ان بے شمار افراد تک منتقل ہوئی ہو۔ آپ خود دیکھ لیں کہ ان میں سے کونسا نظریہ زیادہ قرین عقل ہے۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۲، عدد ۲۔ نومبر ۱۹۵۹ء)

مسئلہ تقدیر

سوال:- مجھے آپ کی تصنیف مسئلہ جبر و قدر کے مطالعہ کا موقع ملا۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ آپ نے نہایت ہی علمی انداز میں اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر جبر و قدر کے جو مبحث ملتے ہیں اُن میں قطعاً کوئی تناقض نہیں اس معاملہ میں میری تو تشفی ہو چکی ہے مگر ذہن میں پھر بھی دو سوال ضرور اُبھرتے ہیں۔ ایک یہ کہ کیا انسان کی تقدیر پہلے سے طے ہے اور مستقبل میں جو واقعات و حوادث اُسے پیش آنے والے ہیں وہ ازل سے ہی مقرر اور معیّن ہیں اور اب ان کے چہرے سے صرف نقاب اٹھانا باقی رہ گیا ہے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہو تو پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ صورتِ حال انسان کے ارادۂ عمل کی آزادی کے ساتھ کیسے میل کھا سکتی ہے؟

جواب:- تقدیرِ سابق اور انسان کی آزادیٔ ارادہ کے درمیان کس نوعیت کا تعلق ہے اور ان دونوں کے حدود کیا ہیں، یہ مسئلہ درحقیقت ہماری گرفت سے باہر ہے اور اس کے متعلق کوئی یقینی بات کہنے کی پوزیشن میں ہم نہیں ہیں۔ البتہ اصولی طور پر تین باتیں ایسی ہیں جو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔

ایک یہ کہ انسان اپنی تقدیر خود بنانے پر کلیتہً قادر نہیں ہے بلکہ جو طاقت

پوری کائنات کا نظام چلا رہی ہے وہی انسان کی (بحیثیت نوع، بحیثیت قوم بحیثیت گروہ اور بحیثیت فرد) تقدیر بناتی ہے۔ البتہ اس کا ایک حصہ (جس کی مقدار ہمیں معلوم نہیں) انسان کے دائرہ اختیار میں بھی ہے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کا علم سابق انسان کے تمام آنے والے حالات پر حاوی ہے۔ خدائی کا عظیم الشان کام ایک دن بھی نہیں چل سکتا اگر خدا اپنی کائنات میں ہونے واقعات سے بے خبر ہو اور کوئی واقعہ جب پیش آجاتے تب ہی اُسے خبر ہو۔

تیسرے یہ کہ اللہ کی قدرت نے انسان کو محدود پیمانے پر کچھ اختیارات دیتے ہیں جن کے لیے آزادیٔ ارادہ ناگزیر ہے اور اللہ کا علم خود اسی کی قدرت کے کسی فعل کو باطل نہیں کرتا۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۳ عدد ۲۔ نومبر ۱۹۵۹ء)

اجنبی ماحول میں تبلیغ اسلام

سوال:- میں علی گڑھ یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ ہوں اور آج کل نائیجیریا میں بحیثیت سائنس ٹیچر کام کر رہا ہوں۔ جب میں ہندوستان سے یہاں آ رہا تھا اس وقت خیال تھا کہ میں ایک مسلم اکثریت کے علاقہ میں جا رہا ہوں اس لیے شرعی احکام کی پابندی میں کوئی دقت

نہیں ہوگی۔ لیکن یہاں آکر دیکھا تو معاملہ کچھ اور ہی نکلا۔ جس علاقے میں میرا قیام ہے یہ غیر مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہاں عیسائی مشنریز خوب کام کر رہے ہیں۔ بہت سے اسکول اور ہسپتال ان کے ذریعہ سے چل رہے ہیں۔ مسلمان یہاں پانچ فیصدی سے زیادہ نہیں ہیں اور وہ بھی تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے ہیں۔ انگریزی نہیں بول سکتے حالانکہ ہر ایک عیسائی تھوڑی بہت انگریزی بول سکتا ہے پڑھے لکھے لوگوں کی بہت مانگ ہے۔ یہاں پر بہت سے غیر ملکی ٹیچر اور سوداگر کام کر رہے ہیں۔ ان میں زیادہ تر عیسائی اور ہندو ہیں۔ میں اپنی طرز کا اکیلا ہوں۔ میرے شہر میں صرف تین بہت چھوٹی مسجدیں ہیں۔ وہ بہت ہی شکستہ حالت میں ہیں۔ اس کے علاوہ دور دور کہیں اذان کی آواز بھی نہیں آتی۔ یہ ملک اکتوبر میں آزاد ہونے والا ہے۔ مجموعی حیثیت سے پورے ملک میں مسلم اکثریت ہے۔ لیکن اس کے باوجود مسلم کلچر کے مقابلہ میں مغربی اور عیسائی کلچر یہاں بہت نمایاں ہے۔ شراب کا استعمال شاید مغربی ممالک سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود دو باتیں یہاں خاص طور پر دیکھنے میں آئیں۔ ایک انسانی رواداری۔ اس معاملہ میں یہ لوگ ہم سے بڑھے ہوتے ہیں۔ غیر ملکی کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ جو مسلمان یہاں ہیں ان کے اوپر مغربی طرز فکر کا اثر نہیں ہوا جتنا کہ ہمارے ہاں ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ لوگ

اب تک مغربی تعلیم کا بائیکاٹ کرتے رہے ہیں۔
ان حالات میں آپ مشورہ دیجئے کہ کس طرح اسلام کی صحیح نمائندگی کی جاتے اور یہاں کے لوگوں کو انگریزی میں کونسا لٹریچر دیا جاتے۔ پڑھا لکھا طبقہ انگریزی لٹریچر سمجھ سکتا ہے۔ "پردہ" کی طرح اگر کوئی کتاب شراب نوشی پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی ہو تو اس سے بھی مطلع فرمائیے!

دوسرے یہ بھی آپ سے مشورہ چاہتا ہوں کہ ایسے حالات میں کس طرح انسان صحیح راہ پر قائم رہے جبکہ ماحول اور سوسائٹی دوسرے رنگ میں رنگے ہوں۔

نیز حسب ذیل چیزوں پر اگر روشنی ڈالیں تو آپ کا مشکور ہوں گا۔

۱۔ یہاں پر دعوتوں اور پارٹیوں میں شراب کا استعمال عام طور پر ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ان دعوتوں میں شرکت کرنا چاہیئے یا نہیں؟ اب تک میرا طرز عمل یہ رہا ہے کہ ایسی جگہوں پر ضرور شرکت کرتا ہوں اور شراب اور دوسری اس قسم کی چیزوں سے انکار کر دیتا ہوں تاکہ کم از کم ان کو یہ احساس تو ہو جاتے کہ بعض لوگوں کو ہماری یہ مرغوب غذا ناپسند ہے۔

۲۔ ان کے برتنوں میں کھانا اور پینا درست ہے یا نہیں؟

۳۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں الکوہل کی تھوڑی بہت

آمیزش ہوتی ہے یا ہوسکتی ہے۔ ان کا استعمال جائز ہوسکتا ہے یا نہیں؟

۴۔ اگر کوئی دعوت کچھ لوگوں کو یہاں دی جائے تو اس میں شراب دی جاسکتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ یہاں کے لوگ بغیر شراب کے دعوت ہی نہیں سمجھتے۔ اور اگر اس کا استعمال نہ کیا جائے تو اس کا کیا بدل دیا جائے؟

جواب: خوشی ہوئی کہ آپ کو ملک سے باہر ایک ایسی جگہ کام کرنے کا موقع ملا ہے جہاں آپ اسلام کی بہت کچھ خدمت کرسکتے ہیں۔ آپ کو اپنی جگہ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ آپ پسماندہ مسلمانوں اور غیر مسلموں، سب کے سامنے حقیقی اسلام کی نمائندگی کے لیے مامور ہیں، اور اپنے قول یا عمل سے اگر آپ نے ذرا بھی غلط نمائندگی کی تو بہت سے بندگانِ خدا کی گمراہی کا وبال آپ کے اوپر ہوگا۔ اس احساس کے ساتھ اگر آپ وہاں رہیں گے اور اپنی حدِ استطاعت تک اسلام کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر ایک مسلمان کی زندگی کا نمونہ بننے کی کوشش کرتے رہیں گے تو امید ہے کہ یہ آپ کی اپنی ترقی کے لیے بھی مفید ہوگا اور کیا عجب کہ یہی چیز آپ کے ہاتھوں بہت سے لوگوں کی ہدایت کا سبب بھی بن جائے جس کا اجر آپ کو خدا کے ہاں نصیب ہو۔

وہاں کے جو حالات مجھے آپ کے خط سے معلوم ہوتے ہیں ان پر غور کرنے کے بعد میرے نزدیک کام کی جو صورتیں مناسب ہیں میں عرض کیے دیتا ہوں مقامی زبان سیکھنے اور بولنے کی مشق کریں اور صرف انگریزی پر اکتفا نہ

کریں۔ غیر ممالک میں جب باہر کا کوئی شخص مقامی لوگوں سے ان کی اپنی زبان میں بات کرتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور اس کی بات بڑی دلچسپی سے سنتے ہیں۔

مقامی مسلمانوں کے ساتھ ربط ضبط بڑھایئے۔ ان کو صحیح دین سمجھانے اور اسلامی طور طریقے سکھانے کی کوشش کیجئے۔ ان میں سے جن کے بچے آپ کے مدرسے میں پڑھتے ہوں ان پر خاص توجہ کیجئے تاکہ وہ آپ کو اپنا ہمدرد سمجھیں۔ دوسرے مدرسوں میں پڑھنے والے بچّوں کو بھی اگر آپ ان کی تعلیم میں کچھ مدد دے سکتے ہوں تو ضرور دیجئے۔ جو لوگ آپ سے انگریزی پڑھنا چاہتے ہوں انہیں پڑھایئے۔ اس طرح ان کے دلوں میں اپنے لیے جگہ پیدا کیجئے اور پھر ان کے اندر دین کا صحیح علم وعمل پھیلانے اور ان کے حالات درست کرنے کی سبیل نکالیے۔ ان میں اگر کچھ با اثر آدمیوں سے تعلقات ہو جائیں تو انہیں مسلمانوں کے حالات کی اصلاح کے طریقے بتایئے اور اخلاص وحکمت کے ساتھ کام کرنے پر ابھاریئے۔ بے غرضی، محبت، تواضع اور حقیقی خیر خواہی کے ساتھ جب آپ ان کی بھلائی کے لیے کوشاں ہوں گے تو دیر یا سویر، انشا۔اللہ ایک دن آپ ان کے دل اپنی مٹھی میں لے لیں گے اور وہ آپ کے کہے پر چلنے لگیں گے۔

جس مدرسے میں آپ کام کرتے ہیں وہاں اپنے طرز عمل سے اپنی اہلیت فرض شناسی اور بلند اخلاقی کا سکّہ بٹھانے کی کوشش کیجئے، یہاں تک کہ طلبہ اور اساتذہ اور منتظمین سب پر آپ کا اخلاقی اثر قائم ہو جائے۔ پھر وہ راستے تلاش کیجئے جن سے آپ غیر مسلم طلبہ اور اساتذہ میں اپنے خیالات پھیلا سکیں۔ اس معاملہ

میں غایت درجہ تدبر و دانائی کی ضرورت ہے۔ جو موقع بھی اسلام کی نمائندگی کا ملے اسے ہاتھ سے نہ جانے دیجیے۔ لیکن ایک قدم بھی غلط نہ اٹھائیے ورنہ نتائج الٹے برآمد ہوں گے۔ طبیب کی دانائی اسی میں ہے کہ وہ مریض کو ٹھیک دوا کی خوراک بروقت دے، نہ کم خوراک دے اور نہ زیادہ دے بیٹھے۔

عام لوگ جن سے آپ کا میل جول ہو ان سے اپنی گفتگوؤں میں مناسب طریقے پر اسلام کا تعارف کرائیے۔ مغربی تہذیب کی کمزوریاں ان پر واضح کیجیے۔ عیسائیت کی ناکامی اس حد تک انہیں سمجھائیے جس کے سننے کا ان میں تحمل ہو۔ پھر جن لوگوں میں اسلامی لٹریچر دیکھنے کی خواہش آپ پائیں ان کو موزوں لٹریچر پڑھنے کے لیے دیجیے۔ مانگ پیدا کیے بغیر ہر ایک کو لٹریچر دینا شروع نہ کر دیجیے۔ انگریزی لٹریچر کی ایک فہرست آپ کو یہاں سے بھجوا دی جائے گی اسے منگوا کر اپنے پاس رکھ لیں۔

غیر مسلموں میں سے جن کے اندر آپ خاص صلاحیت، سلامت طبع اور حق پسندی محسوس کریں ان سے ذاتی تعلقات بھی بڑھائیے اور ان پر خصوصیت کے ساتھ کام بھی کیجیے تاکہ اللہ انہیں ہدایت نصیب کرے۔ لیکن اپنے ہاتھ پر کسی کو مشرف باسلام کرنے سے پرہیز کیجیے۔ جو شخص بھی مسلمان ہونا چاہے اسے مقامی مسلمانوں کے پاس بھیجیے۔

شراب نوشی کے خلاف انگریزی میں بہت سا لٹریچر موجود ہے۔ آپ

(Church of England Temperance Society)

سے لندن کے پتہ پر اور **(Anti Saloon**

League of America) سے واشنگٹن کے پتے پر مراسلت کر کے اس موضوع کے متعلق لٹریچر کی فہرستیں منگوالیں اور مناسب کتابوں کا انتخاب کر کے حاصل کریں۔

اب مختصر طور پر آپ کے سوالات کا جواب عرض کرتا ہوں۔

۱۔ دوسروں کی طرف سے اگر آپ کو دعوت دی جائے تو اس میں ضرور شرکت کریں۔ کیونکہ اس کے بغیر آپ ان کی اصلاح کے لیے ان سے گھُل مل نہ سکیں گے۔ اس نیت کے ساتھ اگر آپ ایسی محفلوں میں شریک ہوں جہاں لوگ شراب پیتے ہوں تو امید ہے کہ اللہ کے ہاں مواخذہ نہ ہوگا۔ آپ ان کی مجلسوں میں شریک ہو کر علانیہ نہ صرف یہ کہ شراب پینے سے پرہیز کریں بلکہ کھلم کھلا اس پرہیز کے معقول وجوہ ہر پوچھنے والے کو ایسے طریقے سے سمجھائیں کہ اسے ناگوار خاطر نہ ہو۔ شرابیوں کی محفل میں ان لوگوں کی شرکت تو بلاشبہ مضر ہے جو شراب نہ پینے پر شرماتے ہوں، لیکن اُن لوگوں کی شرکت بہت مفید ہے جو دھڑلے کے ساتھ شراب نوشی سے انکار کریں اور دلیل کی طاقت سے شراب پینے کی برائی وہیں اسی محفل میں ان لوگوں کو سمجھانے پر آمادہ ہو جائیں جو ان سے شراب نہ پینے کے وجوہ دریافت کریں۔ یہ تو بہترین تبلیغ ہے جس پر میں خدا سے اجر کی توقع رکھتا ہوں۔

۲۔ ان کے صاف دُھلے ہوئے برتنوں میں آپ کھانا کھا سکتے ہیں اگر آپ کو اطمینان ہو کہ وہ کسی حرام چیز سے ملوث نہیں ہیں۔ اطمینان نہ ہونے

میں داعی کو اپنے اصول اور مسلک سے آگاہ فرما دیں اور ان کو لکھ بھیجیں کہ آپ کے ساتھ دعوت میں ان اصولوں کو ملحوظ رکھا جائے۔

۳- جن چیزوں میں الکوہل کی آمیزش ہو ان کا استعمال اس وقت تک نہ کرنا چاہیئے جب تک کوئی طبیب آپ کی جان بچانے کے لیے یا آپ کی صحت کو غیر معمولی نقصان سے بچانے کے لیے اس کا استعمال ناگزیر نہ بتائے۔

۴- آپ خود جن لوگوں کو مدعو کریں ان کو ہرگز شراب نہ پلائیں۔ دعوت دینے سے پہلے آپ کو انہیں آگاہ کر دینا چاہیئے کہ آپ دعوت میں اپنے اصول کے خلاف کسی کو شراب نہیں پیش کر سکتے۔ اس شرط پر جو لوگ آپ کی دعوت قبول کریں صرف انہی کو مدعو کیجیے۔ شراب کا بدل پیش کرنا ہو تو پاکستان یا ہندوستان سے شربت روح افزا یا ایسا ہی کوئی اور خوش رنگ و معطر مشروب منگوا لیجیے۔ امید ہے کہ وہ ان لوگوں کو بہت پسند آئے گا۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۴ عدد ۱۔ اپریل ۱۹۶۰ء)

پردہ اور اپنی پسند کی شادی

سوال: اسلامی پردے کی رُو سے جہاں ہمیں بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں وہاں دو ایسے نقصانات ہیں جن کا کوئی حل نظر نہیں آتا بجز اس کے کہ صبر و شکر کر کے بیٹھ جائیں۔

اوّل یہ کہ ایک تعلیم یافتہ آدمی جس کا ایک خاص ذوق ہے اور جو اپنے دوست منتخب کرنے میں ان سے ایک خاص اخلاق اور ذوق کی توقع رکھتا ہے، فطرتاً اس کا خواہشمند ہوتا ہے کہ شادی کے لئے ساتھی بھی اپنی مرضی سے منتخب کرے۔ لیکن اسلامی پردے کے ہوتے ہوتے کسی نوجوان لڑکے یا لڑکی کے لیے اس بات کی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ اپنی مرضی سے اپنا ساتھی چنے بلکہ اس کے لیے وہ قطعاً دوسروں یعنی ماں یا خالہ وغیرہ کے دستِ نگر ہوتے ہیں ہماری قوم کی تعلیمی حالت ایسی ہے کہ والدین عموماً اَن پڑھ اور اولاد تعلیم یافتہ ہوتی ہے اس لیے والدین سے یہ توقع رکھنا کہ موزوں رشتہ ڈھونڈھ لیں گے ایک عبث توقع ہے۔ اس صورت حال سے ایک ایسا شخص جو اپنے مسائل خود حل کرنے اور خود سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہو سخت مشکل میں پڑ جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایک لڑکی جو گھر سے باہر نہ نکلنے کی پابند ہو وہ کیونکہ ایسی وسعتِ نظر، فراست اور عقل عام کی مالک ہو سکتی ہے کہ بچوں کی بہترین تربیت کر سکے اور ان کی ذہنی صلاحیتوں کو پوری طرح سے بیدار کر دے، اس کو تو دنیا کے معاملات کا صحیح علم ہی نہیں ہو سکتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ اتنی ہی تعلیم بھی حاصل کرلے جتنی ایک بے پردہ لڑکی نے حاصل کی ہوتی ہے تو بھی اس کی ذہنی سطح کم ہو گی کیونکہ اسے اپنے علم کو عملی طور پر پرکھنے کا کوئی موقع ہی

حاصل نہیں۔ امید ہے آپ اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر ممنون فرمائیں گے۔

جواب: آپ نے اسلامی پردے کی جن خرابیوں کا ذکر کیا ہے اولاً تو وہ ایسی خرابیاں نہیں ہیں کہ اس کی بنا پر آدمی لاینحل مشکلات میں مبتلا ہو جائے اور ثانیاً حیاتِ دنیوی میں آخر کونسی ایسی چیز ہے جس میں کوئی نہ کوئی خامی یا کمی نہ پائی جاتی ہو۔ لیکن کسی چیز کے مفید یا مضر ہونے کا فیصلہ اس کے صرف ایک یا دو پہلوؤں کو سامنے رکھ کر نہیں کیا جاتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ مجموعی طور پر اس میں مصالح کو غلبہ حاصل ہے یا مفاسد کو۔ یہی اصول پردے کے بارے میں اختیار کیا جائے گا۔ اسلامی پردہ آپ کی رائے میں بھی بے شمار فوائد کا حامل ہے۔ لیکن فقط یہ مشکل کہ اس کی پابندی سے آدمی کو شادی کے لیے اپنی مرضی کے مطابق لڑکی منتخب کرنے کی آزادی نہیں مل سکتی، پردے کی افادیت کو کم یا اس کی پابندی کو ترک کرنے کے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتی۔ بلکہ اگر ہر لڑکے کو لڑکی کے انتخاب اور ہر لڑکی کو لڑکے کے انتخاب کی کھلی چھٹی دے دی جائے تو اس سے اس قدر قبیح نتائج برآمد ہوں گے کہ ان کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا اور پھر خاندانی نظام جو کہ معاشرے کی مضبوطی اور پاکیزگی کا ضامن ہوتا ہے درہم برہم ہو کر رہ جائیگا۔ اور ایک موہومہ مشکل کو حل کرتے کرتے بے شمار حقیقی مشکلات کے دروازے کھل جائیں گے۔

آپ کا یہ خیال کہ با پردہ لڑکی وسعتِ نظر اور فراست سے بے بہرہ ہوتی ہے درست نہیں۔

تو اس میں پردے کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ایک لڑکی باپردہ رہ کر بھی علم و فن میں کمال پیدا کر سکتی ہے اور اس کے مقابلے میں پردے سے باہر ہو کر بھی ایک لڑکی علم و عقل اور فراست و بصیرت سے کوری رہ سکتی ہے۔ البتہ بے پردہ لڑکی کو یہ فوقیت ضرور ہوگی کہ وہ معلومات کے لحاظ سے چاہے وسیع النظر نہ ہو لیکن تعلقات کے لحاظ سے ان کی نگاہیں ضرور پھیل جائیں گی۔ ایسی حالت میں اگر موزوں ترین رفیقِ حیات کی تلاش میں ... ابی ہو بھی جاتے، تب بھی جو نگاہیں وسعت کی عادی ہو چکی ہوں انہیں سمیٹ کر ایک مرکز تک محدود رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔

کیا اسلام دینِ فطرت ہے؟

(۲) آپ کا جواب ملا۔ مگر مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ آپ نے اُسے بالکل معمولی مسئلہ قرار دیا۔ کامیاب شادی کی تمنّا تو ایک جائز خواہش ہے اور ایسے حالات پیدا کرنا، جن کی وجہ سے ایک شخص کے لیے اپنی پسند کی لڑکی چننے کا راستہ بند ہو جاتے ہیں انسانی مسرّت اور شخصیت کے ارتقاء کے لیے مضر سمجھتا ہوں اور دینِ فطرت کے منافی۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ہمارے مروجہ طریقے کے مطابق عورت زیادہ سے زیادہ گھر کی منتظم ہوتی ہے اور خاوند کی اور اپنی جنسی تسکین کا ایک ذریعہ، لیکن دو افراد کے لئے اپنے آپ کو پوری طرح ایک دوسرے

کے حوالے کرنے اور زندگی کے فرائض ایک بار کی بجائے خوشی خوشی پورا کرنے کے جو امکانات اپنی پسند اور ذوق کی شادی کر لینے میں ہوتے ہیں وہ اس صورت میں قطعاً ممکن نہیں کہ اپنی پسند اور بصیرت استعمال کئے بغیر کسی دوسرے کے انتخاب پر شادی کر لی جائے۔

میرا خیال ہے کہ ایک نوجوان محض جنسی تسکین کا خواہشمند نہیں ہوتا، وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ کسی کے لیے کچھ قربانی کرے، کسی سے محبت کرے، کسی کی خوشی کا خیال رکھے اور کوئی اس کی خوشی پر خوش ہو۔ اس جذبے کے فطری نکاس کا راستہ تو یہ ہے کہ وہ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرے جسے اس نے تعلیم، اطوار، کردار اور دوسری خوبیوں کی بنا پر اپنی طبیعت کے مطابق حاصل کیا جا ہے (حقیقی محبت کسی کی باطنی خوبیوں کے دیکھنے سے ہی پیدا ہوتی ہے نہ کہ شکل دیکھ لینے سے) اور یہ بات ناممکنات میں سے ہے کہ پہلے تو کسی کی شادی کرا دی جائے اور پھر اس سے مطالبہ کیا جائے کہ اب اسے ہی چاہو اور یوں جیسے تم نے اس کو خود پسند کیا ہے۔ اس فطری محبت کا راستہ بند کر لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ جذبہ اپنے لیے دوسرے راستے نکال لیتا ہے۔

پردے کی وجہ سے جو حالات پیدا ہیں ان میں حقیقتاً کردار دیکھ کر بر تلاش کرنا ممکن نہیں۔ لڑکے کے باپ کے لیے ممکن نہیں کہ وہ لڑکی کا پتہ چلا سکے، لڑکی کی والدہ کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ لڑکے کے متعلق براہِ راست کچھ اندازہ لگا سکے۔ کیونکہ پردے کی وجہ سے ان افراد

میں بھی تعلق اور آزادانہ گفتگو ناممکن ہے۔ (خود لڑکے اور لڑکی کا ملنا تو ایک طرف رہا) بڑی سے بڑی آزادی جو اسلام نے دی ہے وہ یہ ہے کہ لڑکا لڑکی کی شکل دیکھ لے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی کی شکل چند سیکنڈ دیکھ لینے سے کیا ہو جاتا ہے۔

اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے، اب تو تمام علماء نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ موجودہ تمدنی ضروریات پوری کرنے کے لیے علم کا حاصل کرنا عورتوں کے لیے ضروری ہے۔ لیکن مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی کام کر سکتی ہیں۔ یا تو اسلامی احکام کی پابندی کریں یا علم حاصل کریں۔ پردے کی پابند ہوتے ہوئے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ طبقات الارض، آثار قدیمہ، انجنیئرنگ اور تمام ایسے علوم جن میں سروے اور دور دراز سفر کی ضرورت ہوتی ہے، ان علوم کے لیے خواتین کس طرح کام کر سکتی ہیں جب کہ محرم کے بغیر عورت کا تین دن سے زائد کی مسافت پر نکلنا بھی منع ہے۔ اب کیا ہر جگہ وہ اپنے ساتھ محرم کو لیے لیے پھرے گی؟

یہ علوم تو ایک طرف رہے، میں تو ڈاکٹری اور پردے کو بھی ایک دوسرے کی ضد سمجھتا ہوں۔ اول تو ڈاکٹری کی تعلیم ہی جو جسمانیات کی نگاہیں پھیلا دینے والے معلومات سے پُر ہوتی ہے، حیا کے اس احساس کو ختم کر دینے کے لیے کافی ہے جس کی مشرقی عورتوں سے توقع کی جاتی ہے، خواہ وہ ڈاکٹری پردے ہی میں سیکھی جاتے اور

پڑھانے والی تمام خواتین ہی کیوں نہ ہوں۔ دوم ڈاکٹر بننے پر ایک خاتون کو مریضوں کے لواحقین سے روابط کی اس قدر ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے لیے غیر مردوں سے بات چیت پر قدغن لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب اس کے پیش نظر اگر ہم خواتین کو ڈاکٹر بننے سے روکتے ہیں تو پھر ہمیں اپنے گھروں کی مریض خواتین کے ہر مرض کے علاج کے لیے مرد ڈاکٹروں کی خدمات کی ضرورت پڑے گی اور رائج الوقت نظریۂ حیا کے مطابق یہ تو اس سے بھی زیادہ معیوب سمجھا جاتے گا۔

جناب عالی آپ مجھے یہ بتائیں کہ ان معاشرتی اور تمدنی الجھنوں کا اسلامی احکامات کی پابندی کرتے ہوتے کیا حل ہے؟

جواب:۔ آپ کا دوسرا خط ملا۔ شادی کے معاملے میں آپ نے جو الجھن بیان کی ہے وہ اپنی جگہ درست ہی سہی، اس کا حل کورٹ شپ کے سوا اور کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ جس تفصیل کے ساتھ رفیقِ زندگی بنانے سے پہلے لڑکی اور لڑکے کو ایک دوسرے کے اوصاف، مزاج، عادات، خصائل اور ذوق و ذہن سے واقف ہونے کی ضرورت آپ محسوس کرتے ہیں، ایسی تفصیلی واقفیت دو چار ملاقاتوں میں، اور وہ بھی رشتہ داروں کی موجودگی میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے مہینوں ایک دوسرے کے ساتھ ملنا، تنہائی میں بات چیت کرنا، سیر تفریح، سفر میں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا اور بے تکلف دوستی کی حد تک تعلقات پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ کیا واقعی آپ یہی چاہتے ہیں کہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان اس اختلاط کے مواقع بہم پہنچنے چاہییں۔ آپ کے خیال میں ان جوان لڑکوں اور

لڑکیوں کے اندر اُن معصوم فلسفیوں کا فی صدی تناسب کیا ہوگا جو بڑی سنجیدگی کے ساتھ صرف رفیق زندگی کی تلاش میں یہ مخلصانہ تحقیقاتی روابط قائم کریں گے۔ اور اس دوران میں شادی ہونے تک اس طبعی جذب وانجذاب کو قابو میں رکھیں گے جو خصوصیت کے ساتھ نوجوانی کی حالت میں عورت اور مرد ایک دوسرے کے لیے اپنے اندر رکھتے ہیں؟ بحث برائے بحث اگر آپ نہ کرنا چاہتے ہوں تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ شاید دو تین فی صدی سے زیادہ ایسے لوگوں کا اوسط ہماری آبادی میں نہ نکلے گا۔ باقی اس امتحانی دور ہی میں فطرت کے تقاضے پورے کر چکے ہوں گے اور وہ دو تین فیصدی جو اس سے بچ نکلیں گے، وہ بھی اس شبہ سے نہ بچ سکیں گے کہ شاید وہ باہم ملوث ہو چکے ہوں۔

پھر کیا یہ ضروری ہے کہ ہر لڑکا اور لڑکی جو اس تلاش وتحقیق کے لیے باہم خلا ملا کریں گے وہ لازماً ایک دوسرے کو رفاقت کے لیے منتخب ہی کر لیں گے؟ ہوسکتا ہے کہ ۲۰ فیصدی دوستیوں کا نتیجہ نکاح کی صورت میں برآمد ہو۔ ۸۰ فیصدی یا کم از کم ۵۰ فیصدی کو دوسرے یا تیسرے تجربے کی ضرورت لاحق ہوگی۔ اس صورت میں اِن "تعلقات" کی کیا پوزیشن ہوگی جو دوران تجربہ میں آئندہ نکاح کی امید پر پیدا ہو گئے تھے اور ان شبہات کے کیا اثرات ہوں گے جو تعلقات نہ ہونے کے باوجود ان کے متعلق معاشرے میں پیدا ہو جائیں گے؟

پھر آپ یہ بھی مانیں گے کہ لڑکے اور لڑکیوں کے لیے ان مواقع کے دروازے کھولنے کے بعد انتخاب کا میدان لامحالہ بہت وسیع ہو جائے گا۔ ایک ایک لڑکے کے لیے صرف ایک ہی ایک لڑکی مطمح نظر نہ ہوگی جس پر وہ

اپنی نگاہ انتخاب مرکوز کر کے تحقیق و امتحان کے مراحل طے کرے گا اور علیٰ ہذا القیاس لڑکیوں میں سے بھی ہر ایک کے لیے ایک ہی ایک لڑکا امکانی شوہر کی حیثیت سے زیر امتحان نہ ہوگا۔ بلکہ شادی کی منڈی میں ہر طرف ایک سے ایک جاذب نظر مال موجود ہوگا جو امتحانی مراحل سے گزرتے ہوئے ہر لڑکے اور ہر لڑکی کے سامنے بہتر انتخاب کے امکانات پیش کرتا رہے گا۔ اس وجہ سے اس امر کے امکانات روز بروز کم ہوتے جائیں گے کہ ابتداءً جو دو فرد ایک دوسرے سے آزمائشی ملاقاتیں شروع کریں وہ آخر وقت تک اپنی اس آزمائش کو نباہیں اور بالآخر ان کی آزمائش شادی پر منتج ہو۔

اس کے علاوہ یہ ایک فطری امر ہے کہ شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ جو رومانی طرز کا کورٹ شپ کرتے ہیں ان میں دونوں ایک دوسرے کو اپنی زندگی کے روشن پہلو ہی دکھاتے ہیں۔ مہینوں کی ملاقاتوں اور گہری دوستی کے باوجود ان کے کمزور پہلو ایک دوسرے کے سامنے پوری طرح نہیں آتے۔ اس دوران میں شہوانی کشش اتنی بڑھ چکی ہوتی ہے کہ وہ جلدی سے شادی کر لینا چاہتے ہیں، اور اس غرض کے لیے دونوں ایک دوسرے سے ایسے ایسے پیمانِ وفا باندھتے ہیں، اتنی محبت اور گرویدگی کا اظہار کرتے ہیں کہ شادی کے بعد معاملات کی زندگی عاشق و معشوق کے اس پارٹ کو زیادہ دیر تک کسی طرح نہیں نباہ سکتے، یہاں تک کہ جلدی ہی ایک دوسرے سے مایوس ہو کر طلاق کی نوبت آجاتی ہے۔ کیونکہ دونوں ان توقعات کو پورا نہیں کر سکتے جو عشق و محبت کے دور میں انہوں نے باہم قائم کی تھیں اور دونوں کے

سامنے ایک دوسرے کے وہ کمزور پہلو آجاتے ہیں جو معاملات کی زندگی ہی میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ عشق و محبت کے دور میں کبھی نہیں کھلتے۔

اب آپ ان پہلوؤں پر بھی غور کر کے دیکھ لیں۔ پھر آپ مسلمانوں کے موجودہ طریقے کی مزعومہ قباحتوں اور اس کورٹ شپ کے طریقے کی قباحتوں کے درمیان موازنہ کر کے خود فیصلہ کریں کہ آپ کو ان دونوں میں سے کونسی قباحتیں زیادہ قابل قبول نظر آتی ہیں۔ اگر اس کے بعد بھی آپ کورٹ شپ ہی کو زیادہ قابل قبول سمجھتے ہیں تو مجھ سے بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو خود یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ اس اسلام کے ساتھ آپ اپنا تعلق رکھنا چاہتے ہیں یا نہیں جو اس راستے پر جانے کی اجازت دینے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہے۔ یہ کام آپ کو کرنا ہو تو کوئی دوسرا معاشرہ تلاش کریں۔ اسلام سے سرسری واقفیت بھی آپ کو یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ اس دین کی حدود میں "کامیاب شادی" کا وہ نسخہ استعمال کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے جسے آپ مباح کرنا چاہتے ہیں

عورتوں کی تعلیم کے متعلق آپ نے جن مشکلات کا ذکر کیا ہے ان کے بارے میں بھی کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے آپ اس بات کو سمجھ لیں کہ فطرت نے عورت اور مرد کے دائرہ کار الگ رکھے ہیں۔ اپنے دائرہ کار کے فرائض انجام دینے کے لیے عورت کو جس بہتر سے بہتر تعلیم کی ضرورت ہے وہ اسے ضرور ملنی چاہیئے اور اسلامی حدود میں وہ پوری طرح دی جا سکتی ہے۔ اسی طرح عورت کے لیے ایسی علمی و ذہنی ترقی بھی ان حدود کے اندر رہتے ہوتے ممکن ہے جو عورت کو اپنے دائرہ کار کے فرائض انجام دیتے

ہوتے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس معاملہ میں کوئی انتظامات نہ کرنا مسلمانوں کی کوتاہی ہے نہ کہ اسلام کی۔ لیکن وہ تعلیم جو مرد کے دائرہ کار کے لیے عورت کو تیار کرے عورت ہی کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے تباہ کن ہے اور اس کی کوئی گنجائش اسلام میں نہیں ہے۔ اس مسئلے پر تفصیلی بحث کے لیے آپ میری کتاب "پردہ" کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۵۔ عدد ۴۔ جنوری ۱۹۶۱ء)

ڈاڑھی پر مسلمانوں کے اعتراضات

سوال: ڈاڑھی کے بارے میں اکثر مسلمانوں کے سوچنے کا انداز یہ ہے کہ ڈاڑھی صرف علما۔ اور مولانا حضرات کو زیب دیتی ہے۔ نبی اکرمؐ کے زمانے میں عام طور پر ڈاڑھی رکھی جاتی تھی اس لیے اکثریت ڈاڑھی رکھنے میں عار نہ سمجھتی تھی۔ مگر اب انسان کے لباس و آرائشگی میں کافی فرق واقع ہو چکا ہے۔ چہرے بغیر ڈاڑھی کے پُر رونق و بارعب نظر آتے ہیں۔ کیا ایسے حالات میں ہر مسلمان کے لیے ڈاڑھی رکھنا لازم ہے؟ براہِ کرم اس معاملے میں ذہن کو یکسو اور مطمئن فرمائیں۔

جواب: ڈاڑھی رکھنا نہ صرف یہ کہ فعلی سنت ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے رکھنے کا حکم دیا ہے اور منڈانے سے منع کیا ہے۔ اس لیے یہ

سمجھنا کہ ڈاڑھی رکھنا صرف علما۔ اور مولانا حضرات کا کام ہے اور عام مسلمان مختار ہیں کہ چاہیں رکھیں یا نہ رکھیں، بالکل غیر اسلامی اور غلط طرزِ فکر ہے۔ خصوصاً اگر آدمی ڈاڑھی مونڈنے کو پسند اور رکھنے کو ناپسند کرتا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کے اندر اسلامی ذوق کے بجائے کافرانہ ذوق پرورش پا رہا ہے

یہ بڑی عجیب اور افسوسناک بات ہے کہ جس طرح مسلمانوں کو ان کے ہادی و رہبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈاڑھی رکھنے کا حکم دیا ہے اسی طرح سکھوں کو بھی ان کے پیشوا نے اس کا حکم دیا تھا، ہمارے ملک میں انگریزی حکومت کے تحت دونوں رہے اور مغربی تعلیم دونوں نے پائی، لیکن سکھوں نے اپنے پیشوا کے حکم کی وہ بے احترامی نہیں کی جو مسلمانوں نے کی۔ درحقیقت یہ ایک بدترین حالت ہے جس پر مسلمانوں کو شرم آنی چاہیئے، کجا کہ وہ بلا تکلف ان خیالات کا اظہار کریں کہ ڈاڑھی کے بغیر چہرے بارونق ہوتے ہیں اور ڈاڑھی رکھنے سے بے رونق ہو جاتے ہیں۔ آج فرنگیت زدہ مسلمان محض ڈاڑھی مونڈنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ڈاڑھی کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس کے رکھنے والوں کی تذلیل و تضحیک کرتے ہیں۔ درسگاہوں میں ہر ممکن طریقے سے ان کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ سرکاری ملازمتوں میں انہوں نے بجائے خود ڈاڑھی کو نااہلی کا سرٹیفکیٹ قرار دے رکھا ہے اور بعض ملازمتوں میں تو اس کے رکھنے پر پابندیاں تک عائد ہیں۔ ان لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ ڈاڑھی رکھنے سے آدمی چست اور جامہ زیب (Smart) نہیں رہتا۔ یہ سب کچھ ایک مسلم سوسائٹی اور مسلم ریاست میں ہو رہا ہے۔ لیکن سکھوں نے انگریزی حکومت

کے زمانے میں اپنا یہ حق تسلیم کرا کے چھوڑا کہ وہ ڈاڑھی رکھ کر ہر شعبۂ حیات میں داخل ہو سکتے ہیں اور بڑے سے بڑے مناصب پر پہنچ سکتے ہیں۔ فوج ایرفورس اور سول کے کس شعبے میں وہ نہیں پہنچے اور کونسا بڑے سے بڑا عہدہ رہ گیا جو محض ڈاڑھی رکھنے کی وجہ سے ان کو نہ ملا ہو۔ کس میں یہ جرأت تھی کہ ان کو نا اہل قرار دے سکے، یا ان پر (Smart) نہ ہونے کا فیصلہ صادر کر سکے، یا ان کو یہ حکم دے سکے کہ پہلے ڈاڑھی منڈواؤ پھر تمہیں فلاں منصب پر ترقی مل سکے گی۔ آج ہمارے کالے صاحب لوگوں میں سے نہ معلوم کتنے ایسے ہوں گے جنہوں نے انگریزی دور میں کسی نہ کسی سکھ افسر کی ماتحتی کی ہوگی اور کبھی ان کو اس بات پر شرم نہ آئی کہ وہ ایک ڈاڑھی والے کی ماتحتی کر رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی شخص کبھی یہ ہمت نہ کر سکا کہ سکھوں کی ڈاڑھی کا مذاق اڑانا تو درکنار، اس پر اعتراض تک کر سکے۔ یہ سب کچھ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت تھا کہ سکھ مسلمانوں سے زیادہ کیرکٹر رکھتے ہیں، ان سے زیادہ اپنے شعائر کا احترام کرتے ہیں، ان سے زیادہ اپنے پیشوائے دین کی اطاعت کرتے ہیں، اور ان سے کم ذہنی غلامی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کیا اس صریح علامت کم تری پر مسلمانوں کو کبھی شرم نہ آئے گی؟

(ترجمان القرآن جلد ۵۸، عدد ۱۔ اپریل ۱۹۶۲ء)

ڈاڑھی اور فوجی ملازمت

سوال: میں نے ایئرفورس میں پائلٹ کے لیے امتحان دیا تھا۔ میڈیکل ٹسٹ اور انٹرویو کے بعد بحمد اللہ امتحان اور کھیلوں میں بھی کامیاب ہوا۔ مگر بغیر وجہ بتاتے ہوئے مجھے مسترد کر دیا گیا۔ اب کئی لوگوں نے مجھے بتایا کہ تم صرف ڈاڑھی نہ منڈوانے کی وجہ سے رہ گئے تھے مگر مجھے یقین نہ آیا۔

اب دسمبر میں میں نے پی، ایم، اے کے لیے امتحان دیا پہلے انٹرویو میں کمیٹی کے ایک بریگیڈیر صاحب نے مجھے بتایا کہ تم پہلی دفعہ کوہاٹ میں صرف ڈاڑھی کی وجہ سے رہ گئے تھے۔ اور یہ بھی کہا کہ پاکستانی فوج کے افسر ڈاڑھی والے کیڈٹ کو پسند نہیں کرتے اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایسا کوئی آدمی نہ لیا جائے۔ ہاں بعد میں اجازت لے کر ڈاڑھی رکھی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد میں نے تحریری امتحان دیا اور اس میں کامیاب ہوا۔ اب اس کے بعد میڈیکل ہوگا اور اس کے بعد کوہاٹ جانا پڑے گا۔ اس وجہ سے میرے پانچ بھائی اور اب والد صاحب پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ ڈاڑھی کو صاف کراؤ۔ مگر میں عزت، عہدے اور روپے کے لیے ایسا کام کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ میں اپنی حالت میں رہ

کہ یا تجارت کروں گا اور یا مزید تعلیم حاصل کر کے اسلام کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ ان ملازمتوں سے میرے مذہبی احساسات مجروح ہوں گے۔ میں زیادہ دیر تک صبر نہیں کر سکتا۔ مگر قبل اس کے کہ آخری فیصلہ کروں، میں آپ سے مشورہ لینا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ کتاب وسنت کی روشنی میں میری رہنمائی کریں۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا۔

جواب :- آپ نے جو حالات لکھے ہیں انہیں پڑھ کر انتہائی افسوس ہوا۔ پاکستان کی فوج اور فضائیہ میں آج بھی بکثرت ایسے لوگ موجود ہیں جو تقسیم سے قبل متحدہ ہندوستان کی فوج یا فضائیہ میں سکھوں کے ساتھ، بلکہ بعض تو ان کے ماتحت کام کر چکے ہیں۔ ان کو خوب معلوم ہے کہ رعب، خوبصورتی، چستی اور دوسرے جن جن پر فریب الفاظ کو استعمال کر کے آج یہ لوگ ڈاڑھی کو فوج اور فضائیہ میں حرام کیے ہوتے ہیں، ان میں سے کوئی حیلہ اور بہانہ نہ تو سکھوں سے ڈاڑھی منڈوا سکا اور نہ کسی بڑے سے بڑے عہدے تک ان کے پہنچنے میں مانع ہو سکا۔ آج بھی متحدہ ہندوستان کی فوج اور بحریہ اور فضائیہ میں سکھ بڑے سے بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور کسی کی یہ جرأت نہیں ہے کہ ان سے یہ کہہ سکے کہ تمہیں ملازمت کرنی ہے تو ڈاڑھی منڈوا کر آؤ، یا اگر تم ڈاڑھی رکھو گے تو تمہیں ملازمت میں نہ لیا جائے گا۔ ابھی تھوڑی ہی مدت پہلے ہمارے ہاں کی ایک فوجی تقریب میں حصہ لینے کے لیے ہندوستان سے ایک سکھ لیفٹیننٹ جنرل آیا تھا جس کے چہرے پر بالشت بھر کی

ڈاڑھی لٹک رہی تھی اور اس کی تصویر ہمارے ملک کے اخبارات میں شائع ہوتی تھی۔ افسوس کہ اس کو دیکھ کر بھی ہمارے کالے صاحب بہادروں کو شرم نہ آئی اور انھوں نے نہ سوچا کہ ڈاڑھی سے آدمی فوجی ملازمت کا اہل نہیں ہوتا تو یہ سکھ کیسے لیفٹیننٹ جنرل ہوگیا۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے مسلمان افسر صاحبان ڈاڑھی والوں کو ملازمت میں نہ لینے، یا ڈاڑھی منڈوانے کو ملازمت کے لیے شرط قرار دینے کے لیے جتنے بہانے بناتے ہیں وہ سب بالکل لغو اور بیہودہ ہیں۔ اصل بات یہ نہیں ہے کہ ڈاڑھی رکھنے سے فوجی ملازمت کے لیے آدمی کی اہلیت یا موزونیت میں کوئی فرق آجاتا ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ انگریز کی بندگی نے ان لوگوں کو سکھوں کی بہ نسبت بہت زیادہ گھٹیا درجے کی غلامانہ ذہنیت میں مبتلا کر دیا ہے۔ سکھوں نے بھی وہی مغربی تعلیم پائی ہے جو انھوں نے پائی ہے اور اسی انگریز کی وہ بھی نوکریاں کرتے رہے ہیں جس کی یہ کرتے رہے ہیں۔ کسی میدان میں وہ ان سے پیچھے نہیں رہے۔ لیکن وہ آج تک بھی مغرب زدگی کی اس ذلیل انتہا کو نہیں پہنچے کہ گورونانک اور گوروگوبند سنگھ اور اپنے مذہب کے دوسرے اکابر کی پیروی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں اور اسے نالائقی کا نشان سمجھیں۔ یہ شرف صرف ہمارے فرنگیت زدہ حضرات ہی کو نصیب ہوا کہ انھوں نے جب انگریز کی بندگی اختیار کی تو اپنا سب کچھ لاکر خداوندِ انگریز کے قدموں میں ڈال دیا۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ یہ لوگ انگریز کی نوکری حاصل کرنے کے لیے بخوشی ڈاڑھیاں مونڈنے پر راضی ہو گئے، بلکہ رفتہ رفتہ یہ اتنے

بگڑے کہ انہوں نے خود ڈاڑھی کو نالائقی کا نشان تسلیم کر لیا۔ حالانکہ ڈاڑھی جس طرح سکھوں کے اکابر مذہب کی سنت تھی اسی طرح وہ مسلمانوں کے اکابرِ دین کی سنت بھی تھی، اور جس طرح سکھوں کو ان کے پیشوائے دین نے اس کے رکھنے کا حکم دیا تھا اسی طرح مسلمانوں کو بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے رکھنے کی تاکید اور مونڈنے کی ممانعت فرمائی تھی۔ اس صورتِ حال کو جب میں دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی شدت کے ساتھ یہ احساس ہوتا ہے کہ مسلمان خود اپنے ہی ہم سر اور ہم عصر غیر مسلموں کی بہ نسبت سیرت و کردار کے اعتبار سے کتنے فروتر ثابت ہوتے ہیں۔

میرا مشورہ نہ صرف آپ کو، بلکہ تمام ان نوجوانوں کو جن کے اندر دینی غیرت و حمیت موجود ہے، یہ ہے کہ وہ ان حالات میں پست ہمت نہ ہوں اور کوئی کمزوری نہ دکھائیں۔ ان کو چاہیئے کہ ہر مقابلے کے امتحان میں شریک ہو کر اپنی قابلیت و اہلیت ثابت کر دیں اور اس کے بعد جب صرف ڈاڑھی کے سبب سے ان کو ملازمت میں لینے سے انکار کیا جائے تو ملازمت سے محرومی کو قبول کر لیں اور ڈاڑھی ہرگز نہ مونڈیں۔ اس طرح اگر غیرت مند مسلمان نوجوان پے در پے عمل کرتے رہیں گے تو انشاء اللہ یہ بات بالکل ثابت ہو جائے گی کہ ڈاڑھی رکھنے والے نااہل نہیں ہیں بلکہ ان پر ملازمتوں کے دروازے بند کرنے والے نام نہاد روشن خیال افسر انتہائی تنگ نظر "ملّا" ہیں اور وہ اپنی اسی تنگ نظری کے باعث اپنے ملک کی ملازمتوں کو مضبوط سیرت و کردار رکھنے والے نوجوانوں سے محروم کر رہے ہیں۔ ہماری حکومت اگر یہی پسند

کرتی ہے کہ صرف پیٹ پر ضمیر و ایمان کی قربانی دینے والے ہی ملازمتوں میں رہ جائیں اور تمام ایماندار و بلند کردار لوگوں پر ملازمتوں کے دروازے بند رہیں تو وہ جب تک چاہے اپنی اس تباہ کن پالیسی پر چلتی رہے۔ آخر کار اس کو معلوم ہو جائے گا کہ اس نے اس حماقت سے اپنا اور ملک کا کس قدر نقصان کیا ہے۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۹، عدد ۶۔ مارچ ۱۹۶۳ء)

چند جدید ملحدانہ نظریات کا علمی جائزہ

سوال :۔ میرے ایک عزیز جو ایک اونچے سرکاری منصب پر فائز ہیں، کسی زمانے میں پکے دیندار اور پابند صوم و صلوٰۃ ہوا کرتے تھے لیکن اب کچھ کتابیں پڑھ کر لامذہب ہو گئے ہیں۔ ان کے نظریات یکسر بدل چکے ہیں۔ ان نظریات کی تبلیغ سے بھی وہ باز نہیں آتے میں ان کے مقابل میں اسلامی احکام و تعلیمات کی مدافعت کی پوری کوشش کر رہا ہوں لیکن اپنی کم علمی کی وجہ سے ان کا مدلّل جواب دینا میرے بس میں نہیں ہے۔ اس لیے آپ سے گذارش ہے کہ میری مدد فرمائیں۔ ان کے موٹے موٹے نظریات درج ذیل ہیں

۱۔ خدا کو وہ قادر مطلق اور اس جہان کا پیدا کرنے والا تو مانتے ہیں مگر ان کے نزدیک جہان کو خدا نے بنا کر چھوڑ دیا ہے اور اب

یہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے آپ سے آپ (Automatic) ہو رہا ہے۔

۲۔ رسولؐ کو وہ ایک مصلح (ریفارمر) سے زیادہ درجہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ البتہ انہیں وہ نیک اور غیر معمولی قابلیت کا انسان بھی سمجھتے ہیں۔

۳۔ قرآن شریف کو وہ (معاذ اللہ) رسولِ خداؐ کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ ان کی بہت سی باتوں کو اس وجہ سے ناقابل عمل سمجھتے ہیں کہ وہ صرف اس وقت کے لیے تھیں، جب قرآن نازل ہوا۔

۴۔ عبادات، نماز، روزہ وغیرہ کو صرف برائی سے بچنے کا بہترین ذریعہ اور معاشرے کو صحیح ڈگر پر چلانے کا آلہ سمجھتے ہیں۔

۵۔ نظریۂ شیطان ان کے خیال میں خدا کے واسطے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ خدا تو نیکی کی توفیق دیتا ہے اور شیطان برائی کی طرف کھینچتا ہے۔ اور بظاہر تو عام طور پر شیطان کی جیت ہوتی ہے۔

۶۔ چار شادیوں، غلام رکھنے اور قربانی کو لغو قرار دیتے ہیں۔

اُمید ہے کہ آپ کچھ وقت نکال کر ان باتوں کا مختصر جواب دیں گے اور ان کتابوں کے نام جہاں سے میں ان کی تسلّی کر سکوں درج فرما کر ممنون کریں گے۔

جواب: مجھے آپ کے عزیز عہدے دار کے خیالات معلوم کر کے بڑا افسوس ہوا

اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے، اور آپ کو ان کے اثر سے محفوظ رکھے۔ اگر آپ نے میری کتابوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو آپ ان کی سب باتوں کا جواب بڑی اچھی طرح دے سکتے تھے۔ اب بھی میں آپ کو مطالعہ کر کے تیار رہنے کا مشورہ دوں گا۔ کیونکہ خط و کتابت میں اتنے بڑے بڑے مسائل کو سمجھانا بڑا مشکل ہے۔

مختصراً میں ان باتوں کا جواب دیتا ہوں جو آپ نے پوچھی ہیں۔

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جس شخص کی قوتِ فکر ماؤف نہ ہو وہ کبھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ کوئی قانون اور نظم (Law & Order) کسی نافذ کرنے والے اقتدار (Authority) کے بغیر بھی نافذ ہو سکتا ہے اور جاری رہ سکتا ہے۔ کائنات میں قانون اور نظم موجود ہے۔ اس کا انکار تو کسی طرح کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اب کیا عقل یہ باور کر سکتی ہے۔ کہ اتنے بڑے لامحدود پیمانے پر لامحدود مدت تک یہ قانون اور نظم کسی اقتدار کے بغیر ہی چل رہا ہے کوئی غیر متعصب عقل تو اسے باور نہیں کر سکتی۔ مگر دو باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے اچھے خاصے ہوشمند انسان اس نادانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کی فکر و نظر کا ظرف بہت تنگ ہے جس کے باعث وہ اس عظیم الشان اقتدار کا تصور کرنے سے عاجز رہ گئے ہیں جو اتنی بڑی کائنات میں نظم اور قانون کو ازل سے ابد تک چلا رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اس کو ماننا چاہتے ہی نہیں ہیں۔ کیونکہ اس کو مان لینے کے بعد ان کے لیے دنیا میں من مانی کرنے کی آزادی باقی نہیں رہتی۔

یہ تو خدا کے متعلق ان کے تصور کی غلطی ہے۔ لیکن جو حضرات اس طرح کی باتیں کرتے ہیں ان سے عرض کیجئے کہ اتنے بڑے بڑے مسائل پر سوچنے اور اظہار رائے کرنے والے آدمیوں کو کم از کم ایماندار (HONEST) تو ہونا چاہیے۔ آپ لوگ تو اس صفت سے بھی خالی ہیں۔ آپ خدا اور رسول اور قرآن کے متعلق جو باتیں کرتے ہیں وہ اسلام کے بالکل خلاف ہیں، مگر اس کے باوجود آپ مسلمان بنے پھرتے ہیں اور مسلم معاشرے کو دھوکا دینے میں آپ کوئی تامل نہیں کرتے۔ اگر آپ ایماندار ہوتے تو جس وقت آپ نے یہ آراء قائم کی تھیں اسی وقت اسلام سے اپنی علیحدگی کا اعلان کر دیتے اور اپنے نام بھی تبدیل کر لیتے تاکہ مسلم معاشرہ آپ سے دھوکہ کھا کر آپ کے ساتھ وہ معاملات جاری نہ رکھتا جو وہ کسی غیر مسلم کے ساتھ رکھنا پسند نہیں کرتا۔ اس صریح جعل سازی اور فریب کے بعد آپ کی کسی رائے کو وہ وقعت دینا جو صرف ایماندار اور مخلص آدمیوں کی آراء ہی کو دی جاسکتی ہے، ہمارے لیے سخت مشکل ہے۔

۲۔ رسولؐ کے بارے میں ان کے خیالات متضاد ہیں۔ ایک طرف وہ رسولؐ کو نیک آدمی بھی کہتے ہیں، جس سے لازم آتا ہے کہ وہ اس کو سچا آدمی بھی مانیں (الا یہ کہ ان کے نزدیک کوئی جھوٹا آدمی بھی نیک ہو سکتا ہو) اور دوسری طرف وہ رسولؐ کے اس دعوے کو جھوٹ بھی قرار دیتے ہیں کہ وہ محض ریفارمر نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ ایک صحیح العقل آدمی ان دونوں باتوں کو جمع نہیں کر سکتا۔ اس سے معلوم ہونا چاہیئے کہ محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئیس ۲۳ سال تک اپنی زندگی کا ہر لمحہ اپنے مخالفین کے مقابلہ میں ایک ایسی جدوجہد (Struggle) کرتے ہوئے گذارا ہے جس کی بنیاد ہی یہ تھی کہ آپؐ اپنی رسالت کے مدعی تھے اور آپ کے مخالفین اسی بات کو نہ ماننا چاہتے تھے۔ اب ایک شخص کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دو ہی رویے اختیار کرنا معقول ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ اگر وہ ان کو سچا آدمی سمجھتا ہے تو ان کو رسولؐ مانے۔ دوسرے یہ کہ وہ اگر ان کو رسولؐ نہیں مانتا تو معاذ اللہ انہیں بدترین جھوٹ اور فریب کا مرتکب خیال کرے۔ ان دونوں باتوں کے درمیان ایک تیسری راہ اختیار کرنا اور یہ کہنا کہ وہ سچے آدمی بھی تھے اور رسول بھی نہ تھے، سراسر غیر معقول بات ہے۔

اس کے جواب میں ایسے لوگوں کی جانب سے زیادہ سے زیادہ دو باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اصلاح کی خاطر رسالت کا دعویٰ کر دیا تاکہ وہ خدا کے نام سے وہ احکام تسلیم کرا سکیں جو وہ اپنے نام سے پیش کر کے نہ منوا سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے اس دعوے میں مخلص تو تھے مگر حقیقت میں رسولؐ نہ تھے۔ بلکہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ رسول ہیں۔

ان میں سے پہلی بات جو شخص کہتا ہے وہ میرے نزدیک اخلاقی حیثیت سے بڑا خطرناک آدمی ہے جس سے ہر شریف انسان کو ہوشیار رہنا چاہیے اس لیے کہ اگر ہم اس کے اس خیال کا تجزیہ کریں تو صریحاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کے نزدیک نیک مقصد کے لیے بُرا طریق کار اختیار کرنا نہ صرف یہ کہ جائز

ہے بلکہ قابل وقعت (Respectable) بھی ہے اسی وجہ سے وہ ایسے آدمی کو مصلح اور نیک آدمی سمجھتا ہے جس نے اس کے خیال میں محض اصلاح کرنے کے لیے (نعوذ باللہ) دعوائے رسالت جیسا عظیم الشان فریب گھڑ لیا تھا۔ اس طرح کے گھٹیا نظریات رکھنے والے آدمی سے کچھ بعید نہیں ہے کہ کل وہ کسی اچھے مقصد کے لیے (جس کو وہ اچھا سمجھتا ہو) کسی کے ہاں چوری کر ڈالے، یا کوئی جعلی دستاویز بنا لے، یا اور کسی گھناؤنے اخلاقی جرم کا مرتکب ہو جائے۔ کیونکہ جب اس کے نزدیک ایک فریبی اس بنا پر نیک اور مصلح ہو سکتا ہے کہ اس نے اصلاح کے لیے فریب کاری کی ہے، تو آخر وہ خود اچھے مقاصد کے لیے جرائم کرنے سے کب باز رہ سکتا ہے۔

دوسری بات جو شخص کہتا ہے وہ عقلی حیثیت سے اتنا ہی پست ہے جتنا اوپر والی بات کہنے والا اخلاقی حیثیت سے پست ہے۔ زیادہ سے زیادہ رعایت (Allowance) دیتے ہوتے ایسے شخص کے متعلق جو کچھ ہم کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ شخص بہت بڑے مسائل پر بہت کم سوچ کر اظہار رائے کر دینے کا مریض ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ اس کم عقلی میں مبتلا نہ ہوتا تو کبھی اس بات کو ممکن خیال نہ کرتا کہ ایک شخص اتنا عقیل و فہیم بھی ہو کہ اسے تاریخ انسانی کے بلند ترین اور کامیاب ترین لیڈروں میں شمار کرنے سے اس کے مخالفین بھی انکار نہ کر سکیں، اور دوسری طرف وہ اپنے بارے میں ۲۳ سال تک مسلسل اتنی بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہے اور اپنا سارا کام اسی غلط فہمی کی بنیاد پر چلاتا رہے، بلکہ آئے دن قرآن کی پوری پوری

سورتیں خود تصنیف کر کر کے دنیا کو سناتا رہے اور پھر بھی وہ اس غلط فہمی میں پڑا ہوا ہو کہ یہ سورتیں میرے اُوپر خدا کی طرف سے نازل ہو رہی ہیں۔ میرے نزدیک تو اس بات کو ممکن اور معقول سمجھنے والے آدمی کی اپنی عقل ہی مشتبہ ہے۔ اس کی عقل درست ہوتی تو وہ خود جان لیتا کہ اس طرح کی غلط فہمی صرف مجنون آدمیوں کو لاحق ہوا کرتی ہے، اور کسی مجنون آدمی سے وہ کمال درجہ کے مدبرانہ اور حکیمانہ کارنامے صادر نہیں ہو سکتے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوتے ہیں۔

۳۔ قرآن کے متعلق ان کے جو خیالات آپ نے نقل کیے ہیں ان کے بارے میں بھی میری وہی رائے ہے جو میں نے اُوپر عرض کی ہے کہ وہ کسی چیز سے پوری واقفیت بہم پہنچائے بغیر اور اس پر کافی غور کیے بغیر رائے قائم کرنے کے خوگر ہیں۔ ان سے پوچھیے کہ آپ نے ساری عمر میں کتنی دفعہ قرآن کا گہرا تحقیقی مطالعہ فرمایا ہے، جس کے بعد آپ اس کے بارے میں یہ فیصلہ دینے کے قابل ہوتے ہیں۔ اگر وہ ایمانداری کے ساتھ یہ تسلیم فرمالیں کہ انہوں نے اس طرح کا تحقیقی مطالعہ نہیں کیا ہے، تو ان سے گذارش کیجیے کہ تحقیق کے بغیر ایسے اہم مسائل میں فیصلے صادر کرنا کسی ذی ہوش اور تعلیم یافتہ آدمی کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اور اگر ان کا دعویٰ یہ ہو کہ انہوں نے خوب تحقیق کر کے یہ رائے قائم کی ہے تو ان سے دریافت کیجیے کہ قرآن کے اندر انہوں نے وہ کون سی شہادت پائی ہے جسے دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام ہے۔ نیز یہ بھی دریافت

کیجیے کہ قرآن کی کن کن باتوں کو انہوں نے ناقابلِ عمل، یا زمانہ نزول قرآن تک کے لیے قابلِ عمل پایا ہے۔ ان امور کی تعیین ان سے کرا لیجیے اور پھر مجھے لکھیے تاکہ میں بھی کچھ ان کے نتائج تحقیق سے استفادہ کرسکوں۔

۴۔ عبادات کے بارے میں ان کے جو نظریات آپ نے بیان کئے ہیں وہ بھی سخت ژولیدہ فکری (Confused thinking) بلکہ بے فکری کا نمونہ ہیں۔ شاید انہوں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ نماز روزہ وغیرہ اعمال صرف اسی صورت میں برائی سے بچنے کا بہترین ذریعہ اور معاشرے کو صحیح ڈگر پر چلانے کا آلہ ہو سکتے ہیں جب کہ انہیں خلوص کے ساتھ کیا جائے، اور خلوص کے ساتھ آدمی ان پر اسی صورت میں کاربند ہو سکتا ہے جب وہ ایمانداری سے یہ سمجھتا ہو کہ خدا ہے اور میں اس کا بندہ ہوں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقعی اللہ کے رسولؐ تھے اور کوئی آخرت آنے والی ہے جس میں مجھے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ان سب باتوں کو خلافِ واقعہ سمجھتا ہو، اور یہ خیال کرتا ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اصلاح کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہے، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس صورت میں بھی یہ عبادات، بُرائی سے بچنے کا ذریعہ اور معاشرے کو صحیح ڈگر پر چلانے کا آلہ بن سکیں گی۔ ایک طرف ان عبادات کے یہ فوائد بیان کرنا اور دوسری طرف ان فکری بنیادوں کو خود ڈھا دینا جن پر ان عبادات کے یہ فوائد منحصر ہیں، بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی کارتوس سے سارا گن پاؤڈر نکال دیں اور پھر کہیں کہ یہ کارتوس شیر کے شکار میں بہت کارگر ہے۔

۵۔ شیطان کے مسئلے پر ان کا اعتراض دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی پوری عمر میں کبھی ایک مرتبہ بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں فرمائی کہ قرآن مجید انسان اور شیطان کے معاملے کی کیا حقیقت بیان کرتا ہے۔ اس کو جانے بغیر انہوں نے محض کچھ سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر اس مسئلے کا سطحی سا تصور قائم کر لیا اور اس پر اعتراض جڑ دیا۔ یہ اعتراض درحقیقت ان کے اپنے ہی تصور پر وارد ہوتا ہے۔ اُس تصور پر اس کی کوئی زد نہیں پڑتی جو قرآن نے پیش کیا ہے۔ قرآن کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ خدا نے انسان کو ایک محدود نوعیت کی آزادی و خود مختاری دے کر اس دنیا میں امتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور شیطان کو خود اس کے مطالبے پر یہ آزادی عطا کی ہے کہ وہ اس امتحان میں انسان کو ناکام کرنے کے لیے جو کوشش کرنا چاہے کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ صرف ترغیب و تحریص کی حد تک ہو۔ زبردستی اپنے راستے پر کھینچ لے جانے کے اختیارات اسے نہیں دیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے خود بھی انسان کو جبراً راہ راست پر چلانے سے احتراز فرمایا ہے، اور صرف اس بات پر اکتفا فرمائی ہے کہ انسان کے سامنے انبیاء اور کتابوں کے ذریعہ سے راہ راست کو پوری طرح واضح کر دیا جائے۔ اس کے بعد خدا کی طرف سے آدمی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو خدا کی پیش کردہ راہ کو اپنے لیے چن لے اور اس پر چلنے کا فیصلہ کرے اور چاہے تو شیطان کی ترغیبات قبول کر لے اور اُس راہ میں اپنی کوششیں اور محنتیں صرف کرنے پر آمادہ ہو جائے جو شیطان اُس کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان دونوں راہوں میں سے جس کو بھی انسان خود اپنے لیے انتخاب

کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسی پر چلنے کے مواقع اسے دے دیتا ہے، کیونکہ اس کے بغیر امتحان کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ اس پوزیشن کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد بتایئے کہ شیطان کا چیلنج دراصل کس کے لیے ہے؟ خدا کے لیے یا انسان کے لیے؟ اور انسانوں میں سے جو لوگ شیطان کی راہ پر جاتے ہیں ان کے معاملہ میں شیطان کی جیت خدا پر ہوتی ہے یا انسان پر؟ خدا نے تو آدمی اور شیطان کو آزادانہ کشتی لڑنے کا موقع دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ آدمی جیتے گا تو جنت میں جائے گا، اور شیطان جیتے گا تو ہارنے والا آدمی اور اس کو غلط راہ پر لے جانے والا شیطان دونوں جہنم میں جائیں گے۔ اب کیا آپ چاہتے ہیں کہ خدا اس کے مقابلے میں مداخلت کر کے زبردستی انسان کو کامیاب کرائے؟

۶۔ چار شادیوں اور غلامی اور قربانی کے بارے میں مختصر طریقے سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ میں ان جملہ مسائل پر متعدد مرتبہ تفصیلاً اظہارِ خیال کر چکا ہوں تعدادِ ازدواج کے مسئلہ کو سمجھنے کے لیے آپ میری تفسیر تفہیم القرآن حصہ اول کے متعلقہ مقامات انڈکس کی مدد سے، نکاح۔ قانون اسلامی اور ازدواجی زندگی کے تحت مطالعہ کریں۔ علاوہ ازیں حکومت کے مقرر کردہ میرج کمیشن کے سوالنامے کا جو جواب میں نے دیا تھا اس میں بھی اس مسئلے پر بحث موجود ہے۔

غلامی کے مسئلے پر آپ میرے درجِ ذیل مضامین مطالعہ فرمائیں۔

۱۔ رسائل و مسائل حصہ اول مضمون "میدانِ جنگ میں قحبہ گری"

۲۔ " " دوم " "اسلام میں غلامی کو ممنوع کیوں نہ کر دیا گیا؟"

۳۔ تفہیمات، حصہ دوم۔ مضمون "غلامی کا مسئلہ" نیز "غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق چند سوالات"۔

۴۔ تفہیم القرآن حصہ اوّل و دوم۔ انڈکس میں غلامی کے زیرِ عنوان صفحات کا حوالہ موجود ہے۔

۵۔ ماہنامہ "ترجمان القرآن" شمارہ جون ۵۶ء "کنیز کی تعریف اور اس کے حلال ہونے کی دلیل۔ تعدّد ازواج اور لونڈیاں"۔

قربانی کے متعلق آپ میری کتاب تفہیمات حصہ دوم میں قربانی کے متعلق مضامین، نیز میرا رسالہ "مسئلہ قربانی" مطالعہ فرمائیں۔

ان ساری تحریروں سے انشاء اللہ آپ کو افہام و تفہیم میں مزید مدد ملے گی۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۸، عدد ۳۔ جون ۱۹۶۲ء)

پاکستان میں مسیحیت کی ترقی کے اصل وجوہ

سوال: اس ملک کے اندر مختلف قسم کے فتنے اٹھ رہے ہیں۔ سب سے زیادہ خطرناک فتنہ عیسائیت ہے۔ اس لیے کہ بین المملکتی معاملات کے علاوہ عام مسلمانوں کی اقتصادی پسماندگی کی وجہ سے اس فتنہ سے جو خطرہ لاحق ہے وہ ہرگز کسی دوسرے فتنہ سے نہیں۔

اندریں حالات جب کہ اس عظیم فتنے کے سدّباب کے لیے تمام

صلاحیت سے کام لینا از حد ضروری تھا۔ ابھی تک جناب کیطرف سے کوئی موثر کارروائی دکھائی نہیں دیتی بلکہ آپ اس فتنہ سے مکمل طور پر صرف نظر کر چکے ہیں۔ ابھی تک اس طویل خاموشی سے میں یہ نتیجہ اخذ کر چکا ہوں کہ آپ کے نزدیک مسیحی مشن کی موجودہ سرگرمی مذہبی اعتبار سے قابل گرفت نہیں اور اس فتنے کو اس ملک میں تبلیغی سرگرمی جاری رکھنے کا حق حاصل ہے، خواہ مسلمانوں کے ارتداد سے حادثہ عظمیٰ کیونکہ ہی پیش نہ ہو۔ مہربانی فرما کر بندہ کی اس خلش کو دور کریں۔

جواب:- جن فتنوں کے پھیلنے کا انحصار نشر و تبلیغ پر ہو۔ ان کا مقابلہ تو بیشک نشر و تبلیغ سے کیا جا سکتا ہے اور اس کام میں دانستہ کوتاہی میں نے کبھی نہیں کی ہے لیکن جن فتنوں کو پھیلانے میں اختیارات کی طاقت کارفرما ہو ان کے علاج کی کوئی صورت اس طاقت کی اصلاح یا تبدیلی کے سوا نہیں ہے۔ ان کو محض نشر و تبلیغ سے نہیں روکا جا سکتا۔

عیسائیت کے معاملہ میں یہی صورت پیش آرہی ہے، جیسا کہ آپ نے خود بھی اپنے خط میں اعتراف کیا ہے، جو لوگ اس ملک میں عیسائیت قبول کر رہے ہیں یا پہلے جنہوں نے قبول کی ہے، ان میں سے بہت ہی کم ایسے ہوں گے جنہوں نے دلیل کی بنا پر یہ مان لیا ہو کہ خدا تین ہیں، یا حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے تھے۔ یا ایک شخص کا سولی پر چڑھ جانا دوسروں کے گناہوں کا کفارہ ہو سکتا ہے۔ اس طرح کے عقائد کو صحیح مان کر، اور اسلام کے معقول

عقائد کو غلط سمجھ کر مسلمانوں سے عیسائی بن جانے والے آخر کتنے ہو سکتے ہیں۔ دراصل جو چیز لوگوں کو عیسائیت کی آغوش میں کھینچے لیے جا رہی ہے وہ مسیحی مشنریوں کی تبلیغ نہیں بلکہ مشن ہسپتالوں اور اسکولوں کی کارگذاری ہے جسے فروغ دینے میں ہماری اپنی حکومت کی بالواسطہ اور بلاواسطہ امداد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس پر مزید وہ غیر معمولی اثر و رسوخ ہے جو عیسائی پادریوں کو ہمارے حکام عالی مقام کی بارگاہوں میں حاصل ہے۔ یہ عیسائیت کے پھیلنے میں مددگار ہو رہا ہے۔ ان اسباب کی جب تک روک تھام نہ ہو، میری، آپ کی، یا تمام علماء کی مجموعی تبلیغ سے بھی کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

عیسائی ہسپتالوں میں ہر شخص جا کر خود دیکھ سکتا ہے کہ وہ نہ بے غرض خدمت خلق کے ادارے ہیں اور نہ علاج کے تجارتی ادارے بلکہ ان میں کھلم کھلا ایمان خریدنے کا کاروبار ہو رہا ہے۔ ان اداروں میں مسلمانوں سے علاج کی خوب فیسیں لی جاتی ہیں اور عیسائیوں کا مفت علاج ہوتا ہے اور اس کے ساتھ دین مسیحی کی تبلیغ بھی مریضوں پر کی جاتی ہے۔ اس حالت میں ایک غریب آدمی کے لیے جو اپنا یا اپنے کسی عزیز کا علاج کرانے کی استطاعت نہ رکھتا ہو، اس امر کی بہت بڑی تحریص موجود ہے کہ اپنا دین تبدیل کر کے علاج کی سہولتیں حاصل کر لے۔

مسیحی مدرسوں اور کالجوں میں بھی یہی صورت ہے کہ ان میں مسلمانوں سے خوب فیسیں لی جاتی ہیں اور عیسائیوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے، بلکہ ان کے لیے بیرونی ممالک میں بھی تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں فراہم کر دی جاتی ہیں یہاں پھر غریبوں کے لیے یہ تحریص موجود ہے کہ جو تعلیم وہ اپنے بچوں کو خود

نہیں دلا سکتے، اس کا انتظام محض مذہب تبدیل کرنے سے ہو سکتا ہے اور دنیوی ترقی کے دروازے ان کے لیے کھل سکتے ہیں۔

یہ دونوں قسم کے ادارے ہمارے ملک میں ایک طرف تو بیرونی روپے سے چل رہے ہیں۔ اور دوسری طرف ہماری اپنی حکومت ہر طرح ان کی امداد کر رہی ہے۔ ان کو گرانٹ دی جاتی ہے۔ ان کو زمینیں دی جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ وہ رعایتیں کی جاتی ہیں جو خود مسلمانوں کے مذہبی اداروں کے ساتھ کبھی نہیں کی گئیں اور ان کے معاملہ میں اس سوال سے بالکل آنکھیں بند کر لی گئی ہیں کہ باہر سے آنے والا یہ روپیہ جو ان اداروں پر خرچ ہو رہا ہے، اور غیر ممالک کے مشنری ہمارے شہروں اور دیہات میں پھیل کر اس روپے سے جو کام لے رہے ہیں، اس کے پیچھے خالص دینی تبلیغ کے علاوہ اور کیا اغراض کارفرما ہیں اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہمارے اپنے ہی حکمران مذہبی رواداری کے تمام معقول حدود سے تجاوز کر کے اس بات پر نہ صرف راضی ہیں بلکہ اس میں خود مددگار بن رہے ہیں کہ دوسرے لوگ روپے کے زور سے مسلمانوں کے ایمان خرید لیں۔

مسیحی پادریوں کے اثر و رسوخ کا یہ حال ہے کہ آج ہمارے دیہاتی علاقوں میں غیر مسیحی عوام کو ظالموں کے ظلم سے بچانے کے لیے کوئی تحفظ حاصل نہیں ہے۔ لیکن ہر جگہ مسیحی برادری کا پشت پناہ ایک پادری موجود ہے جو تھانے سے لے کر سکرٹری ایٹ تک ہر درجے اور مرتبے کے حکام سے مسیحیوں کو نہ صرف انصاف دلواتا ہے بلکہ ان کے لیے بے جا رعایتیں تک حاصل کر لیتا ہے۔

مسلمانوں کے کسی عالم کو ان حاکموں کی بارگاہوں میں وہ رسائی حاصل نہیں ہے جو عیسائی پادریوں کو حاصل ہے۔ مسلمان علماء ان تمام حکام کی نگاہوں میں ویسے ہی ذلیل وخوار ہیں جیسے انگریز حاکموں کی نگاہ میں کبھی تھے۔ مگر مسیحی پادری ان کا بھی اسی طرح "فادر" ہے جس طرح انگریز حاکموں کا تھا۔ یہ ایک اور سبب ہے جس کی بنا پر دیہات کے بے سہارا لوگ اپنے آپ کو پولیس اور زمینداروں اور بااثر غنڈوں کے ظلم سے بچانے کے لیے مسیحیت میں پناہ ڈھونڈنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

یہ تو غریبوں میں مسیحیت کے پھیلنے کے اسباب ہیں۔ رہے کھاتے پیتے طبقے، تو ہماری حکومت ہی کی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ خوش حال لوگ اپنی اولاد کو اردو زبان اور اپنی قومی تہذیب اور اپنے دین کی تعلیم و تربیت دینا لاحاصل سمجھتے ہیں اور ان کو ایسی تعلیم و تربیت دلوانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے وہ زبان اور اطوار و عادات کے اعتبار سے پورے انگریز یا امریکی بن جائیں۔ اس غرض کے لیے وہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو مسیحی اداروں میں بھیجتے ہیں جہاں کا پورا ماحول ان کو اسلام اور اسلامی تہذیب سے بیگانہ اور اسلامی تعلیمات سے محض ناواقف ہی نہیں بلکہ منحرف اور باغی بنا دیتا ہے۔ اس کے بعد اگر یہ نوجوان عیسائی نہ بھی بنیں تو بہر حال مسلمان تو نہیں رہتے۔ بلکہ مسلمانوں کی بہ نسبت عیسائیوں سے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔ یہی لوگ تعلیم سے فارغ ہو کر ہمارے بڑے بڑے افسر بنتے ہیں اور اونچے عہدے انہی کے لیے مخصوص ہو جاتے ہیں۔ ان سے کون یہ امید کر سکتا ہے کہ ان کی سرکردگی

مسیحیت کے مقابلے میں کبھی اسلام کے ساتھ ہوسکیں گی اور مسیحیت کے فروغ کو روکنے کا کوئی جذبہ ان میں پیدا ہو سکے گا۔

ان حالات میں آپ خود بتائیے کہ محض مسیحی عقائد کی تردید میں مضامین لکھنے یا گاؤں گاؤں تبلیغ کے لیے دورے کرنے سے مسیحیت کے اس سیلاب کو کہاں تک روکا جاسکتا ہے۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۸، عدد ۳۔ جون ۱۹۶۲ء)

تصویر سے اظہارِ برأت

سوال: ماہ جولائی ۱۹۶۲ء کے ترجمان (تفہیم القرآن) میں تصویر کے مسئلے کو جس خوبی سے آپ نے کتاب وسنت کی روشنی میں حل کیا ہے، ایمان کی بات ہے کہ ذہن مسلمان ہو تو حق بات دل میں اتر کر رہتی ہے اگر واقعی تصویر حرام ہے تو پھر آپ کی تصویر اخبار میں دیکھی جائے تو بڑا رنج ہوتا ہے۔ عموماً علمائے کرام تصویر کو ناجائز بتاتے ہیں مگر ان کا عمل اس کے برعکس ہوتا ہے۔

جواب: آپ شاید اس خیال میں ہیں کہ آجکل بھی کسی شخص کی تصویر اسی وقت اتر سکتی ہے جب وہ خود کھنچوائے، حالانکہ اس زمانے میں آدمی کی تصویر بالکل اسی طرح اتاری جاتی ہے جیسے کسی شخص کو اچانک گولی مار دی جائے۔ اخبارات

میں میری جو تصویریں شائع ہوتی ہیں ان میں میری مرضی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ تصویر کے بارے میں میں نے اپنا مسلک شروع سے واضح کر رکھا ہے۔ اگر اس کے باوجود بھی لوگ تصویر لینے سے باز نہیں آتے تو اس کی ذمہ داری ان کی گردن پر ہے اور آپ کو مجھ سے پوچھنے کے بجائے اُن سے پوچھنا چاہیئے

(ترجمان القرآن جلد ۵۸ عدد ۶۔ ستمبر ۱۹۶۲ء)

لفظ نکاح کا اصل مفہوم

سوال: ترجمان القرآن بابت ماہ مارچ ۱۹۶۲ء میں تفہیم القرآن کے تحت آپ نے جو احکام مستنبط فرمائے ہیں، ان میں سے پہلے ہی مسئلہ میں آپ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ "قرآن نکاح کا لفظ بول کر صرف عقد مراد لیتا ہے" یا قرآن اسے اصطلاحاً" صرف عقد کے لیے استعمال کرتا ہے"۔ یہ قاعدہ کلیہ نہ صرف یہ کہ ہمارے ہاں کے غالب فقہی مسلک یعنی حنفیہ کے نزدیک ناقابل تسلیم ہے بلکہ جمہور اہل تفسیر کی تصریحات کے بھی منافی ہے۔ تعجب ہے کہ ایک ایسی بات جس کے حق میں شاید ہی کسی نے رائے دی ہو آپ نے قاعدہ کلیہ کے طور پر بیان فرما دی ہے۔

جواب: یہ ایک لمبی بحث ہے کہ لغت کے اعتبار سے نکاح کے معنی کیا ہیں

علمائے لغت میں اس امر پر بہت کچھ اختلاف ہوا ہے کہ عربی زبان میں نکاح کے اصل معنی کیا ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ لفظ وطی اور عقد کے درمیان لفظاً مشترک ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ ان دونوں میں معنیً مشترک ہے تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اس کے اصل معنی عقد نزدیج کے ہیں اور وطی کے لیے اس کو مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ چوتھا گروہ کہتا ہے کہ اس کے اصل معنی وطی کے ہیں اور عقد کے لیے مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن راغب اصفہانی نے پورے زور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ "لفظ نکاح کے اصل معنی عقد ہی کے ہیں۔ پھر یہ لفظ استعارۃً جماع کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اور یہ بات محال ہے کہ اس کے اصل معنی جماع کے ہوں اور استعارے کے طور پر اسے عقد کے لیے استعمال کیا گیا ہو"۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ جتنے الفاظ بھی جماع کے لیے عربی زبان میں، یا دنیا کی کسی دوسری زبان میں حقیقۃً وضع کیے گیے ہیں وہ سب فحش ہیں۔ کوئی شریف آدمی کسی مہذب مجلس میں ان کو زبان پر لانا بھی پسند نہیں کرتا۔ اب آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو لفظ حقیقۃً اس فعل کے لیے وضع کیا گیا ہو اُسے کوئی معاشرہ شادی بیاہ کے لیے مجازو استعارہ کے طور پر استعمال کرے اس معنی کو ادا کرنے کے لیے تو دنیا کی ہر زبان میں مہذب الفاظ ہی استعمال کیے گئے ہیں نہ کہ فحش الفاظ۔

علمائے احناف بالعموم یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ یہ لفظ حقیقۃً وطی کے لیے اور مجازاً عقد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ احناف کی متفق علیہ رائے نہیں ہے۔ بعض مشائخ حنفیہ اس لفظ کو وطی اور عقد کے درمیان مشترک

معنوی بھی قرار دیتے ہیں۔ پھر نکاح کی شرعی تعریف تو ان کے ہاں یہی ہے کہ "ھو عقد یفید ملک المتعۃ قصداً" یا "عقد وضع لتملیک منافع البضع"۔

میرے نزدیک قرآن وسنت میں نکاح ایک اصطلاحی لفظ ہے جس سے مراد لازماً عقدِ تزویج ہی ہے اور جب یہ لفظ مطلقاً استعمال ہوگا تو اس سے مراد عقد ہی لیا جائے گا اِلّا یہ کہ کوئی قرینہ اس بات پر دلالت کرتا ہو کہ یہاں مراد محض وطی یا عقد مع الوطی ہے۔ رہی وطی بلا عقد تو اس کے لیے لفظ نکاح کے استعمال کا جواز لغت میں تو ہو سکتا ہے لیکن قرآن وسنت میں اس کی کوئی مثال میرے علم میں نہیں ہے۔ آپ کے علم میں ہو تو پیش فرمائیں۔

[اس کے جواب میں سائل نے فقہ کی بعض کتابوں سے مفصّل عبارتیں نقل کر کے بھیجیں۔ اس پر ان کو حسب ذیل جواب دیا گیا۔ م]

افسوس ہے کہ کسی مسئلے پر زیادہ طویل بحث کی فرصت مجھے میسّر نہیں، تاہم میں اجمالاً ایک بار پھر اپنے مدعا کی وضاحت کیے دیتا ہوں۔ اس کے بعد بھی اطمینان نہ ہو تو مضائقہ نہیں۔ آپ اپنی رائے پر قائم رہ سکتے ہیں اور میں اپنی رائے پر۔

نکاح سے مراد عقد اور وطی بعد عقد لینے میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے اختلاف صرف اس امر میں ہے کہ آیا اس سے مراد وطی بغیر عقد بھی لی جا سکتی ہے؟ اس چیز کے ماننے میں مجھے تامّل ہے، کیونکہ شرعاً اس کے لیے زنا اور سفاح وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور اس قبیح فعل پر لفظ نکاح کا اطلاق جائز تسلیم

کرنے کے لیے ان دلائل سے زیادہ قوی دلائل کی ضرورت ہے جو آپ نے نقل فرماتے ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ تسلیم نہیں ہے کہ نکاح کا لفظ اصلاً فعل مباشرت کے لیے وضع ہوا تھا اور پھر مجازاً عقد کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ فعلِ مباشرت کے لیے دنیا کی جس زبان میں بھی کوئی لفظ وضع ہوا ہے (یعنی جو استعارہ و کنایہ کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ صراحتہً اسی فعل کے لیے موضوع ہے) وہ قبیح و شنیع ہے اور کسی زبان میں بھی اس کو عقد کے لیے مجازاً استعمال نہیں کیا گیا ہے اردو زبان میں اس فعل کے لیے جو لفظ مستعمل ہے اسے آخر کون شخص بیاہ کے لیے استعمال کرتا ہے۔

خود آپ کے پیش کردہ حوالوں سے بھی یہ ثابت ہے کہ لفظ نکاح کے اصل معنی ضم کے ہیں۔ اب کیا یہ بات ماننے کے لائق ہے کہ یہ لفظ اصلاً مجرد فعلِ مباشرت کے لیے (بلا لحاظ اس کے کہ عقد ہو یا نہ ہو) وضع ہوا تھا؟

بلاشبہ ایسی مثالیں لغت میں ملتی ہیں جن میں یہ لفظ محض مباشرت کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس لفظ کا اصل مفہوم مباشرت ہے اور عقد کے لیے یہ مجازاً استعمال کیا گیا ہے۔

قرآن اور حدیث سے جو مثالیں آپ نے دی ہیں ان پر آپ غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں ہے جس کی دوسری تاویل ممکن نہ ہو۔ مثلاً میں زنا سے حرمتِ مصاہرت کا قائل ہوں۔ مگر میرے نزدیک قرآن کی آیت لا تنکحوا ما نکح آباؤکم کا مطلب یہ نہیں ہے

کہ "جن عورتوں سے تمہارا باپ زنا کر چکا ہو ان سے تم نہ زنا کرو اور نہ عقد"؛ بلکہ میں اس کا مطلب یہی لیتا ہوں کہ جن عورتوں سے باپ کا نکاح ہو چکا ہو، ان سے اولاد کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس سے بالتبع یہ حکم بھی نکلتا ہے کہ باپ سے جس عورت کا بھی شہوانی تعلق کسی طرح ہو گیا ہے وہ بیٹے پر حرام ہے اور بیٹے کا تعلق جس عورت سے ہو گیا ہے وہ باپ پر حرام ہے ناکح الید ملعون میں بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ حضورؐ نے استعارہ کی زبان میں استمنا بالید کرنے والے کو ایسے شخص سے تشبیہ دی ہے جو اپنے ہی ہاتھ سے بیاہ کر رہا ہے۔ ایسی ہی تاویل دوسرے نظائر کی بھی کی جاسکتی ہے۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۸، عدد ۶۔ ستمبر ۱۹۶۲ء)

حقیقی توبہ

سوال: اس سے قبل میں مبتلائے کبائر تھا مگر اس کے بعد توبہ نصوح کر لی ہے اور اب آپ کی تحریک سے متاثر ہو کر اللہ کا شکر ہے کہ ایک "شعوری مسلمان" ہو گیا ہوں۔ لیکن دن رات اپنے اُخروی انجام سے ہراساں رہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آخرت کی بجائے دنیا ہی میں اپنے کیے کی سزا بھگت لوں۔ مگر افسوس کہ اسلامی سزا کا قانون ہی رائج نہیں ہے، للہ آپ میری مدد فرمائیں اور

کوئی مناسب راہ متعین فرمائیں۔

جواب: اللہ تعالیٰ ہر اس گناہ کو بخش دیتا ہے جس پر ایک مومن سچے دل سے نادم ہو کر تائب ہو اور پھر اس گناہ کا اعادہ نہ کرے۔ توبہ کے ساتھ ساتھ اگر آدمی راہِ خدا میں کچھ صدقہ بھی کرے یا اللہ کی راہ میں کوئی قربانی اس نیت سے کرے کہ اللہ اپنی رحمت سے اس کا گناہ معاف فرما دے تو یہ چیز توبہ کی قبولیت میں اور زیادہ مددگار ہوتی ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کی توبہ قبول فرمائے اور آپ کو استقامت بخشے۔

(ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۲ء)

عورت کی عصمت و عفت کا مستقبل

سوال: مارننگ نیوز (کراچی) کا ایک کٹنگ ارسالِ خدمت ہے۔ اس میں انگلستان کی عدالتِ طلاق کے ایک سابق جج سر ہربرٹ ولنگٹن نے ایک مکمل بیوی کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اس کٹنگ کا ترجمہ یہ ہے۔

(رومن کیتھولک عدالت طلاق کے سابق جج سر ہربرٹ ولنگٹن نے اپنے ایک فیصلہ میں ایک مکمل بیوی کی چودہ خصوصیات گنائی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے: صوری کشش، عقلمندی، محبت، نرم خوئی

شفقت، خوش اطواری، جذبہ تعاون، صبر و تحمل، غور و فکر، بے غرضی
خندہ روئی، ایثار، کام کی لگن اور وفاداری۔

سر ہربرٹ نے اپنے فیصلہ میں کہا ہے کہ یہ تمام خصوصیات ان کی دوسری بیوی میں موجود تھیں جس سے انہوں نے اگست ۱۹۴۵ء میں اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد شادی کی تھی۔ سر ہربرٹ جنہوں نے اپنی عدالت میں سینکڑوں ناکام شادیوں کو فسخ کیا ہے ۸۶ برس کی عمر پاکر جنوری ۱۹۶۲ء میں وفات پا گئے ہیں۔

اس کٹنگ سے واضح ہوتا ہے کہ سر ہربرٹ نے عفت یا پاکدامنی جیسی خوبی کو ان چودہ نکاتی فہرست میں برائے نام بھی داخل کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ گویا اب پاک دامنی کا شمار عورت کی خوبیوں میں نہیں کیا جاتا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک عورت پاکدامنی کے بغیر کس طرح خاوند کی وفادار رہ سکتی ہے؟

جواب: آپ کا عنایت نامہ ملا جس کے ساتھ آپ نے انگلستان کی ایک عدالتِ طلاق کے جج کی وصیت ارسال کی ہے اور مجھے اس پر اظہارِ خیال کی دعوت دی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اہلِ مغرب کے ہاں سے یہ تخیل اب قریب قریب ختم ہی ہو چکا ہے کہ پاکدامنی بھی عورت کی خوبیوں میں سے ایک خوبی ہے۔ اختلاطِ مرد و زن کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان کے ہاں بدکاری بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ معاشرے کو اب اس کے رواجِ عام سے اپنے آپ کو مانوس کرنا پڑا۔ اب وہاں کوئی شخص بھی یہ توقع نہیں رکھتا کہ شادی کے روز اسے بیوی کنواری

ملے گی اور شادی کے بعد بھی وہ باعفت اور وفا شعار رہے گی۔ وہاں مرد بالعموم کورٹ شپ کے دوران میں خود اپنی ہونے والی بیوی سے زنا کر چکا ہوتا ہے اور اکثر شادی ہی اس وقت ہوتی ہے جب لڑکی حاملہ ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں آخر آپ یہ توقع ہی کیسے کر سکتے ہیں کہ ان کے ہاں اب تک پاکدامنی عورت کی ایک محمود صفت اور بیوی کی ایک لازمی خوبی سمجھی جاتی رہے۔

میں کہتا ہوں کہ ان کا کیا ذکر ہے۔ ہمارے حکمران طبقوں اور اونچی سوسائٹی کے لوگوں کی بدولت اب جس رفتار سے ہمارے ہاں اختلاطِ مرد و زن بڑھ رہا ہے اور خاندانی منصوبہ بندی کے نام سے ضبطِ ولادت کے طریقوں کو جس طرح عام کیا جا رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے خود ہمارے ہاں یہی حالات پیدا ہوتے نظر آتے ہیں۔ خدا ان لوگوں کو یا تو ہدایت دے یا پھر ہماری قوم کو ان سے نجات دے جو خود بگڑے ہیں اور ساری قوم کو بگاڑ دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۸، عدد ۶۔ ستمبر ۱۹۶۲ء)

اُردو زبان اور موجودہ حکمران

سوال: آپ اس حقیقت سے بہت زیادہ واقف ہیں کہ مشرق کی عظیم عوامی زبان اُردو ہی وہ واحد زبان ہے کہ جس کو ہم دولتین پاک و ہند کی بین المملکتی زبان قرار دے سکتے ہیں۔ عوامی رابطہ مشرقی و مغربی

پاکستان کے اعتبار سے بھی اُردو ہی بین عوامی زبان کہلائی جا سکتی ہے۔ مغربی پاکستان کی ۹ علاقائی زبانوں میں بھی اُردو ہی واحد بین العلاقائی زبان ہے۔

اُردو کی دولت مندی، اعلیٰ استعداد علمی و صلاحیت دفتری حضرت والا سے مخفی نہیں۔ اس کے باوجود آج پندرہ سال کی طویل مدت گزر گئی لیکن اردو کا نفاذ مغربی پاکستان میں بحیثیت سرکاری، دفتری عدالتی اور تعلیمی زبان نہ ہو سکا۔

جناب وزیر قانون حکومت پاکستان کے انکشافات آپ کی نظر سے گزرے ہوں گے۔ موصوف نے اپنے ارشادات میں واضح کیا ہے کہ ۱۹۷۲ء تک انگریزی استعمال کی جا سکتی ہے یا انگریزی کا استعمال کیا جاتا رہے گا۔ اور ۱۹۷۲ء میں ایک کمیشن قائم کیا جائے گا جو اس بات کا جائزہ لے گا کہ انگریزی کے بجائے کونسی زبان متبادل ہوگی۔ وزیر صاحب موصوف کے متذکرہ صدر ارشادات سے شیدایان اُردو کو از حد صدمہ ہوا۔ اور بڑی حد تک مایوسی طاری ہو گئی۔

مجھ جیسے کروڑہا شیدایان اُردو کی جانب سے اس وقت زبان اُردو کو آپ کی طاقتور معاونت کی شدید ضرورت ہے۔ ازراہِ کرم اس خصوص میں اپنے بصیرت افروز ارشادات سے میری راہنمائی فرمائیں۔[1]

---

[1] قارئین کے لیے اس امر کا علم موجب دلچسپی ہوگا کہ یہ سوال ایک طویل خط کا اقتباس ہے

جواب : اُردو زبان کے لیے آپ جو کوشش فرما رہے ہیں، میں اس کی تہ دل سے قدر کرتا ہوں۔

اُردو زبان کے راستے میں اصل رکاوٹ صرف یہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں کا بالائی طبقہ چونکہ خود انگریزی ماحول میں پلا ہوا ہے اور اُردو لکھنے بولنے پر قادر نہیں ہے، اس لیے وہ چاہتا ہے کہ اس کے جیتے جی ساری قوم پر انگریزی زبان مسلط رہے۔ پھر یہ لوگ اپنی اولاد کو بھی انگریزیت ہی کے ماحول میں پرورش کر رہے ہیں۔ اور اس بات کا انتظام کر رہے ہیں کہ حکومت کی باگ ڈور آئندہ انہی کی نسل کے قبضے میں رہے، اس لیے ۱۹۷۲ء میں بھی اس امر کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی کہ اُردو زبان کو یہاں کی سرکاری اور تعلیمی زبان بنانے کا فیصلہ ہو جائے گا۔ کمیشن کی تجویز صرف طفل تسلی کے لیے ہے تاکہ وقت ٹالا جائے اور مطالبہ کرنے والوں کو فی الحال کم از کم دس سال کے لیے چپ کرا دیا جائے۔ ہماری مصیبتوں کا کوئی حل اس کے سوا نہیں ہے کہ ان دیسی انگریزوں سے کسی نہ کسی طرح پیچھا چھڑایا جائے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ انگریز خود تو چلا گیا ہے مگر اس کا بھوت ہمیں چمٹ کر رہ گیا ہے۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۹، عدد ۵ فروری ۱۹۶۳ء)

جو ایک غیر مسلم پاکستانی نے لکھا ہے اور جس میں اُردو زبان کی ترویج پر بہت زور دیا گیا ہے (ترجمان)

غلاف کعبہ کی نمائش اور اس کا جلوس

سوال :- حال ہی میں بیت اللہ کے غلاف کی تیاری اور نگرانی کا جو شرف پاکستان اور آپ کو ملا ہے وہ باعثِ فخر و سعادت ہے۔ مگر اس سلسلے میں بعض حلقوں کی جانب سے اعتراضات بھی وارد ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے تو آپ کی نیت پر حملے کیے گیے ہیں اور یہ کہا گیا ہے کہ در اصل آپ اپنے اور اپنی جماعت کے داغ مٹانا اور پبلسٹی کرنا چاہتے تھے اور آئندہ انتخابات میں کامیابی کے خواہاں تھے، اس لیے آپ نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا تاکہ شہرت بھی حاصل ہو اور الیکشن فنڈ کے لیے لاکھوں روپے بھی فراہم ہوں۔ اس کے بعد بعض اعتراضات اصولی اور دینی رنگ میں پیش کیے گیے ہیں۔ مثلاً یہ کہا گیا ہے کہ :-

۱۔ غلافِ کعبہ کو قرآن و حدیث میں شعائر اللہ کے زمرے میں شمار نہیں کیا گیا، اس لیے عملاً یا اعتقاداً اس کی تقدیس و تعظیم ضروری نہیں یہ بس کپڑے کا ایک ٹکڑا ہے، اس سے زائد کچھ نہیں، خواہ یہ کعبے کی نیت سے بنے یا نہ بنے۔ کعبے سے کسی طرح کا تعلق رکھنے والی اگر ہر شے کا شمار شعائر اللہ میں ہونے لگے اور اس کی تعظیم لازم سمجھی جاتے تو پھر تعمیر کعبہ کے لیے جانے والا پتھر یا اس طرح کی دوسری

اشیاء بھی قابلِ تعظیم ٹھہریں گی۔

۲۔ غلاف کی نمائش و زیارت اور اسے جلوس کے ساتھ روانہ کرنا ایک بدعت ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ کے دور میں کبھی ایسا نہیں کیا گیا، حالانکہ غلاف اس زمانے میں بھی چڑھایا جاتا تھا۔ اگر غلاف کی نمائش کرنا اور اس کا جلوس نکالنا جائز ہے تو پھر ہدی کے اونٹوں کا جلوس کیوں نہ نکالا جائے، جنہیں قرآن نے صراحت کے ساتھ شعائر اللہ قرار دیا ہے۔

۳۔ جو غلاف ابھی چڑھایا نہ گیا ہو بلکہ چڑھانے کے لیے تیار کیا گیا ہو وہ تو محض کپڑا ہے، آخر وہ کیسے متبرک ہو گیا کہ اس کی زیارت کی اور کرائی جائے اور اسے اہتمام کے ساتھ جلوس کی شکل میں روانہ کیا جائے۔ پھر جو غلاف خانہ کعبہ سے اترتا ہے اس کی تعظیم و تکریم کیوں روا نہیں رکھی جاتی اور فقہا نے اس کا عام کپڑے کی طرح استعمال و استفادہ کیوں جائز رکھا ہے۔

۴۔ یہ فعل بجائے خود احداث فی الدین اور بدعت ممنوعہ ہونے کے علاوہ بہت سے دیگر بدعات، منکرات اور حوادث کا موجب ہے۔ چنانچہ غلاف کی اس طرح زیارت اور نمائش کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ مردوں اور عورتوں کا اختلاط ہوا ہے، عورتوں کی بے پردگی اور بے حرمتی ہوئی ہے، جانیں تلف ہوئی ہیں، نذرانے چڑھائے گئے ہیں، غلاف کو چوما گیا ہے، اس کے گرد طواف کیا گیا ہے، اس سے

اپنی حاجات طلب کی گئی ہیں، حتیٰ کہ اس کو سجدے کیے گئے ہیں پھر غلاف کے جلوس باجے کے ساتھ نکالے گئے ہیں اور اسے حضرت مخدوم علی ہجویری کے مزار پر چڑھایا گیا۔

معترضین کا کہنا یہ بھی ہے کہ ہماری قوم پہلے ہی جذبہ تنظیم سے عاری اور بدعات میں غرق ہے، اس لیے آپ کو یہ پیشگی سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ اس طرح کے پروگراموں کا لازمی انجام یہی کچھ ہوگا چنانچہ ان نتائج و عواقب کی ذمہ داری آپ پر براہ راست عائد ہوتی ہے۔

اس طرح کے اعتراضات چونکہ بار بار اٹھائے جا رہے ہیں اس لیے بہتر اور مناسب ہے کہ آپ ان کا جواب دیں۔ اس ضمن میں یہ بہت ضروری ہے کہ آپ بدعت کے مسئلے کو اصولی طور پر واضح کریں اور بتائیں کہ شریعت میں جو بدعت مکروہ و مذموم ہے اس کی تعریف کیا ہے اور اس کا اطلاق کس قسم کے افعال پر ہوتا ہے۔

جواب: اس معاملہ میں مختلف دینی حلقوں کی طرف سے جو اعتراضات کیئے گئے ہیں وہ سب میری نگاہ سے گزرتے رہے ہیں۔ مگر ان میں جو زبان استعمال کی گئی ہے او . ندازِ بیان سے کام لیا گیا ہے، اس کا حریف بننا کسی طرح بھی میرے بس میں نہ تھا، اس لیے میں نے ان سے کوئی تعرض نہ کیا۔ اب ایک سائل نے شرافت و معقولیت کے ساتھ مطالبہ کیا ہے کہ اصل وجوہِ اعتراض پر بحث کی جائے، اس لیے ان صفحات میں اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔

جتنے اعتراضات اُوپر نقل کیے گئے ہیں، ان کی ساری عمارت دراصل ایک غلط مفروضے پر تعمیر کی گئی ہے۔ معترضین نے اپنی جگہ یہ فرض کرلیا ہے کہ میں نے خود ابتداً کر کے غلاف کی نمائش کا انتظام کیا اور اس کا جلوس نکالنے کا پروگرام بنایا اور اسپیشل ٹرینوں کے ذریعہ سے شہر در شہر اس کو پھرانے کی اسکیم بنائی۔ اسی بنیاد پر وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ یہ بدعت آخر یہاں کیوں شروع کی گئی اور پھر اس پر اعتراضات کے ردّے پر ردّے چڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ دراصل یہ مفروضہ ہی بجائے خود واقعات کے خلاف ہے۔ میرے پیشِ نظر سرے سے یہ بات تھی ہی نہیں کہ اس غلاف کے معاملے کو عوام میں مشتہر کیا جائے اور نہ میرے حاشیۂ خیال میں کبھی یہ بات آئی تھی کہ اسے جلوسوں اور نمائشوں کے بعد دھوم دھام سے روانہ کیا جائے۔ غلاف کی تیاری کے لیے ابتداءً سارا کام بالکل رازداری کے ساتھ ہوتا رہا۔ میری خواہش یہ تھی کہ پاکستان کے کاریگروں سے سعودی عرب کے منتظمینِ دارالکسوہ کا براہ راست معاملہ کرادوں اور پھر عملاً اس سے بے تعلق ہو جاؤں۔ میں نہ یہ چاہتا تھا کہ میرا اس کی نگرانی سے کوئی تعلق ہو اور نہ میں نے اس کو پسند کیا کہ اس کی کوئی اطلاع اخبارات میں شائع ہو یا عام لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ میں اس سلسلے میں کوئی کام کر رہا ہوں۔ لیکن مختلف کاریگروں سے سعودی عرب کے منتظمین کا تعارف کرانا اور ان کے کام کے نمونے حاصل کرنا بہرحال ناگزیر تھا۔ اس سے رفتہ رفتہ بات پھیلتی چلی گئی۔ پھر یکایک ایک روز یہ واقعہ پیش آگیا کہ چند کاریگروں کو مکے سے آتے ہوتے پرانے غلاف کا ایک ٹکڑا بطور نمونہ دیا گیا تھا تاکہ وہ

اس کے مطابق کام بنا کر لاتیں۔ عوام کو نہ معلوم کس طرح ان کے پاس اس ٹکڑے کی موجودگی کا علم ہوگیا اور لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ اس کی زیارت کے لیے جمع ہو گئے۔ اس کے بعد اس کا جلوس بازار میں نکالا گیا اور آناً فاناً یہ بات شہر میں مشہور ہو گئی کہ یہاں غلاف کعبہ کی تیاری کا کام ہو رہا ہے۔ اس واقعہ سے ایک خبر رساں ایجنسی تک یہ اطلاع پہنچ گئی اور اس نے سارے ملک میں اسے پھیلا دیا۔ پھر اخبارات کے نمائندوں نے بطور خود اس میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ غلاف کی تیاری کے مختلف مرحلوں کی اطلاعات اخباری نمائندے خود ہی ٹوہ لگا لگا کر حاصل کرتے رہے اور انہیں شائع کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب غلاف کا کپڑا تیار کرنے کا کام یعقوب انصاری صاحب کے سپرد کیا گیا تو اخبارات نے ان کا فوٹو، ان کے کاریگروں کا فوٹو، ان کی فیکٹری کا فوٹو، تمام تفصیلات کے ساتھ شائع کر دیا، جس سے عوام کو معلوم ہو گیا کہ غلاف کہاں بن رہا ہے اور کون بنا رہا ہے، اب غلاف کی تیاری شروع ہونے سے پہلے ہی لوگ فیکٹری پر جمع ہونے لگے۔

یہ سب کچھ میرے علم و اطلاع کے بغیر ہوتا رہا۔ میری کسی خواہش اور کوشش کا اس میں قطعاً کوئی دخل نہ تھا۔

عوام میں جب یہ اطلاعات پھیلیں تو ان کے اندر غلاف کو دیکھنے کا شوق ایک طوفان کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے پہلے اس امر کا کوئی اندازہ ہی نہ تھا کہ یہاں لوگ اس چیز سے اتنی اور اتنے بڑے پیمانے پر دلچسپی لیں گے۔ اب جو خلافِ توقع یہ صورت سامنے آئی تو میں نے محسوس کیا کہ اس طوفان کو روک

دینا میرے یا کسی شخص کے بس میں نہیں ہے اور اسے روکنے کی کوشش میں قوت صرف کرنا غیر ضروری بھی ہے، کیونکہ یہ ایک فطری دلچسپی ہے اور بجائے خود ناجائز نہیں ہے۔ یہ ملک عرب سے بہت دور ہے۔ یہاں کے بہت کم لوگوں کو وہاں جانا اور بیت اللہ کو دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔ یہاں کے عوام کو پہلی مرتبہ یہ معلوم ہوا ہے کہ ہمارے ہاں سے ایک ہدیہ خدا کے گھر کے لیے تیار ہو کر جا رہا ہے۔ اس لیے یکایک ان کے اندر اکتش شوق بھڑک اٹھی ہے۔ یہ شوق کسی بت کے لیے نہیں ہے۔ کسی معبود غیر اللہ کے آستانے کے لیے نہیں ہے۔ خود اللہ رب العالمین کے اپنے گھر کے لیے ہے جسے اللہ نے آپ ہی مَثَابَۃً لِلنَّاسِ بنایا ہے اور تمام آفاق کے لوگوں کو اس کا گرویدہ کیا ہے (فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْ اِلَیْھِمْ) اس شوق کو کسی طرح بھی مشرکانہ نہیں کہا جا سکتا بلکہ بنیادی طور پر یہ ایک خدا پرستانہ شوق ہے اس لیے اسے شوق نامحمود قرار دے کر روک دینے اور دبا دینے کی فکر غیر ضروری ہے۔ مگر چونکہ ہمارے عوام دین کے علم اور دینی تربیت سے محروم ہیں اور حدود کو نہیں پہچانتے، اس لیے ایک جائز شوق بھی اگر ان کے اندر سیلاب کی طرح اٹھے اور آپ سے آپ اپنا راستہ نکالنا شروع کر دے تو بہت جلدی وہ غلط راستے پر پڑ سکتا ہے۔ ان سارے پہلوؤں پر غور کر کے میں نے یہ رائے قائم کی کہ عوام کی اس جائز اور فطری دلچسپی کو، جو میرے یا کسی کے بھڑکانے سے نہیں بھڑکی ہے بلکہ آپ سے آپ بھڑک اٹھی ہے، غلط رُخ پر جانے سے روکنے اور صحیح رُخ

پر ڈال دینے کی کوشش ناگزیر ہے، اگر میں ایسا نہ کروں گا تو یہ ایسا راستہ اختیار کرلے گی جو شرعی اعتبار سے بہت قابلِ اعتراض اور دین و اخلاق کے لیے بہت مضرت رساں ہوگا۔

یہی کچھ سوچ کر میں نے غلاف کی تیاری شروع ہوتے وقت معززین شہر کو جمع کیا اور سب کی رضامندی سے مختلف نمائندہ اصحاب کی ایک مجلس بنائی تاکہ شہر کے لوگوں کے جذبۂ شوق کی تسکین جائز حدود کے اندر رہ جاتے اور بے قاعدہ زیارتوں اور جلوسوں کی نوبت نہ آنے پاتے۔ اس مجلس میں حسبِ ذیل اصحاب شامل کیے گئے!

۱۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب (مولانا مفتی محمد حسن صاحب مرحوم و مغفور کے صاحبزادے اور جامعہ اشرفیہ کے نائب مہتمم، علمائے دیوبند کے گروہ سے)

۲۔ مفتی محمد حسین نعیمی صاحب (مہتمم جامعہ نعیمیہ، بریلوی گروہ کے علماء میں سے)

۳۔ مولانا حافظ کفایت حسین صاحب (شیعہ علماء میں سے)

۴۔ حاجی محمد اسحاق حنیف صاحب (ناظم نشر و اشاعت جمعیت اہل حدیث ان کا نام اس مجلس کی رکنیت کے لیے جناب مدیر الاعتصام نے خود تجویز کیا تھا)

۵۔ چودھری محمد حسین صاحب (وائس چیئرمین لاہور کارپوریشن)

۶۔ چودھری محمد امین صاحب (کونسلر لاہور کارپوریشن)

۷۔ محمد عمر خاں صاحب بسمل (ہیڈ ماسٹرز ایسوسی ایشن لاہور)

۸۔ نصراللہ شیخ صاحب (صدر پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین)

۹۔ حاجی محمد لطیف صاحب (صدر شاہ عالم مارکیٹ)

۱۰۔ شیخ تاج دین صاحب (صدر اعظم کلاتھ مارکیٹ ایسوسی ایشن)

۱۱۔ حاجی معراج دین صاحب (چیئرمین یونین کونسل شو مارکیٹ)

۱۲۔ ملک مبارک علی صاحب (چیئرمین یونین کمیٹی چوک وزیر خاں)

۱۳۔ شمشیر علی صاحب (لیڈیز اون چوائس، انارکلی)

۱۴۔ شیخ فرحت علی صاحب (فرحت علی جیولرز، مال روڈ)

۱۵۔ سیٹھ ولی بھائی صاحب (بمبئے کلاتھ ہاؤس، انارکلی)

۱۶۔ رانا اللہ داد خاں صاحب (راتا موٹرز، مال روڈ)

۱۷۔ عزیز الرحمٰن صاحب (سائنس ہاؤس، میکلیگن روڈ)

۱۸۔ جناب کوثر نیازی صاحب (ایڈیٹر شہاب)

اس پوری مجلس میں جماعت اسلامی کے صرف دو رکن شامل تھے۔ باقی سب مختلف گروہوں کے نمائندہ اور ذمہ دار اصحاب تھے۔ میں نے خود اپنے آپ کو اس میں سرے سے شامل ہی نہ کیا تھا۔ البتہ اس کے دو اجلاسوں میں ارکانِ مجلس کی خواہش پر شریک ضرور رہا تھا۔ ان مواقع پر ڈپٹی کمشنر لاہور، اسسٹنٹ کمشنر لاہور، اور ڈپٹی مجسٹریٹ لاہور بھی شریکِ اجلاس تھے۔ سب کے مشورے سے یہ پروگرام بنایا گیا کہ غلاف روانہ کرنے سے پہلے چار دن عورتوں کو اور تین دن مردوں کو اس کے دیکھنے کا موقع دیا جائے۔ اس نمائش میں عورتوں اور مردوں کو ہرگز خلط ملط نہ ہونے دیا جاتے۔ نمائش گاہ میں ایسے

کارکن (عورتوں کے لیے عورتیں اور مردوں کے لیے مرد) مقرر کیے جائیں جو لوگوں کو جائز شرعی حدود کی تلقین کرتے رہیں اور ناجائز افعال سے روکیں۔ نذرانے دینے سے بھی لوگوں کو منع کیا جائے اور انہیں ہدایت کی جائے کہ غلاف کو دیکھتے وقت بس اللہ کا ذکر کریں، کلمہ طیبہ اور درود پڑھیں، اور اللہ سے دعا کریں کہ اپنے اس گھر کی زیارت کا بھی شرف عطا فرمائے جس کا غلاف دیکھنے کی توفیق اس نے بخشی ہے۔ پھر غلاف روانہ کرتے وقت اسے جلوس کی شکل میں لے جایا جائے، (کیونکہ جلوس نکالا نہ گیا تو وہ خود نکل کر رہے گا اور بری طرح نکلے گا) مگر اس امر کا پورا اہتمام کیا جائے کہ جلوس کے پورے راستے سے فحش تصویریں ہٹا دی جائیں۔ گانوں کی ریکارڈنگ بند کر دی جائے تکبیر و تہلیل اور اللہ جل شانہٗ کی حمد کا غلغلہ اس زور سے بلند کیا جائے کہ سارا شہر اس سے گونج اٹھے اور اس جلوس میں عورتوں کو شریک ہونے سے منع کیا جائے۔

یہ تھا وہ پروگرام جو شہر لاہور کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد ہمیں ایک اور صورت حال سے سابقہ پیش آیا۔ وہ یہ تھی کہ غلاف کو دیکھنے کی تڑپ صرف لاہور شہر تک محدود نہ تھی بلکہ جگہ جگہ سے لوگ آکر اسے فیکٹری ہی میں دیکھ رہے تھے اور فیکٹری والوں کے لیے کام کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ پھر لوگوں نے کسی نہ کسی طرح فیکٹری والوں سے غلاف کے تھان حاصل کرنے شروع کر دیئے اور مختلف شہروں میں لے جاکر ان کے جلوس نکالے اور اپنے اپنے طریقوں پہ ان کی زیارت کرائی، مجھے اندیشہ ہوا کہ جس خرابی کو میں یہاں روکنا چاہتا

ہوں وہ پورے ملک میں پھیلے گی۔ یہ خطرہ بھی لاحق ہوا کہ اس طرح کہیں کچھ تھان ضائع نہ ہو جائیں۔ اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ باہر کے لوگوں کو بھی غلاف دکھانے کا باقاعدہ انتظام کر دیا جائے۔ چنانچہ پاکستان ویسٹرن ریلوے کے تعاون سے دو اسپیشل ٹرینوں کا انتظام کیا گیا۔ ان کے ساتھ بارہ بارہ ریلوے اسکاؤٹس، تین تین سول ڈیفنس کے رضاکار اور تین تین جماعت اسلامی کے کارکن بھیجے گئے۔ ان میں لاؤڈ سپیکر نصب کیے گئے۔ اور کارکنوں کو یہ ہدایات دی گئیں کہ جہاں بھی وہ لوگوں کو غلاف دکھانے کے لیے ٹھہریں وہاں پہنچتے ہی اللہ کے ذکر کا غلغلہ اس زور سے بلند کریں کہ کوئی دوسرا نعرہ اٹھنے ہی نہ پائے زائرین کو ہر طرح کے مشرکانہ افعال سے روکیں۔ عورتوں اور مردوں کو غلط ملط نہ ہونے دیں۔ نذرانے ڈالنے سے منع کریں۔ تنظیم کے ساتھ غلاف دکھائیں تاکہ حادثات رونما نہ ہوں۔ اور لوگوں کو سمجھائیں کہ یہ صرف ایک کپڑا ہے جو اللہ کے گھر کے لیے بنایا گیا ہے۔ اسے بس دیکھ لو اور اللہ سے دعا کرو کہ وہ اپنے گھر کی زیارت بھی نصیب کرے۔

واقعات کی اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کوئی ایسا پروگرام نہ تھا جو میں نے خود کسی اچھے یا بُرے مقصد سے شروع کیا ہو۔ بلکہ یہ پروگرام اس وقت بنایا گیا جب عوام میں ایک جذبہ خود بخود بھڑک اٹھا تھا اور اس کے بنانے کی اصل غرض یہ تھی کہ اس جذبے کے سیلاب کو منکرات کی طرف جانے اور صحیح راستے پر موڑنے کے لیے جو کچھ کیا جا سکتا ہے، کیا جائے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو یہ بہت زیادہ مکروہ راستہ اختیار کر لیتا اور کسی کے روکے

نہ رکتا۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے میں مختصراً یہ بھی بتاتے دیتا ہوں کہ فی الواقع ہوا کیا ہے اور اس کو بنا کیا دیا گیا ہے۔

لاہور شہر میں مجلسِ انتظامیہ کے زیرِ اہتمام غلاف کی نمائش چار دن عورتوں کے لیے اور تین دن مردوں کے لیے رہی اور ایک ایک دن مردوں اور عورتوں کے لیے علیحدہ علیحدہ نمائش کا انتظام لاہور چھاؤنی میں بھی کیا گیا۔ ان مواقع پر غلاف کو سجدہ کرنے، یا اس کا طواف کرنے کا کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ کارکنوں نے لوگوں کو حدودِ شرعیہ سمجھانے اور ان کی خلاف ورزی سے روکنے کی پوری کوشش کی۔ کسی قسم کے نذرانے اور چڑھاوے نہ چڑھانے دیئے گئے۔ بہت بڑی اکثریت نے کارکنوں کی تلقین کو قبول کیا اور حدود کی پابندی کی۔ لیکن جہاں ہزاروں لاکھوں آدمی ٹوٹ پڑے ہوں وہاں یہ ممکن نہ تھا کہ کسی شخص کو بھی حد سے تجاوز نہ کرنے دیا جاتے۔ اس سیلاب میں اگر کچھ لوگ منع کرنے کے باوجود غلاف کو چوم بیٹھے، یا کوئی بندۂ خدا غلاف ہی سے دعا مانگ بیٹھا یا مردوں کی نمائش میں کچھ عورتیں خود اپنے گھر والوں کے ساتھ آگئیں تو اسکی ذمہ داری آخر منتظمین پر کیسے عائد ہو جاتے گی۔

لاہور کا جلوس میں نے خود دیکھا ہے اور شروع سے آخر تک اس میں شریک رہا ہوں۔ ہوائی اڈے تک پہنچتے پہنچتے اس میں ۶-۷ لاکھ آدمی شامل ہو گئے تھے۔ اور آٹھ میل لمبا راستہ تھا۔ اس پورے راستے میں تمام سینماؤں اور دکانوں پر سے عورتوں کی تصاویر اور ہر قسم کی فحش تصویریں ہٹا دی گئی تھیں یا چھپا دی

گئی تھیں۔ ریڈیو پر گانوں کی تمام آوازیں بند ہو گئی تھیں۔ پورا جلوس اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ کے ذکر کے سوا کوئی چیز قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا اتنے بڑے ہجوم میں ایک جیب نہیں کٹی۔ کسی نے سگریٹ نہیں پیا۔ کوئی غنڈہ گردی کا واقعہ پیش نہیں آیا۔ عورتیں منع کرنے کے باوجود آئیں۔ مگر کوئی ادنیٰ سا واقعہ بھی عورتوں کو چھیڑنے کا سننے میں نہ آیا[1]۔ پورے شہر پر اس وقت نیکی کا اتنا غلبہ تھا کہ بعض لوگ جن کی جوتیاں مال روڈ پر جلوس میں چھوٹ گئی تھیں انہوں نے کئی گھنٹے بعد ہوائی اڈے سے واپس آکر اپنی جوتیاں اسی جگہ پڑی پائیں جہاں وہ چھوٹی تھیں۔ اتنی بڑی خیر میں اگر کہیں کوئی مشرکانہ یا مبتدعانہ بات ہو گئی تو وہ معترضین کی گرفت میں آ گئی۔ حالانکہ جہاں لاکھوں آدمی جمع ہوں وہاں کون اس امر کی ضمانت دے سکتا تھا کہ کوئی فرد بھی کوئی غلط کام نہ کرے گا چلتے ہوئے مجمع میں سے اگر کچھ لوگ لپک کر غلاف کو چوم بیٹھے، یا کچھ لوگوں نے غلط نعرے لگا دیتے، یا اور کوئی بیجا بات کر گزرے تو کیا صرف اس وجہ سے اس خیر عظیم پر پانی پھیر دیا جائے گا جو اتنے بڑے پیمانے پر اس روز شہر لاہور میں رونما ہوئی؟ یہ تو مکھی کا سا حال ہوا کہ ساری پاک چیزوں کو چھوڑ کر وہ صرف گندگی ہی تلاش کرتی ہے اور کہیں اس کی کوئی چھینٹ پا جائے تو اسی پر جا بیٹھتی ہے۔

---

[1] مجھ سے لاہور شہر کے ڈی ایس پی نے خود بیان کیا کہ اس جلوس میں جیب تراشی، غنڈہ گردی اور عورتوں کو چھیڑنے کا کوئی واقعہ ان کے نوٹس میں نہیں آیا ہے۔

جو اسپیشل ٹرینیں باہر بھیجی گئی تھیں ان کی مفصل رپورٹ بھی میں نے لی ہے اور صرف جماعت اسلامی کے کارکنوں ہی سے نہیں بلکہ سول ڈیفنس اور ریلوے اسکاؤٹس کے ان لوگوں سے بھی لی ہے جو ان ٹرینوں کے ساتھ گئے تھے[1]۔ ان کا متفقہ بیان ہے کہ جگہ جگہ ہزاروں، بلکہ بعض جگہ لاکھوں آدمی غلاف دیکھنے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ ہر جگہ ذکر اللہ ہی غالب رہا اور بہت کم دوسرے نعرے بلند ہو سکے۔ ہر جگہ عورتوں اور مردوں کے مجمعے الگ رہے اور بہت ہی کم مقامات پر ہجوم کی کثرت کے باعث انہیں خلط ملط ہونے سے نہ روکا جا سکا۔ ہر جگہ امن و سکون سے زیارت ہوئی اور بہت کم مقامات پر حادثات پیش آئے جن کی وجہ کسی کی غفلت نہ تھی بلکہ اژدحام کی شدت تھی۔ عورتیں کثرت سے آئیں، مگر شاذ و نادر ہی کہیں یہ واقعہ پیش آیا کہ کسی نے انہیں چھیڑا ہو۔ اتنے بڑے مجمعوں میں کسی کی جیب کٹنے کا کوئی واقعہ سننے میں نہیں آیا۔ عوام کو بڑے پیمانے پر نیکی اور بھلائی کی تلقین کی گئی اور انہیں غلاف کی زیارت کے حدود بتائے گئے۔ عموماً لوگوں نے ان حدود کا خیال رکھا اور زیادہ تر لوگ یہی دعا مانگتے دیکھے گئے کہ خدایا، جس گھر کا غلاف تو نے دکھایا ہے خود اس گھر کو بھی دیکھنے کی توفیق عطا فرما۔ ان ٹرینوں کے ساتھ جو غلاف گئے تھے

---

[1] اس رپورٹ کا خلاصہ "ایشیا" اور "شہاب" میں شائع ہو چکا ہے۔ میرے پیش نظر صرف وہ تحریری خلاصہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ بیانات بھی ہیں جو ان لوگوں نے فرداً فرداً میرے سامنے زبانی پیش کیے۔

ان میں سے کسی کا طواف ہرگز نہیں ہوا، اور نہ کسی کو غلاف کے آگے سجدہ کرتے دیکھا گیا۔ اب اگر کہیں ان لاکھوں انسانوں کے مجمع میں کوئی غلاف کو، یا غلاف لے جانے والی ٹرین کو چوم بیٹھا، یا کسی نے ٹرین کے انجن کو انجن شریف کہہ دیا۔ یا کارکنوں کے منع کرنے کے باوجود لوگوں نے ٹرین کے اندر پیسے پھینک دیتے یا ہجوم کی کثرت کے باعث عورتوں اور مردوں کو خلط ملط ہونے سے نہ روکا جاسکا تو بس یہی چند واقعات ہمارے دینداروں نے اعتراض جڑنے کے لیے چن لیے اور اس ساری خیر کو نظر انداز کر دیا جو اس کام میں غالب پائی جاتی تھی۔

پھر ان معترض حضرات نے محض کیڑے چُننے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ جہاں کیڑے نہ تھے وہاں اپنی طرف سے کیڑے ڈالنے میں بھی تامّل نہ فرمایا۔ مثلاً لاہور میں مجلس انتظامیہ کے علم و اجازت کے بغیر اُس محلّہ کے لوگوں نے، جس میں غلاف تیار کرنے والی فیکٹری قائم تھی، بطور خود غلاف کا جلوس نکال ڈالا تھا۔ اس جلوس کے متعلق بڑے بڑے اتقیاء وصلحاء یہ الزام لگا رہے ہیں کہ اس کے آگے باجا بج رہا تھا اور جلوس والوں نے غلاف کو لے جاکر حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر چڑھایا۔ حالانکہ یہ دوسری بات تو قطعی جھوٹ ہے۔ غلاف کو مزار پر چڑھانے کی روایت سرے سے کوئی اصلیت نہیں رکھتی۔ رہا باجا تو اس کے متعلق خبریں متضاد ہیں۔ کسی کا بیان ہے کہ بجا تھا، کسی کا کہنا ہے کہ نہیں بجا، اور کوئی کہتا ہے کہ جب جلوس گزر رہا تھا تو ایک برات آگئی جس کے ساتھ باجا تھا۔ تاہم اگر وہ بجا ہی ہو تب بھی اس کی کوئی ذمہ داری مجھ پر یا مجلس انتظامیہ پر عائد نہیں ہوتی۔ کیونکہ جلوس ہماری اجازت کے

بغیر، بلکہ ہمارے منع کرنے کے باوجود نکالا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہم کسی طرح بھی غلاف کو ان لوگوں سے نہ بچا سکتے تھے جن کے محلے میں وہ بن رہا تھا۔ الاّ یہ کہ ایک پولیس کا پہرہ فراہم کیا جاتا اور غلاف کے تھان وہاں سے اڑا کر نکالے جاتے!

عجیب تر بات یہ ہے کہ ان حضرات کو سارا غم صرف اُس غلاف کا ہے جو لاہور میں تیار ہوا تھا۔ کراچی میں جو غلاف بنا تھا، نمائش اس کی بھی ہوتی اور شہر در شہر وہ بھی پھرا، مگر اس کا ماتم کسی سے نہ سنا گیا۔ بلکہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا، وہ سب بھی ایسے سیاق و سباق میں بیان کیا گیا کہ وہ آپ سے آپ میرے اور جماعت اسلامی کے حساب میں پڑ گیا۔

یہ باتیں تو پھر بھی ظاہر سے تعلق رکھتی تھیں۔ کمال یہ ہے کہ ہمارے اِن دین داروں کی نگاہِ دُور رس میرے باطن تک بھی جا پہنچی اور انہیں معلوم ہو گیا کہ میں نے غلافِ کعبہ کی نمائش کا یہ سارا اہتمام کس نیت سے کیا تھا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ میری نیّت ان پر کیسے منکشف ہو گئی۔ اگر وہ علیمٌ بذات الصدور ہونے کے مدعی ہیں تو یہ اُس شرک و بدعت سے اشد چیز ہے جس پر وہ گرفت فرما رہے ہیں۔ اور اگر انہوں نے میری طرف یہ نیت محض قیاس و گمان کی بنا پر منسوب فرمائی ہے تو شاید انہیں قرآن و حدیث میں صرف شرک و بدعت ہی کی بُرائی ملی ہوگی۔ بہتان و افترا کے متعلق احکام ان کی نگاہ سے نہ گزرے ہوں گے۔

اس بیانِ واقعہ کے بعد اب میں ان اصولی سوالات کی طرف رجوع کرتا

ہوں جن پر روشنی ڈالنے کی خواہش محترم سائل نے ظاہر فرمائی ہے۔

۱۔ شعائر اللہ کے لفظ کا اطلاق صرف انہی چیزوں پر نہیں ہوتا جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ استعمال فرمایا ہے، بلکہ ہر وہ چیز جو خدا پرستی کی علامت ہو، شعائر اللہ میں شمار کی جا سکتی ہے۔ اور جس چیز کو بھی اللہ جل شانہٗ کے حضور ہدیہ کرنے کی نیت کر لی جاتے اس کا احترام بجا و درست ہے۔ یہ احترام اُس شے کا نہیں بلکہ اُس خدا کا ہے جس کے لیے اسے مخصوص کرنے کی نیت کی گئی ہے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر کے لیے اگر پتھر اور لکڑی بھی جمع کی جاتے، اور لوگ اسے ادب و احترام کے ساتھ اٹھائیں اور اسے اٹھاتے اور لے جاتے اور تعمیر کی خدمت انجام دیتے وقت با وضو ہونے اور اللہ کا ذکر کرنے کا اہتمام کریں، تو آخر یہ چیز قابلِ اعتراض کس بنیاد پر ہو گی؟ البتہ جو شخص ان حدود سے تجاوز کر کے انہی چیزوں کا طواف، یا ان کی طرف رُخ کر کے سجدہ کرنے لگے یا ان سے دعا و استعانت کرنے لگے تو یہ بلا شبہ شرک ہو گا۔

۲۔ کسی فعل کو بدعتِ مذمومہ قرار دینے کے لیے صرف یہی بات کافی نہیں ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں نہ ہوا تھا۔ لغت کے اعتبار سے تو ضرور ہر نیا کام بدعت ہے۔ مگر شریعت کی اصطلاح میں جس بدعت کو ضلالت قرار دیا گیا ہے اس سے مراد وہ نیا کام ہے جس کے لیے شرع میں کوئی دلیل نہ ہو، جو شریعت کے کسی قاعدے یا حکم سے متصادم ہو، جس سے کوئی ایسا فائدہ حاصل کرنا یا کوئی ایسی مضرّت رفع کرنا متصوّر نہ ہو جس کا شریعت میں اعتبار کیا گیا ہے، جس کا نکالنے والا اسے خود اپنے

اوپر یا دوسروں پر اس ادعا کے ساتھ لازم کرلے کہ اس کا التزام نہ کرنا گناہ اور کرنا فرض ہے۔ یہ صورت اگر نہ ہو تو مجرّد اس دلیل کی بنا پر کہ فلاں کام حضور کے زمانے میں نہیں ہوا، اسے "بدعت" یعنی ضلالت نہیں کہا جا سکتا۔ بخاری نے کتاب الجمعہ میں چار حدیثیں نقل کی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ عہدِ رسالت اور عہدِ شیخین میں جمعہ کی صرف ایک اذان ہوتی تھی، حضرت عثمان نے اپنے دور میں ایک اذان کا اور اضافہ کر دیا۔ لیکن اسے بدعتِ ضلالت کسی نے بھی قرار نہیں دیا بلکہ تمام امت نے اس نئی بات کو قبول کر لیا۔ بخلاف اس کے انہی حضرت عثمان نے منیٰ میں قصر کرنے کے بجائے پوری نماز پڑھی تو اس پر اعتراض کیا گیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمر صلوٰۃ ضحیٰ کے لیے خود بدعت اور احداث کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ انھا لمن احسن ما احدثوا (یہ ان بہترین نئے کاموں میں سے ہے جو لوگوں نے نکال لیے ہیں) بدعۃ ونعمت البدعۃ (بدعت ہے اور اچھی بدعت ہے) ما احدث الناس شیئا احب الی منھا (لوگوں نے کوئی ایسا نیا کام نہیں کیا ہے جو مجھے اس سے زیادہ پسند ہو۔ حضرت عمرؓ نے تراویح کے بارے میں وہ طریقہ جاری کیا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں نہ تھا۔ وہ خود اسے نیا کام کہتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں۔ نعمت البدعۃ ھٰذہٖ (یہ اچھا نیا کام ہے۔) اس سے معلوم ہوا کہ مجرد نیا کام ہونے سے کوئی فعل بدعت مذمومہ نہیں بن جاتا بلکہ اُسے بدعت مذمومہ بنانے کے لیے کچھ شرائط ہیں۔

امام نووی شرح مسلم (کتاب الجمعہ) میں کل بدعۃ ضلالۃ کی تشریح

کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ علماء نے کہا ہے کہ بدعت (یعنی باعتبارِ لغت نئے کام) کی پانچ قسمیں ہیں۔ ایک بدعت واجب ہے۔ دوسری بدعت مندوب ہے (یعنی پسندیدہ) ہے جسے کرنا شریعت میں مطلوب ہے۔ تیسری بدعت حرام ہے۔ چوتھی مکروہ ہے اور پانچویں مباح ہے۔ اور ہمارے اس قول کی تائید حضرت عمرؓ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے جو انہوں نے نماز تراویح کے بارے میں فرمایا"۔

علامہ عینی عمدۃ القاری (کتاب الجمعہ) میں عبد بن حمید کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ "جب مدینہ کی آبادی بڑھ گئی اور دُور دُور مکان بن گئے تو حضرت عثمان نے تیسری اذان کا (یعنی اس اذان کا جواب جمعہ کے روز سب سے پہلے دی جاتی ہے) حکم دیا اور اس پر کسی نے اعتراض نہ کیا، مگر منیٰ میں پوری نماز پڑھنے پر اعتراض کیا گیا"۔

علامہ ابن حجر فتح الباری (کتاب التراویح) میں حضرت عمرؓ کے قول نعمت البدعۃ ھٰذہٖ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہیں۔ "بدعت ہر اس نئے کام کو کہتے ہیں جو کسی مثالِ سابق کے بغیر کیا گیا ہو۔ مگر شریعت میں یہ لفظ سنت کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے اور اسی بنا پر بدعت کو مذموم کہا جاتا ہے۔ اور تحقیق یہ ہے کہ جو نیا کام شرعاً مستحسن کی تعریف میں آتا ہو وہ اچھا ہے، اور جو شرعاً بُرے کام کی تعریف میں آتا ہو وہ بُرا، ورنہ پھر مباح کی قسم میں سے ہے"۔

اس اصولی وضاحت کے بعد اب میں عرض کرتا ہوں کہ غلاف کے کپڑے کا جلوس نکالنا اور اس کی نمائش کا انتظام کرنا بلاشبہ ایک نیا کام تھا جو

عہدِ رسالت اور زمانہ خلافتِ راشدہ میں نہیں ہوا۔ مگر میں نے یہ کام اس بنا پر نہیں کیا کہ میں اصلاً اس کی نمائش کرنا چاہتا تھا اور اسے دھوم دھام کے ساتھ بھیجنا ابتدا ہی سے میری اسکیم میں شامل تھا۔ بلکہ میں نے یہ پروگرام اس وقت بنایا جب سارے ملک میں اس کے لیے عوام کے اندر بے پناہ جذبہ شوق خود بخود بھڑک اٹھا اور مجھے اندیشہ ہوا کہ یہ شوق اگر خود اپنا راستہ نکالے گا تو بڑے پیمانے پر گمراہی پھیلنے کا موجب بن جائے گا۔ (چنانچہ جہاں جہاں بھی اس نے موقع پاکر خود اپنا راستہ نکالا بہت بری طرح نکالا) اس لیے میں نے اُس مضرت کو دفع کرنے کی خاطر یہ کام کیا جو شریعت کی نگاہ میں ایک بڑی مضرت تھی۔ اس کے لیے ایسا طریقہ تجویز کیا جس سے لوگوں کے جذبات کا سیلاب حدودِ شرع کے اندر محدود رہ سکے۔ اس کو سیئات کے بجائے ان حسنات کی طرف موڑنے کی کوشش کی جو شرعاً پسندیدہ ہیں۔ میرا ہرگز یہ دعویٰ نہ تھا کہ لوگوں کو ضرور غلاف دیکھنا اور اس کے جلوس میں شامل ہونا چاہیے، نہ آئیں گے تو گنہگار ہوں گے، اور آئیں گے تو یہ اور یہ اجر ملے گا۔ اور میرا یہ ارادہ بھی نہیں ہے کہ آئندہ اگر پاکستان ہی میں غلاف بننے لگے اور اس سے میرا کوئی تعلق ہو تو اس کی زیارت کے اہتمام اور جلوسوں کے انتظام کو ایک مستقل طریقہ بنالوں۔ اب میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کس فقہی قاعدے سے میں بدعتِ ضلالت کا مرتکب ہوا ہوں۔ اگر سب و شتم کے بجائے کوئی صاحب دلائل سے مجھے بتا دیں کہ پھر بھی یہ بدعتِ ضلالت ہی ہے تو مجھے نادم اور تائب ہونے میں ذرہ برابر تامّل نہ ہوگا۔ الحمد اللہ، میں منکر نہیں ہوں کہ گناہ کو گناہ جان لینے کے بعد بھی

اپنی بات کی پچ میں اس پر اصرار کروں۔

۳۔ کوئی کپڑا خواہ کعبے پر چڑھایا گیا ہو، یا چڑھنے کے لیے تیار کیا گیا ہو دونوں صورتوں میں وہ ایسا متبرک نہیں ہو جاتا کہ اس سے برکت حاصل کرنے کے لیے اس کو چھوا جاتے، چوما جاتے، اس کی زیارت کی ادر کرائی جاتے اور اسے دھوم دھام سے روانہ کیا جائے۔ بلکہ فقہا نے کعبے پر سے اترے ہوئے غلاف سے بھی لباس بنانے کو جائز قرار دیا ہے، بشرطیکہ اس پر کلمہ طیبہ، یا آیات قرآنی یا اسمائے الٰہی لکھے ہوتے نہ ہوں۔ لیکن اگر لوگ اس بنا پر اس کا از خود (نہ کہ کسی شرعی حکم اور فتوے کی حیثیت سے) احترام کریں کہ یہ اللہ کے گھر کے لیے جا رہا ہے، یا وہاں سے اتر کر آیا ہے، تو اس احترام کو ناروا بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو اس نسبت کا احترام ہے جو اسے اللہ کے گھر سے حاصل ہو گئی ہے۔ اس احترام کے لیے اللہ کی عظمت و محبت کے سوا کوئی دوسرا محرک نہیں ہے۔ اس احترام کو کوئی شخص واجب اور کسی خاص شکل کو لازم قرار دے تو غلط ہے۔ لیکن کوئی اسے مذموم ٹھہرائے اور خواہ مخواہ شرک قرار دے تو یہ بھی زیادتی ہے۔ رہی اس کی زیارت اور اس کے لیے جلوس کا اہتمام، تو وہ جس بنا پر کیا گیا اس کی وضاحت میں اوپر کر چکا ہوں۔

(ترجمان القرآن جلد ۶۰، عدد ۱۔ اپریل ۱۹۶۳ء)

امر بالمعروف کا فریضہ کیسے انجام دیا جاتے؟

سوال:- امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلے میں ایک عرصے سے پریشان ہوں۔ نہی عن المنکر کے متعلق جب میں احکام کی شدت کو دیکھتی ہوں اور دوسری طرف دنیا میں منکر کا جو حال ہے اور جتنی کثرت ہے اس کا خیال کرتی ہوں تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان احکام پر کیسے عمل کیا جائے اگر برائی کو دیکھ کر خاموش رہنے کے بجائے زبان سے منع کرنا مطلوب ہو (کیونکہ ہاتھ سے نہ سہی مگر زبان سے کہنے کی قدرت سوائے شاذ صورتوں کے ہوتی ہی ہے) تو پھر تو انسان ہر وقت اسی کام میں رہے کیونکہ منکر سے تو کوئی جگہ خالی ہی نہیں ہوتی۔ لیکن بڑی رکاوٹ اس کام میں یہ ہوتی ہے کہ جس کو منع کیا جائے وہ کبھی اپنی خیر خواہی پر محمول نہیں کرتا بلکہ الٹا اسے ناگوار ہوتا ہے۔ میرا تجربہ تو یہی ہے کہ چاہے کسی کو کتنے ہی نرم الفاظ میں اور خیر خواہانہ انداز میں منع کیا جائے مگر وہ اس کو کبھی پسند نہیں کرتا بلکہ کوئی تو بہت بے توجہی برتے گا، کوئی کچھ الٹا ہی جواب دے گا، اور اگر کسی نے بہت لحاظ کیا تو سُن کر چپ ہو رہا۔ مگر ناگوار اسے بھی گزرتا ہے اور اثر کچھ نہیں ہوتا۔

مثلاً ہم راہ چلتے ہیں کسی عورت کو بے پردہ دیکھتے ہیں تو اگر اس

کو سر راہ ہی منع نہ کیا جائے تو دوسرا کونسا موقع ہمیں ایک ناواقف عورت کو سمجھانے کا مل سکے گا۔ کیا راستے میں روک کر سمجھانا آپ کے نزدیک مناسب ہے؟ اسی طرح جس عورت کا چال چلن درست نہ ہو اس کو کیسے نصیحت کی جائے؟ چاہے کوئی عورت کتنی ہی رسوائے زمانہ ہو لیکن نصیحت کرو تو بُرا مانے گی۔ اگر درس یا اجتماع میں بلایا جائے تو کبھی نہیں آئے گی۔ پھر ان کے معاملہ میں اس فریضہ کو ادا کرنے کی صورت کیا ہو؟ آخر میں اس بارے میں بھی آگاہ فرمائیں کہ عورت کے لیے کیا مردوں پر تبلیغ کرنا بھی ضروری ہے

جواب: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم عام ہے۔ مگر اس پر عمل کرنے میں آدمی کو حکمت ملحوظ رکھنی چاہیئے۔ موقع و محل کو دیکھے بغیر ہر جگہ ایک ہی لگے بندھے طریقے سے اس کام کو کرنے سے بعض اوقات الٹا اثر ہوتا ہے۔ میرے لیے اس کا کوئی ایسا طریقہ بتا دینا مشکل ہے جس پر آپ آنکھیں بند کر کے عمل کر سکیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ خود آہستہ آہستہ اپنے تجربات سے سبق حاصل کریں اور رفتہ رفتہ اپنے اندر اتنی حکمت پیدا کریں کہ ہر موقع اور ہر آدمی اور ہر حالت کو سمجھ کر امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کی خدمت انجام دینے کا ایک مناسب طریقہ اختیار کر سکیں۔ اس کام میں اوّل اوّل آپ سے بھی غلطیاں ہوں گی، اور بعض مواقع پر غلطی آپ کی نہ ہو گی مگر دوسرے شخص کی طرف سے جواب نامناسب ہو گا۔ لیکن یہی تجربات آپ کو صحیح طریقہ سکھاتے چلے جائیں گے۔ بشرطیکہ آپ بددل ہو کر اس

کام کو چھوڑ نہ دیں، اور ہر تجربے کے بعد غور کریں کہ اس میں اگر آپ سے کوئی غلطی ہوتی ہے تو وہ کیا ہے اور دوسرے نے اگر ضد یا ہٹ دھرمی سے کام لیا ہے تو اُسے راہ راست پر لانے کا بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے یہ بھی خیال رکھیے کہ یہ کام بڑا صبر چاہتا ہے۔ جہاں آپ برائی دیکھیں اور محسوس ہو کہ اس وقت اس پر ٹوکنا مناسب نہیں ہے ٹوٹال جائیے اور دوسرا کوئی مناسب موقع اس کے لیے تلاش کرتی رہیے۔ اس کے علاوہ ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جس جگہ ایسی کوئی برائی ہو کہ اس کو ٹوکنا آپ کے لیے مشکل ہو تو وہاں سے ہٹ جائیے، اور اگر کوئی صحبت یا تقریب اس قسم کی ہو تو اس سے الگ رہیے۔ ایسے مواقع پر لوگ بالعموم خود آپ کی علیحدگی کی وجہ پوچھیں گے۔ اس وقت آپ کو یہ موقع مل جائے گا کہ بڑی نرمی کیساتھ وجہ بیان کر دیں اور یہ کہہ دیں کہ آپ لوگوں کو روکنا تو میرے بس میں نہیں ہے مگر احکام خدا اور رسول کی خلاف ورزی میں شریک ہونے کی جرأت بھی میرے اندر نہیں ہے۔

آپ نے چند متعین امور کے متعلق بھی سوال کیا ہے۔ ان کا جواب یہ ہے کہ راہ چلتی عورتیں اگر بے پردہ ہوں تو ان کو وہیں روک کر سمجھانا مناسب نہیں ہے۔ یہ ایک عام مصیبت ہے جس کا انفرادی حل اب ممکن نہیں رہا ہے۔ اس کو تو اب اجتماعی اصلاح کی تدابیر ہی سے درست کیا جا سکتا ہے آپ کا کام یہ ہے کہ جن عورتوں سے آپ کی واقفیت ہے اور وہ بے پردگی کے مرض میں مبتلا ہیں ان تک احکام خدا و رسول پہنچانے کی کوشش کریں۔

جس عورت کا چلن خراب ہو اسے سمجھانے کا ایسا طریقہ اختیار کیجئے جس سے اس کو یہ شبہ لاحق نہ ہو کہ آپ اسے بد چلن قرار دے رہی ہیں۔ نیز اسے بد چلنی کے خلاف وعظ سنانے کے بجائے پہلے اس کے دل میں ایمان اور خدا کا خوف اور آخرت کی جواب دہی کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کریں اجتماع میں وہ نہ آئے تو کوئی تقریب ایسی پیدا کریں جس میں وہ شریک ہو اور اس وقت قیامت اور آخرت اور جنت اور دوزخ کی باتیں کریں، اور اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا احساس دلائیں۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے حکم کا خطاب عورتوں اور مردوں سب کے لیے یکساں ہے، مگر عورتوں کو اپنے دائرے میں ہی یہ فرض انجام دینا چاہیئے۔ ان کے مخاطب وہ مرد ضرور ہو سکتے ہیں جو ان کے رشتہ دار ہوں اور جن سے ملنا جلنا، بات چیت کرنا ان کے لیے ممکن ہو۔ عام مردوں کو نصیحت کرنا ان کا فرض نہیں ہے الّا یہ کہ وہ شائع ہونے والی تحریروں کی شکل میں یہ خدمت انجام دیں۔

(ترجمان القرآن جلد ۶۰، عدد ۳۔ جون ۱۹۶۳ء)

حجرِ اسود اور خانہ کعبہ کے متعلق غیر مسلموں کی غلط فہمیاں

سوال: یہاں (اسلامک کلچر سنٹر لندن میں) چند انگریز لڑکیاں جمعہ کے روز آتی ہوتی تھیں۔ بڑے غور سے نماز کو دیکھتی رہیں۔ بعد میں انہوں نے ہم سے سوال کیا کہ آپ لوگ جنوب مشرق کی طرف منہ کر کے کیوں نماز پڑھتے ہیں؟ کسی اور طرف کیوں نہیں کرتے؟ کعبہ کو کیوں اہمیت دیتے ہیں؟ سنگ اسود کو کیوں چومتے ہیں؟ وہ بھی تو ایک پتھر ہے جیسے دوسرے پتھر۔ اس طرح تو یہ بھی ہندوؤں ہی کی طرح بت پرستی ہو گئی۔ وہ سامنے بت رکھ کر پوجتے ہیں اور مسلمان اس کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتے ہیں۔ ہم انہیں تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ براہ کرم ہمیں اس کے متعلق کچھ بتائیں تاکہ پھر ایسا کوئی موقع آئے تو ہم معترضین کو سمجھا سکیں۔

جواب: قریب قریب اسی مضمون کے متعدد سوالات ہندوستان کے مختلف حصوں سے بھی حال میں ہمارے پاس آتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ آج کل جگہ جگہ یہ سوال مسلمانوں کے سامنے چھیڑا جا رہا ہے۔ ان معترضین میں کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جن کا مقصد کسی نہ کسی طرح اسلام پر اعتراض جڑنا ہوتا ہے اور دنیا میں کوئی جواب بھی ان کے لیے تسلی بخش نہیں ہو سکتا۔ البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے دلوں میں حقیقتِ حال سے

ناواقفیت کی بنا پر نیک نیتی کے ساتھ شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے یہ بات بالکل کافی ہے کہ آپ انہیں معقولیت کے ساتھ حقیقت سے آگاہ کر دیں۔

بت پرستی کی حقیقت یہ ہے کہ مشرکین کے مختلف گروہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بعض دوسری ہستیوں کو بھی خدائی کی صفات اور اختیارات کا حامل سمجھتے ہیں، یا یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر حلول کیا ہے، اور اس غلط عقیدے کی بنا پر وہ ان ہستیوں کے مجسمے اور آستانے بنا کر ان کے آگے عبادت کے مراسم ادا کرتے ہیں۔ خود اللہ تعالیٰ کا بُت آج تک کسی مشرک قوم نے نہیں بنایا ہے اور نہ اس کی پرستش کے لیے کبھی یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اس کی کوئی خیالی شکل تیار کر کے اس کے آگے سر بسجود ہوں۔ دنیا کے تمام مشرکین قریب قریب صاف طور پر یہ سمجھتے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شکل و صورت سے منزہ ہے۔ اس کا اور دوسرے معبودوں کا فرق اُن کے عقائد اور مذہبی مراسم میں نمایاں طریقہ سے تسلیم کیا گیا ہے۔ اسی لیے بُت صرف دوسرے معبودوں ہی کے بنائے گئے ہیں۔ اللہ کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔

بُت پرستی کی اس حقیقت کو جو شخص اچھی طرح سمجھ لے گا وہ اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا کہ مسلمانوں کا نماز میں خانۂ کعبہ کی طرف رخ کرنا، یا حج میں کعبے کا طواف کرنا اور حجر اسود کو چومنا بت پرستی سے کوئی ادنیٰ اسی وجہ مماثلت بھی رکھتا ہے۔ اسلام خالص توحیدی مذہب ہے جو اللہ کے سوا سرے سے کسی کو معبود ہی نہیں مانتا اور نہ اس بات کا قائل ہے کہ اللہ نے کسی کے

اندر حلول کیا ہے، یا وہ کسی مادی مخلوق کی شکل میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ خانہ کعبہ کو اگر غیر مسلموں نے نہیں دیکھا ہے تو اس کی تصویریں تو بہر حال انہوں نے دیکھی ہی ہیں۔ کیا وہ راست بازی کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بُت ہے جس کی ہم پرستش کر رہے ہیں؟ کیا کوئی شخص بدرستی ہوش و حواس یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ چوکور عمارت اللہ رب العالمین کی شکل پر بنائی گئی ہے؟ رہا حجر اسود تو وہ ایک چھوٹا سا پتھر ہے جو خانہ کعبہ کی چار دیواری کے ایک کونے میں قدِ آدم کے برابر بلندی پر لگا ہوا ہے۔ مسلمان اس کی طرف رخ کر کے سجدہ نہیں کرتے، بلکہ خانہ کعبہ کا طواف اس مقام سے شروع کر کے اسی مقام پر ختم کرتے ہیں، اور ہر طواف اسے بوسہ دے کر یا اس کی طرف اشارہ کر کے شروع کرتے ہیں۔ اس کا آخر بُت پرستی سے کیا تعلق ہے؟

اب رہی یہ بات کہ دنیا بھر کے مسلمان خانہ کعبہ ہی کی طرف رُخ کر کے کیوں نماز پڑھتے ہیں۔ تو اس کا سیدھا سا جواب دیا ہے کہ یہ مرکزیت اور تنظیم کی خاطر ہے۔ اگر تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک مرکز اور ایک رُخ متعین نہ کر دیا گیا ہوتا تو ہر نماز کے وقت عجیب افراتفری برپا ہوتی۔ انفرادی نمازیں ادا کرتے وقت ایک مسلمان کا منہ مغرب کی طرف ہوتا تو دوسرے کا مشرق کی طرف، تیسرے کا شمال کی طرف اور چوتھے کا مغرب کی طرف۔ اور جب مسلمان نماز با جماعت کے لیے کھڑے ہوتے تو ہر مسجد میں ہر نماز سے پہلے اس بات پہ ایک کانفرنس ہوتی کہ آج کس طرف رُخ کر کے نماز پڑھی جائے۔ یہی نہیں بلکہ ہر مسجد کی تعمیر کے وقت ہر محلے میں یہ جھگڑا برپا ہوتا کہ مسجد کا

رُخ کس طرف ہو! اللہ تعالیٰ نے ان سارے امکانات کو ایک قبلہ مقرر کر کے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ اور قبلہ اسی جگہ کو بنایا جسے فطرۃً مرکزیت حاصل ہونی چاہیے تھی، کیونکہ خداپرستی کی یہ تحریک اسی جگہ سے شروع ہوتی تھی، اور خدائے واحد کی پرستش کے لیے دنیا میں سب سے پہلا معبد وہی بنایا گیا تھا

(ترجمان القرآن جلد ۶۱، عدد ۲۔ نومبر ۱۹۶۳ء)

معاشی مسائل

معاشی مسائل سے متعلق چند عملی سوالات

سود کے بغیر معاشی تعمیر:

سوال:۔ موجودہ زمانہ میں جب کہ تجارتی کاروبار بلکہ پوری معاشی زندگی سود کے بل پر چل رہی ہے اور اس کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس میں سود رچ بس نہ گیا ہو، کیا سود کا استیصال عملاً ممکن ہے؟ کیا سود کو ختم کرکے غیر سودی بنیادوں پر معاشی تعمیر ہو سکتی ہے؟

جواب:۔ اگر کوئی مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ سود ایک ناگزیر شے ہے اور موجودہ زمانے میں اس کے بغیر کوئی کام ہی نہیں چل سکتا، تو میرے نزدیک اس کا یہ خیال بالکل باطل ہے۔ یہ خیال نہ صرف اصولاً غلط ہے بلکہ یہ اُس خدا کے بارے میں سوئے ظن ہے جس کے بارے میں ہمارا ایمان ہے کہ اُس نے کسی ایسی چیز سے ہمیں نہیں روکا ہے جو انسانی زندگی کے لیے ناگزیر ہو اور جس کے بغیر دنیوی کاروبار چل ہی نہ سکتا ہو۔ لیکن میں صرف اتنا ہی جواب دینے پر اکتفا نہیں کروں گا بلکہ یہ عرض کروں گا کہ خود موجودہ دور میں معاشی اصول و نظریات بھی اس طرف جا رہے ہیں کہ سود کی شرح کو کم سے کم حتیٰ کہ صفر کی حد تک پہنچا کر اسے ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اکثر ممالک میں شرح سود تیز رفتاری سے گر رہی ہے اور دنیا اس مقام کے قریب تر پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے جہاں سود سے نجات حاصل کی جا سکتی

ہے۔ مجھے یہاں اس بارے میں تفصیلی بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں اپنی کتاب "سود" میں اس موضوع پر مفصل بحث کر چکا ہوں۔

البتہ میں یہاں مختصراً یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ایک اسلامی حکومت اس مسئلے کو عملاً کیسے حل کر سکتی ہے۔ میرے نزدیک اس کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ملک کے اندر سود کو بند کر دیا جائے۔ اس کے بعد دوسرے قدم کے طور پر بیرونی تجارت میں سود ختم کرنے کے لیے جدوجہد کی جائے۔ ملک کے اندر حکومت سودی لین دین کو قانوناً ناجائز قرار دے اور خود بھی سود کا لینا اور دینا ترک کر دے۔ کوئی عدالت سود کی ڈگری نہ دے۔ کوئی شخص اگر سودی کاروبار کرے تو اسے فوجداری جرم کا مجرم گردانا جائے۔ جب تک آغاز ہی میں ایسے فیصلہ کن اقدامات نہیں کیے جائیں گے، اس امر کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں پیدا ہو سکے گا کہ کوئی ایسا مالیاتی نظام قائم ہو جو سود سے خالی ہو۔ اس حقیقت کو مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک حکومت اگر ایک طرف ریل کے سفر کے لیے ٹکٹ کو ضروری قرار دے دے اور دوسری طرف بغیر ٹکٹ کے سفر کے لیے بھی گنجائش باقی رہنے دے تو ٹکٹ لینے والے مسافر تھوڑے ہی نکلیں گے۔ لیکن اگر بلا ٹکٹ کا سفر فوجداری جرم ہو تو کوئی آدمی جو ٹکٹ نہیں لیتا ریل میں جانے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح جب تک ہمارے ملک میں سود قانوناً حلال ہے، جب تک سودی لین دین کی اجازت ہے، جب تک ہماری حکومت خود سود لیتی اور دیتی ہے، جب تک ہماری عدالتیں سود کی ڈگریاں نافذ کرتی ہیں، اس وقت تک اس بات کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے

کہ حکومت یا کوئی دوسرا ادارہ کوئی ایسا بینکنگ سسٹم چلانے میں کامیاب ہو جو سود خواری کے بجائے حصہ داری کے اصولوں پر قائم کیا گیا ہو۔ البتہ اگر سودی بنک کاری کو پہلے قانوناً حرام کر دیا جائے تو ہمیں پوری توقع ہے کہ حصہ داری کے اصول پر ایسا سسٹم نشوونما پا سکتا ہے۔ حصہ داری سے ہماری مراد یہ ہے کہ نفع و نقصان میں تمام حصہ دار برابر کے شریک ہوں۔ داخلی طور پر سودی بندش کے بعد خارجی لین دین میں بھی اس سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے انشاء اللہ کسی لڑائی جھگڑے کی نوبت نہیں آئے گی بلکہ دوستانہ طریق پر تجارتی تعلقات قائم رکھتے ہوئے بھی دوسرے ممالک کو اس پر رضامند کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی حکومت اور قومی ملکیت:

سوال:۔ اسلامی حکومت کی نیشنلائزیشن (Nationalisation) کے بارے میں کیا پالیسی ہونی چاہیئے؟

جواب:۔ میں نے جہاں تک اس مسئلے کا اسلام کی روشنی میں مطالعہ کیا ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلام ذرائع پیداوار کو قومی بنانے کے پروگرام کو بطور اصول کے اختیار نہیں کرتا۔ یہ چیز اسلام کے سارے اجتماعی نظام کے مزاج کے خلاف ہے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے کسی ملک یا ریاست کے معاشی مسائل کا یہ صحیح حل نہیں ہے کہ سارے وسائل پیدائش کو قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ البتہ کسی صنعتی یا تجارتی شعبے کے بارے میں اگر تجربے سے معلوم ہو کہ اسے شخصی تحویل میں رکھ

کر فروغ دینا ممکن ہی نہیں ہے، تو ایسی صورت میں اسے ریاست کے کنٹرول میں لیا جا سکتا ہے۔

اسلامی حکومت اور فرض ناشناس ملازمین

سوال:- موجودہ ملازمین کی ایک بڑی تعداد میں بلندی سیرت اور فرض شناسی کا جذبہ ہی کم ہے، ایک اسلامی حکومت ان سے کیوں کر کام لے گی۔

جواب:- اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حکومت کے ملازمین اور قوم کے بعض دوسرے افراد کی اخلاقی حالت نے پوری قومی زندگی کو بالکل کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ ایک بڑا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ مختصر یہ ہے کہ سب سے پہلے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اخلاقی جرائم لازمی طور پر خدا سے بے خوفی اور آخرت سے بے فکری کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ تو خرابی کا بنیادی سبب ہے لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اسباب ہیں جو ہماری معاشرتی زندگی میں پائے جاتے ہیں اور جن کی وجہ سے یہ خرابیاں چاروں طرف پھیل رہی ہیں مثلاً ہمارے معاشرے کے اُوپر کے طبقے نے نہایت ہی عیاشانہ اور مسرفانہ زندگی اختیار کر رکھی ہے۔ اس طبقے کی ضروریات صرف کھانے پینے، رہنے سہنے اور بچوں کی تعلیم کی حد تک محدود نہیں ہیں بلکہ انہیں ہزاروں روپے بعض دیگر مشاغل کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ جو لوگ ملک کا نظام چلا رہے ہیں ان کا تعلق بھی اسی طبقے سے ہے۔ قاعدے کی بات ہے کہ اُوپر والوں کے عملی نمونے نیچے والوں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ متوسط طبقہ اُوپر والے طبقے کا اثر قبول کرتا ہے

اور متوسط طبقے سے پھر ادنیٰ اور فروتر درجے کے لوگ اثر پذیر ہوتے ہیں۔ یہ متوسط اور بالکل نچلے طبقے کے لوگ تو ایک طرح سے اپنے آپ کو مجبور سمجھتے ہیں کہ وہ اپنا معیارِ زندگی قائم رکھنے کے لیے ہر طرح کے جائز و ناجائز ذرائع استعمال کریں۔

اب اگر آپ اس سارے مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں تو آپ ہرگز یہ توقع نہ رکھیں کہ صرف ایک طبقے کی اصلاح سے اور وہ بھی قانون کے بل پر یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس بیماری کی جڑیں معاشرے کی رگ رگ میں پھیل چکی ہیں۔ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ وہ معاشرتی خرابیوں کو رفع کرنے کے لیے صرف قوانین پر انحصار نہیں کرتا۔ بلکہ وہ خرابی پر ہر پہلو سے اور زندگی کے ہر شعبہ سے حملہ آور ہوتا ہے۔ وہ تعلیم و تربیت کے ذریعے سے، تبلیغ و تلقین کے ذریعے سے اصلاح اور انسدادی تدابیر کے ذریعے سے اور ساتھ ہی قانون کے زور واثر سے برائی کو مٹاتا ہے۔ ایک اسلامی حکومت کو معاشرے کی اصلاح کے لیے یہ سارے کام کرنے ہوں گے۔ تعلیم گاہوں، نشرگاہوں، اخبارات اور پراپیگنڈے کی ساری طاقتوں کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنا ہوگا۔ پھر سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ عملاً ان اسباب کو رفع کیا جائے جو اُوپر والے طبقے کو اسراف پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس طبقے کے جو لوگ اونچی ملازمتوں میں ہیں ان کی تنخواہیں بڑھانے کے بجائے گھٹانے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بیش قرار تنخواہیں ہی ان کی فضول خرچیوں کا اصل باعث ہیں۔ نچلے درجے کے ملازمین کی تنخواہوں میں اضافے کی ضرورت ہے، کیونکہ بسا اوقات حقیقی ضروریات کی فراہمی

ہی انہیں بدعنوانیوں پر مجبور کرتی ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ ادنیٰ اور اوسط درجے کے ملازمین کی کثیر تعداد یہ چاہتی ہے کہ وہ رشوت خوری اور دوسری ناجائز کارروائیاں نہ کریں لیکن بعض حالات میں وہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ بہرحال اصلاح حال کے لیے یہ سارے اقدامات ناگزیر ہیں۔ ان سارے انتظامات کے باوجود جو لوگ رشوت اور خیانت سے باز نہ آئیں ایسے مجرمین کے لیے اس قسم کے قوانین ہونے چاہئیں جن کی رو سے انہیں چوراہوں پر عبرتناک سزائیں دی جائیں۔

اس موقع پر بعض لوگ یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ اس طرح بجٹ میں دفعتہً اضافہ ہو جائے گا۔ میں اس کا جواب یہ دیتا ہوں کہ اگر ہمارے سرکاری اور نیم سرکاری ملازمین سارے کے سارے ایماندار بن جائیں اور ان کا افلاس بھی باقی نہ رہے تو حکومت کی آمدنی بہت آسانی سے کم از کم دوگنی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ رشوت، غبن اور خیانت کی وجہ سے حکومت کی بہت سی آمدنی خزانے تک پہنچنے ہی نہیں پاتی۔ اگر حکومت اس سے محروم نہ رہے تو وہ بسہولت تنخواہوں کے اضافے کو برداشت کر سکتی ہے۔ البتہ آغاز کار کے لیے حکومت کو شاید اس کی ضرورت پیش آئے گی کہ وہ پبلک سے بلاسودی قرضے طلب کرے۔ لیکن حکومت کی ساکھ اور اس کا اعتماد اگر قوم میں موجود ہو تو ایک اصلاحی اسکیم کے لیے سود کے بغیر قرض حاصل کر لینا کچھ بھی دشوار نہیں ہے۔ اگر حکومت، ملازمین اور عوام دیانت داری کے ساتھ اس مہم میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں تو شاید چند سالوں کے اندر رشوت و

خیانت کا نام ونشان بھی مٹ جاتے اور جائز ذرائع کے ساتھ ہر شخص اپنی ضروریات مہیا کرنے کے قابل بھی ہو جاتے۔

پیشگی سودے بازی

سوال ۔ کیا اسلام کی رُو سے پیشگی سودا بازی (Forward Transaction) ناجائز ہے۔

جواب ۔ یہ ایک لمبی بحث ہے۔ لیکن اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اسلام میں پیشگی سودے کی صرف ایک شکل جائز ہے اور اس کا نام بیعِ سَلَم ہے۔ بیعِ سَلَم میں چند شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے ۔

۱۔ جس چیز کی خرید و فروخت ہو رہی ہو اس کا نام اور اس کی جنس کی نوعیت بالکل متعین ہونی چاہیئے اور اس کا نمونہ بازار میں دستیاب ہونا چاہیئے۔

۲۔ لینے اور دینے والے کا تعین ہونا چاہیئے۔

۳۔ شے کی مقدار، قیمت اور شرح متعین ہونی چاہیے۔

۴۔ اس وقت کا بھی تعین ہونا ضروری ہے جس وقت بائع مشتری کے سپرد مال کرے گا۔

۵۔ پیشگی سودا کرتے وقت ساری قیمت کا ادا ہو جانا بھی لازمی ہے۔ اگر ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری نہ ہوگی تو یہ بیع فاسد قرار پائیگی۔

سود اور غیر ملکی تجارت ۔

سوال ۔ غیر ملکی تاجر جب ہم سے سود نہ لینے پر مجبور ہو جائیں گے تو کیا اپنے مال کی قیمتیں نہیں بڑھا دیں گے؟ کیا اس طرح سے سود کی لین دین

کا بند کرنا عملاً بے سود نہ ہو جائے گا؟

جواب:۔ اگر غیر ملکی تاجروں کی واجب الادا رقوم کی ادائیگی کا یقینی اور قابل اعتماد انتظام ہو جاتے تو غالباً وہ اپنے مال کی قیمتیں نہیں بڑھائیں گے۔ لیکن بالفرض اگر قیمتوں میں کچھ اضافہ بھی ہو جائے تب بھی ہماری تجارت حرام کی آلائش سے تو محفوظ ہو جائے گی اور یہ درحقیقت خسارے کا نہیں بلکہ بڑے نفع کا سودا ہے علاوہ ازیں ہماری معاشی زندگی میں اسلامی انقلاب دنیا بھر کے لیے سبق آموز ہوگا۔ ہماری عملی مثال سے انشاء اللہ تمام قومیں اس بات کی قائل بلکہ اس پر راضی ہو جائیں گی کہ سود نہ جائز ہے اور نہ ناگزیر ہے۔

سوال:۔ موجودہ بیرونی تجارت میں ایک عملی دقت یہ بھی ہے کہ اس کے لیے بنک میں (Letter of Credit) کھولنا ضروری ہوتا ہے اور بغیر سود کے اس کا کھلنا ممکن نہیں ہے۔

جواب:۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ حالات میں افراد اگر دوسرے ممالک سے تجارت کرنا چاہیں تو ان کے رستے میں کچھ نہ کچھ مشکلات ہیں لیکن یہ مشکلات اسی وقت تک ہیں، جس وقت تک ملک کی حکومت آپ کی پشت پناہی نہ کرے اور خود بھی اپنی خارجی تجارت میں سود سے بچنے کی جدوجہد نہ کرے۔ لیکن اگر حکومت مختلف ممالک سے غیر سودی بنیادوں پر معاہدے کرنے کی کوشش کرے، اپنے ملک کے اندر بھی غیر سودی مالی نظام قائم کرے اور بیرونی ممالک میں اپنے تاجروں کی ادائیگیوں میں بھی مدد دے تو تمام مشکلات کا حل بآسانی نکالا جا سکتا ہے۔

غیر ملکی سرمایہ پر سود:

سوال:- کیا ایک اسلامی حکومت غیر ملکی سرمائے کو سود پر ملک میں لگانے کی اجازت دے سکتی ہے؟ اجازت نہ دینے کی صورت میں ملک کی صنعتی ترقی رک نہیں جائے گی؟

جواب:- اسلامی حکومت میں کسی مسلم یا غیر مسلم، کسی ملکی یا غیر ملکی سرمایہ دار کو سودی کاروبار کی قطعاً اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اگر ملک میں سود کو بند کر دیا جائے تو غیر ملکی سرمایہ خود بخود بھاگنا شروع کر دے گا۔ یہ چیز انشاء اللہ ہمارے حق میں مفید ہی ہو گی۔ ہمیں تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ کسی ملک نے غیر ملکی سرمائے کے بل پر ترقی کرنے کی کوشش کی ہو اور وہ الٹا مزید پھندوں میں مدت ہائے دراز تک نہ پھنس گیا ہو۔ ہمیں اپنے ملک ہی کے سرمائے سے تجارتی اور صنعتی نشو و نما کی جدوجہد کرنی چاہیئے۔

کیا زکوٰۃ کے علاوہ انکم ٹیکس عائد کرنا جائز ہے؟

سوال:- کیا اسلام میں زکوٰۃ وصول کرنے کے ساتھ ساتھ انکم ٹیکس عائد کرنا بھی جائز ہے

جواب:- جی ہاں، اسلامی ریاست میں یہ دونوں چیزیں جائز ہو سکتی ہیں۔ زکوٰۃ کے مصارف بالکل متعین ہیں جو کہ سورہ توبہ میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح اس کا نصاب اور اس کی شرح بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرما دی ہے ان امور میں کوئی ترمیم و تنسیخ جائز نہیں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ریاست کو اگر دوسری مزید ضروریات درپیش ہوں تو ان کے لیے وہ قوم سے مالی مدد

حاصل کر سکتی ہے۔ اگر یہ وصولی جبری ہو تو ٹیکس ہے۔ اگر رضاکارانہ ہو تو چندہ ہے اور واپسی کی شرط ہو تو (Loan) قرضہ ہے۔ زکوٰۃ اور یہ دوسری قسم کی وصولیاں نہ ایک دوسرے کی جگہ لے سکتی ہیں اور نہ ایک دوسرے کو ساقط کر سکتی ہیں۔ یہ تو اس مسئلے کا اصولی جواب ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میں آپ کو یہ اطمینان بھی دلاتا ہوں کہ اگر ہمارے ملک میں ایک صحیح اسلامی حکومت قائم ہو جائے اور دیانت داری سے اس کا نظام چلایا جائے تو اتنے ٹیکسوں کی ضرورت باقی نہیں رہے گی جتنے آج موجود ہیں۔ موجودہ زمانے میں ٹیکسوں کے معاملے میں جتنی بدعنوانیاں اور بددیانتیاں ہوتی ہیں وہ آپ خوب جانتے ہیں۔ ایک طرف تو جس مقصد کے لیے ٹیکس لگایا جاتا ہے اس کا مشکل دس فیصد اس مقصد کے لیے صرف ہوتا ہے۔ دوسری طرف ٹیکس سے بچنے (Evasion) کی ایک عام ذہنیت پیدا ہو گئی ہے۔ اگر نظام درست ہو جائے تو موجودہ ٹیکسوں کا ایک چوتھائی حصہ بھی کفایت کرے گا اور افادیت چار پانچ گنی زیادہ ہو جائے گی۔

(ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ، ستمبر ۱۹۵۴ء)

مسئلہ سود کے متعلق چند اشکالات

سوال: میں معاشیات کا طالب علم ہوں۔ اس لیے اسلامی معاشیات کے سلسلے میں مجھے جس قدر کتابیں مل سکی ہیں۔ میں نے ان کا مطالعہ کیا

ہے۔ "سود" کے بعض ابواب میں نے کتنی کتنی بار پڑھے ہیں۔ لیکن بعض چیزیں سمجھ میں نہیں آتیں۔

زیادہ سے زیادہ صرف کرو کی پالیسی:

کچھ دن ہوتے ہیں میں نے آپ کو یہ سوال لکھا تھا کہ آپ خرچ پر جس قدر زور دیتے ہیں، اس کا نتیجہ صرف یہی ہو گا کہ اسلامی ریاست میں سرمایہ کی شدید کمی ہو جائے گی اور ملک کی صنعتی ترقی رک جائے گی۔ اس کا جواب آپ کی طرف سے یہ دیا گیا تھا کہ سود میں اس کا جواب موجود ہے۔ متعلقہ ابواب کو دوبارہ پڑھا جائے میں نے کتنی بار ان ابواب کو پڑھا ہے اور میرا اعتراض قائم ہے۔ لہٰذا میں آپ کے پیش کردہ دلائل کو اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں اور پھر اپنا اعتراض پیش کرتا ہوں۔

آپ کا استدلال یہ ہے کہ لوگ دل کھول کر خرچ کریں تو ہر چیز کی مانگ بڑھے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ (Producers) اپنی پیداوار بڑھائیں گے۔ یعنی زیادہ عوامل کو روزگار مہیا کریں گے۔ عوامل پیداوار کی بڑھتی ہوئی آمدنی کے نتیجہ میں چیزوں کی مانگ اور بڑھے گی۔ غرضیکہ معاشی خوشحالی کا ایسا چکر چلے گا جس سے کہ ایک طرف عوامل پیداوار کی آمدنی اور معیارِ زندگی بلند ہوتا چلا جائے گا اور دوسری طرف صاحب پیداوار کی بکری اور منافع بڑھتا چلا جائیگا اس کے بعد آپ یہ کہتے ہیں کہ صنعتوں کے لیے سرمایہ بڑھے

ہوتے منافع اور بڑھتی ہوئی آمدنی سے بچی ہوئی رقم میں سے فراہم ہو جائے گا۔

اب میں اپنے اعتراضات بیان کرتا ہوں۔ میں شروع ہی میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ سود کی بندش سے پس اندازی کا سلسلہ رک جانے کا مجھے کوئی خدشہ نہیں ہے۔ میرا سارا اعتراض یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ خرچ کرو کی پالیسی صحیح پالیسی نہیں ہے۔

آپ کے پورے استدلال کی تہ میں یہ مفروضہ کام کر رہا ہے کہ ملک پہلے سے ہی پوری طرح صنعتی ترقی کر چکا ہے۔ اب صرف سالانہ (Depreciation) اور (Replacement) کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ لوگوں کی پس انداز کرنے کی عادت کی بنا پر ملک کی موجودہ صنعتی قابلیت بھی پوری طرح استعمال نہیں ہو رہی۔

پہلا نتیجہ میں نے اس طرح اخذ کیا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ اصلاً صنعت کا اندرونی منافع ہی سرمایہ کی کمی کو پورا کر دے گا۔ لیکن یہ تب ہی ممکن ہے کہ جب صنعت پہلے سے خوب ترقی یافتہ ہو۔ اگر صنعت بالکل نہ ہو، یا ابتدائی مراحل میں ہو تو یہ ممکن نہیں ہے کہ اندرونی سرمایہ ہی سے یا تھوڑا اسا باہر کا سرمایہ ملا کر ضرورت پوری ہو جائے مثال کے طور پر پاکستان کا ششش سالہ پلان لیجیے۔ باوجود اس کے کہ یہ پلان ہماری ضروریات کے لحاظ سے انتہائی حقیر ہے اور اس میں

ملکی ضروریات سے زیادہ سرمایہ کی فراہمی کے مسئلہ کو پیش نظر رکھا گیا ہے، لیکن پھر بھی اس پلان کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے صنعتی اور ملکی سرمایہ ملا کر اور غیر ملکی سرمایہ کو بھی شامل کر کے سرمایہ کی ضروریات پوری نہیں ہو رہیں اور حکومت کو خسارے کا بجٹ بنانے پر مجبور ہونا پڑ رہا ہے۔ یہی حال ہندوستان، انڈونیشیا جاپان وغیرہ ممالک کا ہے۔ جتنے پسماندہ ممالک ہیں کسی کا ملکی سرمایہ بھی اس کی صنعتی ضروریات کے لیے کافی نہیں۔ ایسی صورت میں یہ کہنا کہ صنعت کا اپنا سرمایہ اور تھوڑی بہت پسماندہ رقم ہماری صنعتی ضروریات کے لیے کافی ہو گی کس طرح صحیح ہے۔ اسی بنا پر ME - 9 - R - D - B - 9 وغیرہ وجود میں آتے ہیں۔

دوسرا مفروضہ میں نے اس طرح نکالا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ جب لوگ زیادہ خرچ کریں گے تو روزگار بڑھے گا۔ پیدا کنندگان زیادہ عوامل پیداوار سے روزگار مہیا کریں گے۔ لیکن یہ تب ہی ممکن ہے کہ جب فاضل صنعتی قوت موجود ہو۔ اگر زائد قوت موجود نہ ہو یعنی کارخانے اپنی قوت کار سے کم کام نہ کر رہے ہوں، یا سرے سے کارخانے ہی موجود نہ ہوں، جیسا کہ عام طور پر پسماندہ ممالک میں ہوتا ہے، تو زیادہ خرچ کرنے کا نتیجہ سوائے افراط زر کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے ممالک کو چھوڑیئے خود اپنے ہی ملک میں ہمیں اس کا بہت تلخ تجربہ ہوا ہے۔ دوران جنگ میں جب کارخانہ

دن رات کام کر رہے تھے، لیکن روپے کی فراوانی کی بنا پر لوگ خوب خرچ کر رہے تھے، اس وقت صنعت میں برائے نام ہی ترقی ہوئی تھی۔ البتہ INHSTION) خوب بڑھ گئی تھی۔ ایسی صورت میں یہ کہنا کس طرح صحیح ہوگا کہ زیادہ خرچ کرنے سے صنعت کو فروغ ہوگا؟ کیا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ آپ کی معاشیات تنزل پذیر ہے، ترقی یافتہ نہیں ہے؟ آپ کا نسخہ ترقی یافتہ ممالک میں تو کارگر ہو سکتا ہے پسماندہ ممالک میں نہیں۔

یہ تو تھا آپ کے دلائل کا جائزہ اور ان پر میرا اعتراض، اب میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرو کی پالیسی کے خلاف چند دلائل پیش کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ ہر قسم کے اخراجات معاشی نقطۂ نظر سے مفید نہیں ہیں۔ اگر اپنا زائد منافع صنعت میں لگا دینے کے بجائے قیمتی مکانات، قیمتی لباس قیمتی فرنیچر وغیرہ پر صرف کر دیں تو ملکی صنعت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ بلکہ الٹا نقصان ہی پہنچے گا۔ کیونکہ وہ رقم صنعتی سرمایہ نہ بنی۔ علاوہ ازیں اتنی رقم صنعتی پیداوار پر صرف ہونے سے بھی رہ گئی۔ اس طرح اتنی مالیت کی پیداوار فروخت نہ ہو سکی۔ اور ایسے اخراجات حرام نہیں ہیں۔ لہٰذا خرچ کرو کی پالیسی معاشی مسائل کا حل نہیں ہے۔

۲۔ "زیادہ خرچ کرو" کی پالیسی پسماندہ ممالک کیلئے نقصان دہ ہے۔ ایسے ممالک میں چونکہ ملکی صنعت برائے نام ہی ہوتی ہے۔ اس

لیے خرچ کا بیشتر حصہ درآمدہ اشیاء پر صرف ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر ملکی زر مبادلہ پر بہت بوجھ پڑتا ہے۔ ایک تو ویسے ہی ان ممالک کے غیر ملکی وسائل بہت محدود ہوتے ہیں پھر اوپر سے اخراجات صارفین کا جو دباؤ پڑتا ہے اس کی وجہ سے مشینوں کی درآمد کے لیے بہت کم وسائل رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا زیادہ خرچ کرو کی پالیسی سے صنعتی ترقی کو سخت نقصان پہنچتا ہے جب خرچ کا دباؤ زیادہ پڑ رہا ہو تو یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ (Consumption goods) کی درآمد بند کر دی جاتے۔ کیونکہ پھر ملک میں افراطِ زر کا چکر چلنے لگے گا۔ ان دونوں صورتوں کا تجربہ ہم نے خوب کیا ہے پہلی صورت کا تجربہ فضل الرحمان صاحب کا او۔جی۔ایل تھا۔ دوسری صورت کا تجربہ ۱۹۵۳ء سے ہو رہا ہے اور دونوں تجربات کے نتائج سب کے سامنے ہیں۔

۲۔ زیادہ سے زیادہ خرچ کرو کی پالیسی اور بسرعت صنعتی ترقی کی خواہش بالکل متضاد ہیں۔ ہر ملک کے وسائل محدود ہوتے ہیں ان وسائل کو دو طرح سے خرچ کیا جا سکتا ہے۔

(Consumption) پر اور (Production) پر جتنے زیادہ وسائل (Consumption Demand) کو پورا کرنے کے لیے صرف کیے جائیں گے اتنے ہی کم وسائل (PRODUCTION DEMAND) کو پورا کرنے کے لیے

رہ جائیں گے۔ یہاں الٰہ دین کا چراغ نہیں ہے کہ سرمایہ جب چاہا جتنا چاہا۔ جس غرض کے لیے چاہا مہیا ہو گیا۔ اور مستقبل کے متعلق فکر بھی نہ کرنی پڑی۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے بیشمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ میں صرف ایک عام فہم مثال دینے پر اکتفا کرتا ہوں۔ انگلستان میں آج بھی رہائشی مکانات کی بہت قلت ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ لوگ بنانا نہیں چاہتے۔ بلکہ وجہ یہ ہے کہ وسائل کی کمی زیادہ مکانات بنانے کی اجازت نہیں دیتی۔ جتنا زیادہ سرمایہ لوہا سیمنٹ میں صرف کیا جائے گا اتنا ہی کم دوسری صنعتوں کے لیے رہ جائے گا۔ اسی لیے معاشی کونسل ہر صنعت کے لیے تمام عوامل کا کوٹا مقرر کر دیتی ہے تاکہ سب کو کچھ نہ کچھ حصہ مل جائے اور کوئی کام بند نہ ہو۔

۵۔ کوئی پسماندہ ملک بغیر (Consumption Expenditure) کو کم کیے اور بغیر اپنی قومی آمدنی کا خاصہ حصہ پس انداز کیے ترقی نہیں کر سکتا۔ بیرونی امداد اور بیرونی سرمایہ کی بڑی سے بڑی رقوم بھی ایسے ملک کے سرمایہ کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتیں۔ اگر یہ ممالک (Consumption Expenditure) کو کم کرنے اور زیادہ سے زیادہ پس انداز کرنے پر تیار نہیں ہیں تو پھر صنعتی ترقی کے خواب ہی دیکھتے رہیں۔ ان خوابوں کے پورا ہونے میں بہت وقت لگے گا

اور بہت قربانیاں دینی پڑیں گی۔ اس دعوے کا بہترین ثبوت روس اور جاپان پیش کرتے ہیں۔ گو کہ سیاسی اعتبار سے دونوں ممالک میں بعد المشرقین ہے۔ لیکن معاشی ترقی کے لیے دونوں نے ایک ہی ذریعہ اختیار کیا۔ دونوں ہماری طرح ہی بدحال تھے۔ دونوں کو غیر ملکی سرمایہ نہیں ملا اور دونوں سرعت سے صنعتی ترقی کے خواہاں تھے لہٰذا انہوں نے (Consumption Expenditure) کو کم کیا اور قومی آمدنی کا ایک خاص حصہ جبراً پس انداز کیا اور اس سرمایہ سے اپنی صنعتیں کھڑی کیں۔

۲۔ بنکنگ کی نشوونما!

میرا دوسرا بڑا اعتراض سود حصہ دوم میں دیتے ہوتے بنکنگ کے تجزیہ پر ہے۔ صـ۱۲۱ سے صـ۱۲۳ تک آپ بنکنگ کی تاریخ بیان کرتے ہوتے بتاتے ہیں کہ کس طرح پہلے سناروں نے امانت داروں کا سونا قرض دینا شروع کر دیا اور پھر اس طرح اس سونے کے بل پر انکا قرض دینے لگے۔ آپ کہتے ہیں کہ اس طرح ان لوگوں نے ۹۰ فیصد جعلی روپیہ بالکل بے بنیاد کرنسی کی شکل میں بنا ڈالا اور خواہ مخواہ اس کے مالک بن بیٹھے اور سوسائٹی کے سر پر اس کو قرض کے طور پر لاد کر اس پر دس بارہ فیصد سود وصول کرنے لگے۔ یہ سنار اس مسلسل جعلسازی سے ملک کی ۹۰ فی صدی دولت کے مالک ہو چکے تھے۔

اس پورے تجزیہ سے مجھے سراسر اختلاف ہے۔ جہاں تک آپ نے بنکنگ کی تاریخ بیان کی ہے وہاں تک مجھے کوئی اختلاف نہیں۔ میرا اختلاف ان باتوں سے ہے جنہیں میں نے آپ کے الفاظ میں قلمبند کیا ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ:

۱۔ وہ سرمایہ جعلی نہیں۔

۲۔ بنکر کی ملک نہیں۔

۳۔ وہ سوسائٹی پر زبردستی قرض کی صورت میں لادا نہیں گیا۔

۴۔ بنکر ملک کی ۳۰ فیصد دولت کے مالک نہیں بن گئے۔ تھے۔

۵۔ روپیہ تخلیق (CREATE) کرنے کا عمل بنکنگ کی ابتداء میں ہی نہیں ہوا تھا۔ بلکہ روز ہوتا ہے۔ ان باتوں کو ثابت کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ بنکنگ کی حقیقت کو جس طرح میں نے سمجھا ہے اسے بیان کر دوں۔

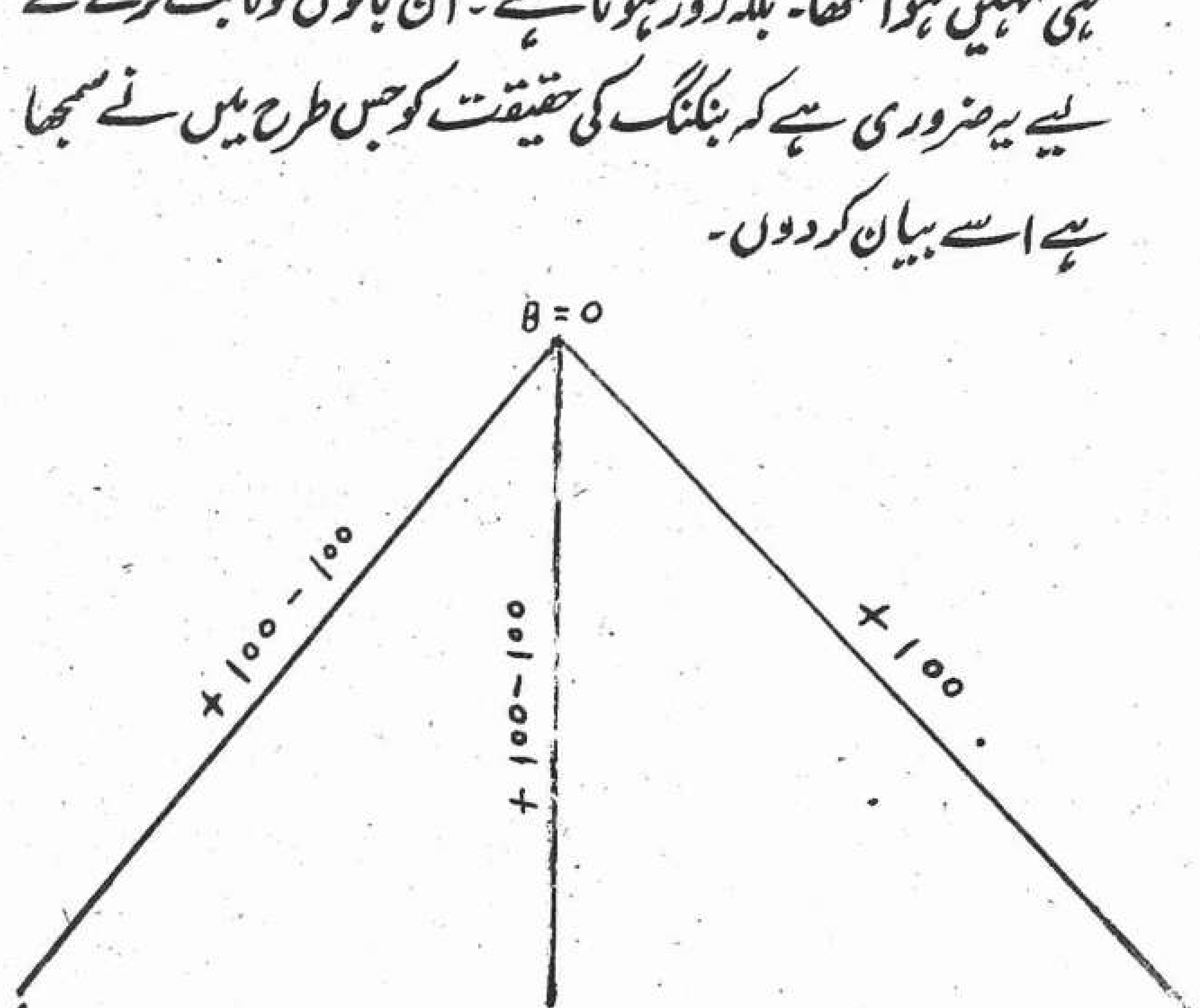

ایک شخص بنک کھولتا ہے۔ اس کے پاس اپنا کوئی سرمایہ نہیں اور نہ ہی کوئی امانتدار اس کے پاس رقم رکھتا ہے۔ چونکہ بنک صفر سے قائم ہوتا ہے (B = 0) اس کے پاس ایک شخص A آتا ہے اور ۱۰۰ روپے قرض مانگتا ہے۔ بنک اس کی درخواست قبول کر لیتا ہے لیکن نقدی کی صورت میں کچھ بھی نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے نام ۱۰۰ روپے اپنے کھاتہ میں جمع کر لیتا ہے (A + 100) اب A بازار میں C سے کچھ مال خریدتا ہے اور اسے ۱۰۰ روپوں کا چیک دے دیتا ہے۔ C اسے بنک میں جمع کرا دیتا ہے۔ بنک A کے کھاتہ سے ۱۰۰ روپے گھٹا دیتا ہے۔ (A + 100 - 100 = 0) اور سی کے نام جمع کر لیتا ہے (C + 100) بازار میں سو روپے کی چیز C سے A کے پاس چلی گئی اس کے عوض میں اسٹیٹ بنک کا ایک نوٹ بھی نہ دیا گیا بلکہ B کے کھاتے میں ۱۰۰ روپے کا اندراج کر دیا گیا۔ بنک (B) کے پاس پہلے بھی کوئی رقم نہ تھی اور اب بھی کوئی رقم نہیں ہے اب C مال خریدتا ہے اور D کو ۱۰۰ روپے کا چیک دے دیتا ہے۔ بنک C کے کھاتے سے ۱۰۰ روپے گھٹا دیتا ہے اور D کے نام جمع کر دیتا ہے۔ غرضیکہ اسی طرح تجارت کا چکر چلتا رہتا آپ دیکھتے ہیں کہ بنک کے پاس اپنا کچھ نہیں تھا۔ لیکن اس نے پھر بھی ۱۰۰ روپے کا قرض دے دیا اور بنک کا قرض بازار

میں کرنسی نوٹوں کی طرح چل رہا ہے۔ اس رقم سے اسی طرح خرید و فروخت ہو رہی ہے جس طرح عام نوٹوں سے ہوتی ہے اور بنک صفر سرمایہ سے کام شروع کرنے کے باوجود ۱۰۰ روپے سود کا مالک بن بیٹھتا ہے۔ یہ دیکھ کر آپ پکار اٹھتے ہیں کہ بنکر جعلساز ہے۔ اس نے خود ہی جعلی روپیہ بنایا اور اس کا مالک بن کر اُسے سوسائٹی پر قرض کی صورت میں لاد دیا۔ اس طرح اتنی ملکی دولت اس کے قبضہ میں چلی گئی۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا واقعی یہ احتجاج صحیح ہے۔

میں نے بنکر کو صفر سرمایہ سے اس لیے شروع کیا ہے کہ آپ کے الزامات کی سنگینی پوری شدت سے ابھر آتے اور روپے بنانے میں ۱۰ : ۱ کے تناسب کی قید بھی حائل نہ ہو۔ پوری پوری رقم ایک شخص سے دوسرے شخص کے نام تبدیل کرنے میں حسابی سہولت مقصود ہے۔

ہماری مثال میں اب صورت حال یہ ہے کہ بنک کے پاس ایک دھیلہ بھی نہیں لیکن بنک کو A سے ۱۰۰ روپے ملنے ہیں کیونکہ یہ رقم اس نے بنک سے قرض لی تھی۔ اس رقم کے علاوہ بنک کو سود بھی ملنا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ بنک کے کھاتے میں ی کے نام ۱۰۰ روپے جمع ہیں۔ یعنی بنک نے ی کو ۱۰۰ روپے دینے ہیں۔ یعنی بنک کو اگر ایک طرف سے سود + ۱۰۰ ملنا ہے

تو دوسری طرف اس کے ذمّہ ۱۰۰ روپے واجب الادا بھی ہیں۔

اب پوری بات صاف ہو جاتی ہے۔

۱۔ وہ رقم جو بنک نے پیدا کی تھی وہ بنک کی ملک نہیں ہے وہ بچانے والے (ی) کی ملک ہے بنک صرف سود کی رقم کا مالک ہے۔

۲۔ لہٰذا بنک نے کوئی جعلی سرمایہ نہیں بنایا۔ اس نے صرف بچانے والے کی رقم کو ادھار پر لگایا ہے۔

۳۔ بنک سوسائٹی کی ۹۰ فیصد دولت کا مالک نہیں بن رہا۔

۴۔ بنک سوسائٹی کے سر پر زبردستی کوئی قرض نہیں لاد رہا دولت بچانے والا جس دن چاہے اس چکر کو بند کر سکتا ہے۔

A نے بنک سے نقد اپنے ۱۰۰ روپے کا مطالبہ کر دیا۔ بنک نے A سے کہا کہ میرا دیا ہوا قرض واپس دو۔ A نے ۱۰۰ سود واپس کر دیا۔ بنک نے ی کو سو روپے دے دیئے اور سود کا کچھ حصّہ خود رکھ لیا کچھ ی کو دے دیا۔ اب بنک پھر خالی ہے نہ اس کا کسی پر قرض ہے اور نہ ہی اس کے ذمّہ کوئی قرض ہے۔

اگر بنک جعلی روپیہ بنا سکتے تو وہ کبھی فیل نہ ہوتے۔ فیل وہ ہوتے ہی اس لیے ہیں کہ وہ جعلی روپیہ نہیں بنا سکتے۔ امانتدار اپنے روپے طلب کرتے ہیں اور بنک بعض اوقات فوری طور پر اپنے قرض واپس نہیں لے پاتا۔ امانتدار فوری نقدی طلب کرتے

ہیں۔ اس لیے امانت داروں کے تقاضے بنک، پورے کرنے سے عاجز ہو جاتے ہیں اور لال بتی جلا دیتے ہیں۔

آپ کی تحریر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ ساہوکاروں نے اپنی ترقی کے ابتدائی دور میں ایک کے دس بنائے تھے۔ اب وہ سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سلسلہ اب تک چل رہا ہے۔ روز ہر بنک ایک روپے کے بل پر دس روپے قرض دیتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے بنک قرض اپنے نوٹوں کی شکل میں دیتے تھے اب چیک کی صورت میں دیتے ہیں۔ لیکن نوٹ اور چیک دونوں کی ماہیت اور دونوں کی (Theory) ایک ہی ہے۔ دونوں بنک کے ذمہ واجب الادا رقوم کے ثبوت ہیں۔ چونکہ (Creation of Money) تخلیقِ زر کے طریقے سے آپ بخوبی واقف ہیں اس لیے اسے دہرانا بیکار ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میری کم سمجھی کی بنا پر یا آپ کی عبارت کی ساخت کی بنا پر مجھے یہ خیال گزرا۔ آپ اس عمل کو بنکنگ کی تاریخ کا ایک پرانا باب سمجھتے ہیں۔ کیا میرا یہ خیال صحیح ہے؟

تخلیق زر

۳۔ میرا تیسرا اور آخری سوال کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ فقہی استفسار ہے کیا اسلامی بنکنگ میں تجارتی بنکوں کو تخلیق زر

کی اجازت ہوگی یا نہیں؟........ اس عمل کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ اگر اس کی اجازت نہ ہوگی تو اعتباری نظام میں لچک کس طرح پیدا کی جائے گی۔

امید ہے کہ آپ میرے اعتراضات کے تشفی بخش جواب دے کر میرے ذہن کو اطمینان بخشیں گے۔

جواب: آپ کے سوالات کا مختصر جواب حاضر ہے۔ تفصیلی بحث کی فرصت نہیں۔ صرف اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

آپ کا پہلا اعتراض دو مفروضوں پر مبنی ہے۔ ایک یہ کہ "صرف کرو" کی تبلیغ فوراً یہ نتیجہ دکھا دے گی کہ لوگ بے تحاشا صرف کرنا شروع کر دیں گے اور روپیہ بچانے یا کام پر لگانے کے سارے رجحانات بھی ختم ہو جائیں گے دوسرے یہ کہ صرف کرو سے مراد اپنے اوپر ہی صرف کرنا اور ضروریات سے گزر کر تعیشات پر صرف کر دینا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں ہی باتیں درست نہیں ہیں۔ صرف کرنے کا رجحان بتدریج بڑھے گا۔ اس دوران میں اگر ساتھ ساتھ صنعتی ترقی کے لیے بھی کوشش جاری رہے تو اس کام کے لیے روپیہ ملتا رہے گا اور ان دونوں چیزوں کے متوازن نشوونما سے جیسے جیسے صنعتیں بڑھیں گی ان کے پیدا کردہ مال کی کھپت بھی بڑھتی اور صنعتوں کے لیے مزید ترقی کا سامان لاتی چلی جائے گی۔ پھر صرف کر دینے سے ہماری مراد صرف اپنی ہی ذات پر صرف کرنا نہیں، بلکہ انفاق فی سبیل اللہ بھی ہے، اس لیے روپے کا ایک بڑا حصہ ان طبقوں میں جائے گا جن کی قوت خرید بحالت موجودہ بہت گھٹی

ہوتی ہے اور وہ قوت خرید پیدا ہو جانے کے بعد اپنی ہر قسم کی ضروریات لینی شروع کر دیں گے جن سے تمام مختلف قسم کی صنعتوں کی آبیاری ہو گی۔ میرے ان دونوں بیانات کے پیچھے یہ بات بنیادی مفروضے کے طور پر کام کر رہی ہے کہ ملک کا نظام ایسے دانشمند لوگوں کے ہاتھوں چل رہا ہو، جو ایک طرف اخلاقِ عامہ کی اصلاح اور صحت مند ذہنیت کی تخلیق کر رہے ہوں اور دوسری طرف تمام ان ذرائع کو جو ملک کے اندر فراہم ہو سکتے ہوں، ترقی کے کاموں پر ہوشیاری کے ساتھ لگاتے چلے جا رہے ہیں۔

بنکنگ کے سلسلے میں میں نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں پہلے جدید بنکنگ کی ابتدا۔ بتائی گئی ہے اور پھر یہ بتایا گیا ہے کہ رفتہ رفتہ نشو ونما پا کر اب یہ کاروبار کس طرح چل رہا ہے۔ اس میں میرے پیش نظر بجائے خود بنکنگ پر فنی بحث کرنا نہیں ہے، بلکہ دراصل میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس سسٹم میں قباحت کا پہلو کیا ہے اور اس قباحت کے پہلو کو اس سے خارج کر کے وہ اصل ضرورت کیسے پوری کی جا سکتی ہے جس کے لیے ایک بنکنگ سسٹم درکار ہے۔ اسی لیے میں زیادہ تفصیلی بحثوں میں نہیں گیا ہوں۔ آپ نے اپنا اعتراض اٹھاتے وقت اس بات کا لحاظ نہیں رکھا کہ میں نے بنکنگ کی پیدائش اور نشو ونما کو تین مرحلوں میں بیان کیا ہے اور آپ نے ساری بحث کو ایک ہی مرحلہ بنا کر وہ باتیں جو ابتدائی دَور سے متعلق تھیں موجودہ صورتحالی کے متعلق سمجھ لی ہیں۔ نیز موجودہ صورتِ حال کو بھی آپ ایک مجرد مفروضے کی صورت میں پیش کر رہے ہیں، حالانکہ میں تیسرے مرحلہ کے عنوان سے

جو بحث کر رہا ہوں وہ بنکوں کے اس عملی طریق کار سے تعلق رکھتی ہے جس پر اب فی الواقع کام چل رہا ہے۔ آپ کے پاس اگر کتاب وہاں موجود ہو تو میری ساری بحث کو اس تقسیم کے مطابق پڑھیں۔ جس طرح میں نے اپنے ذیلی عنوانات قائم کرکے کی ہے۔ پھر آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ اس پر وہ اعتراض نہیں اٹھتے جو آپ نے اٹھاتے ہیں۔ آپ کا یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ میں تخلیق زر (Creation of Money) کو بنکنگ کی تاریخ کا محض ایک پرانا باب سمجھ رہا ہوں میں جانتا ہوں کہ یہ عمل ابھی جاری ہے۔ لیکن میں نے تیسرے مرحلے کی بحث میں اس کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ جس مدعا کی خاطر میں ساری بحث کر رہا ہوں اس سے یہ چیز براہ راست متعلق نہیں ہے۔ جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں، میری بحث کا مقصد بنکنگ پر فنی گفتگو نہیں ہے بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے اس کے نقصان دہ پہلوؤں کو واضح کرکے اصلاح کی شکل پیش کرنا ہے۔

آپ کے آخری سوال کا جواب یہ ہے کہ تخلیق زر کی پشت پر اگر سود اور فریب نہ ہو تو اس میں کوئی حرمت کا پہلو نہیں ہے۔ اب یہ دیکھنا آپ لوگوں (یعنی اہل فن) کا کام ہے کہ معاشی ضرورت کے لیے ایک صحت مند تخلیق زر کا نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے جو قباحت کے پہلوؤں سے پاک ہو۔

(ترجمان القرآن شعبان رمضان ۱۳۷۶ھ جون ۱۹۵۷ء)

ترجیحی حصص

سوال: بندہ ایک ٹیکسٹائل مل کا حصہ دار ہے۔ ہر سال منافع کی رقم وہی آتی رہی ہے جو پہلے سال آئی تھی۔ اس دفعہ میں نے مل مذکور کے دفتر سے معلوم کیا کہ کیا وجہ ہے کہ منافع ایک ہی رقم پر موقوف ہے۔ جواب ملا "آپ کے ترجیحی حصص ہیں۔ ترجیحی حصص پر خسارہ کا کوئی امکان نہیں۔ ان پر ہمیشہ ایک ہی مقررہ منافع ملتا رہے گا"۔ میرے خیال میں یہ منافع سود ہے۔ براہ نوازش اپنی رائے سے مطلع فرمائیں تاکہ سود ہونے کی صورت میں حصص فروخت کر کے جان چھڑاؤں۔

جواب: اس نوعیت کے حصے بلاشبہ سود کی تعریف میں آتے ہیں۔ آپ یا تو ان حصوں کو فروخت کر دیں یا ان کو اس نوعیت کے حصوں میں تبدیل کرالیں جن میں مقررہ منافع کے بجائے متناسب منافع ملتا ہے۔

ترجمان القرآن رجب ۱۳۷۵ھ مطابق مارچ ۱۹۵۶ء

غیر مسلم ممالک سے اقتصادی اور صنعتی قرضے

سوال: کیا اسلامی حکومت موجودہ دور میں جب کہ ایک ملک دوسرے ملک سے قطع تعلق کر کے ترقی نہیں کر سکتا، غیر ممالک سے متعلق

اقتصادی، فوجی ٹکنیکل امداد یا بین الاقوامی بنک سے شرح سود پر قرض لینا بالکل حرام قرار دے گی؟ پھر مادی، صنعتی زراعتی وسائنسی ترقی وغیرہ کی جو عظیم خلیج مغربی ترقی یافتہ (Advanced) ممالک اور مشرق وسطیٰ بالخصوص اسلامی ممالک یا اس ایٹمی دور میں (Have) اور (Have Not) کے درمیان حائل ہے کس طرح پر ہو سکے گی؟ نیز کیا اندرونِ ملک تمام بنکنگ وانشورنس سسٹم ترک کرنے کا حکم دیا جائے گا؟ سود، پگڑی، منافع و ربح اور گڈول (Goodwill) اور خرید و فروخت میں دلالی وکمیشن کے لیے کونسی اجتہادی راہ نکالی جا سکتی ہے؟ کیا اسلامی ممالک آپس میں سود، منافع، ربح وغیرہ پر کسی صورت میں قرض لین دین کر سکتے ہیں

جواب:۔ اسلامی حکومت نے کسی دور میں بھی غیر مسلم ممالک سے قطع تعلق کی پالیسی اختیار نہیں کی اور نہ آج کرے گی۔ لیکن قرض کے معنی قرض مانگتے پھرنے کے نہیں ہیں اور وہ بھی اُن کی شرائط پر۔ یہ تعلق اس زمانے کے کم ہمت لوگوں نے ہی پیدا کیا ہے۔ اگر کسی ملک میں ایک صحیح اسلامی حکومت قائم ہو تو وہ مادی ترقی سے پہلے اپنی قوم کی اخلاقی حالت سدھارنے کی کوشش کرے گی۔ اخلاقی حالت سدھرنے کے معنی یہ ہیں کہ قوم کے حکمران اور اس کی انتظامی مشینری کے کارپرداز اور قوم کے افراد ایماندار ہوں۔ اپنے حقوق سے پہلے اپنے فرائض کو ملحوظ رکھنے اور سمجھنے والے ہوں۔ اور سب کے سامنے ایک بلند نصب العین ہو جس کے لیے جان و مال اور وقت اور محنتیں اور قابلیتیں

سب کچھ قربان کرنے کے لیے وہ تیار ہوں نیز یہ کہ حکمرانوں کو قوم پر اور قوم کو حکمرانوں پر پورا اعتماد ہو اور قوم ایمانداری کے ساتھ یہ سمجھے کہ اس کے سربراہ درحقیقت اس کی فلاح کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہ صورت حال اگر پیدا ہو جائے تو ایک قوم کو باہر سے سود پر قرض مانگنے کی صورت پیش نہیں آسکتی۔ ملک کے اندر جو ٹیکس، لگائے جائیں گے وہ سو فیصدی وصول ہوں گے اور سو فیصدی ہی وہ قوم کی ترقی پر صرف ہوں گے۔ نہ ان کی وصولیابی میں بے ایمانی ہو گی اور نہ ان کے خرچ میں ہی بے ایمانی ہو گی۔ اس پر بھی اگر قرض کی ضرورت پیش آئے تو قوم خود سرمایہ کا ایک بڑا حصہ رضا کارانہ چندے کی صورت میں اور ایک اچھا خاصا حصہ غیر سودی قرض کی صورت میں اور ایک حصّہ منافع میں شرکت کے اصول پر فراہم کرنے کو تیار ہو جائے گی۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ پاکستان میں اگر اسلامی اصولوں کا تجربہ کیا جائے تو شاید بہت جلدی پاکستان دوسروں سے قرض لینے کے بجائے دوسروں کو قرضہ دینے کے لیے تیار ہو جائے۔

بالفرض اگر ہمیں بیرونی قوموں سے سود پر قرض لینے کی ناگزیر صورت پیش آ ہی جائے، یعنی ہمیں اپنی ضرورت کو پورا کرنا بھی لازم ہو اور اس کے لیے ملک میں سرمایہ بھی نہ مل سکے، تو دوسروں سے سود پر قرض لیا جاسکتا ہے لیکن ملک کے اندر سودی لین دین جاری رکھنے کا پھر بھی کوئی جواز نہیں۔ ملک میں سود بند کیا جاسکتا ہے اور پورا مالی نظام (Financial system) سود کے بغیر چلایا جاسکتا ہے۔ میں اپنی کتاب "سود" میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ بینکنگ کا نظام سود کے بجائے منافع میں شرکت (Profit Sharing)

کے اصولوں پر چلایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح انشورنس کے نظام میں ایسی ترمیمات کی جا سکتی ہیں جن سے انشورنس کے سارے فوائد غیر اسلامی طریقے اختیار کئے بغیر حاصل ہو سکیں۔ دلالی، منافع، پگڑی، کمیشن یا گڈ ول (Goodwill) وغیرہ کی علیحدہ علیحدہ شرعی پوزیشن ہے۔ جب اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آئے گا تو اس کا جائزہ لے کر یا تو سابق پوزیشن بحال رکھی جائے گی یا پھر ضروری اصلاحات کی جائیں گی۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۰، عدد ۲۔ نومبر ۱۹۶۱ء)

سیاسی مسائل

سیاسی انقلاب پہلے یا سماجی انقلاب؟

سوال: ہمارے ملک میں یہ احساس عام ہے کہ اسلام کے اصول و احکام پسندیدہ اور مستحسن تو ہیں مگر بحالاتِ موجودہ قابلِ عمل نہیں ہیں۔ عوام و خواص میں اسلام سے جذباتی وابستگی تو ضرور ہے لیکن اسلام کا صحیح مفہوم اور آمادگیٔ عمل بہت کم ہے۔ اسلام جس ذہنی و عملی انضباط کا مطالبہ کرتا ہے اسے دیکھ کر یہ خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلامی قوانین کو نافذ کر دیا گیا تو کہیں اس کے خلاف شدید ردِعمل نہ رونما ہو جائے۔ سیاسی انقلاب سے پہلے سماجی انقلاب ضروری ہے اور اصلاح کا جذبہ اوپر سے اور باہر سے پیدا کرنے کے بجائے اندر سے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ صورتحال پیدا ہونے سے پہلے کیا اسلامی ریاست کا مطالبہ قبل از وقت نہیں ہے؟

جواب: اس مسئلے کی اگر پوری وضاحت کی جائے تو اس کے لیے بڑے تفصیلی جواب کی ضرورت ہے۔ لیکن مختصر جواب یہ ہے کہ بلاشبہ سیاسی انقلاب سے پہلے ایک تمدنی، اجتماعی اور اخلاقی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی اسلامی انقلاب کا فطری طریقہ ہے۔ اور بلاشبہ یہ بات بھی درست ہے کہ اسلام کے احکام و قوانین صرف اُوپر سے ہی مسلط نہیں کیے جا سکتے بلکہ اندر سے ان کے اتباع کا دلی جذبہ بھی پیدا کیا جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت

سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کہ پاکستان کے قیام کی شکل میں سیاسی انقلاب رونما ہو چکا ہے۔ اب یہ سوال چھیڑنا بالکل بے کار ہے کہ معاشرتی انقلاب پہلے برپا کرنا چاہیئے اور سیاسی انقلاب بعد میں۔ اب تو سوال یہ پیدا ہو گیا ہے۔ کہ جب تک قوم میں ذہنی انقلاب واقع نہ ہو اس وقت تک آیا ہم سیاسی اختیارات کو کافرانہ اصولوں کے مطابق استعمال کرتے رہیں یا ان اختیارات کو بھی اسلامی اصولوں کے مطابق کام میں لائیں۔ سیاسی اقتدار کا کوئی نہ کوئی مصرف اور مقصد بہر حال ہمیں متعین کرنا پڑے گا۔ حکومت کی مشینری کو اخلاقی انقلاب رونما ہونے تک معطل بہر حال نہیں کیا جا سکتا۔ ایک قوم جو خدا اور اس کے رسول کی حاکمیت اور بالادستی پر ایمان رکھتی ہو، اجتماعی اور قومی زندگی کی باگیں اس کے اپنے ہاتھ میں ہوں، اپنا نظام حیات وہ خود تعمیر کرنے کے قابل ہو اور کوئی دوسری کافرانہ طاقت اس پر کوئی کافرانہ نظام مسلط کرنے والی نہ ہو، تو کیا اس قوم کے افراد کے لیے یہ جائز اور درست ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اخلاقی وعظ و نصیحت تو کرتے رہیں مگر اپنی ہیئتِ حاکمہ کو غیر اسلامی اصولوں کے مطابق کام کرنے کے لیے چھوڑ دیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اس صورتِ حال کو گوارا کر لیں تو گو ہم انفرادی ارتداد کے مرتکب نہ ہوں، اجتماعی اور قومی حیثیت سے ہم ضرور ارتداد کے مرتکب ہوں گے۔

پھر اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ اجتماعی و اخلاقی انقلاب لانا چاہتے ہیں تو آپ کو غور کرنا پڑے گا کہ اس

انقلاب کے ذرائع و وسائل کیا کیا ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان ذرائع میں تعلیم و تربیت، معاشرتی اصلاح، ذہنی اصلاح اور اسی قسم کی بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ انہی کے ساتھ ساتھ حکومت کے قانونی اور سیاسی ذرائع و وسائل بھی ہیں۔ حکومت کی طاقت نہ صرف بجائے خود ایک بڑا ذریعہ اصلاح ہے، بلکہ وہ ساری اصلاحی تدابیر کو زیادہ موثر، نتیجہ خیز اور ہمہ گیر بنانے کا بھی ذریعہ ہے۔ اب آخر کیا وجہ ہے کہ اخلاقی انقلاب لانے کے لیے حکومت کے وسائل کو بھی استعمال نہ کیا جائے۔ ہمارے ووٹوں اور ہمارے ادا کردہ ٹیکسوں اور مالیوں کے بل پر ہی تو حکومت کا سارا نظام چل رہا ہے۔ آخر اس حماقت اور جہالت کا ارتکاب ہم کیوں کریں کہ ایک طرف انفرادی حیثیت سے ہم اسلام کے سماجی انقلاب کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کریں اور دوسری طرف حکومت کے سارے ذرائع اخلاق کے بگاڑنے اور فسق و فجور پھیلانے میں لگے رہیں۔

(ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ۔ ستمبر ۱۹۵۴ء)

اسلام میں قطع ید کی سزا

سوال :- اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کا کاٹ دینا ہے۔ آجکل روزانہ سینکڑوں چوریاں ہوتی ہیں تو کیا روزانہ سینکڑوں ہاتھ کاٹے جائیں گے؟ بظاہر حالات یہ سزا سخت اور ناقابل عمل معلوم ہوتی ہے۔

جواب :- قطع ید اور اسلام کے دوسرے قوانین فوجداری کے بارے میں اگر میں اسلام

کا نقطہ۔ نظر پوری وضاحت سے بیان کروں تو اس میں بڑا وقت لگے گا۔ میں اس موضوع پر اپنی کتاب "اسلامی قوانین اور پاکستان میں اس کے نفاذ کی عملی تدابیر" میں تفصیلی بحث کر چکا ہوں۔ اس وقت میں صرف اتنی بات کہوں گا کہ جب چور کے ہاتھ کاٹنے کا طریقہ جاری ہو گا تو انشاء اللہ چوری نہایت تھوڑے عرصے میں ختم ہو جائے گی اور سینکڑوں ہاتھوں کے کٹنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ ایک چور یہ امید رکھتا ہے کہ میں دس ہزار روپیہ چرالوں گا، اگر پکڑا جاؤں گا تو کچھ مدت تک سرکار کی روٹیاں کھا کر واپس آجاؤں گا اور اس وقت بھی میرے پاس اچھا خاصا سرمایہ جمع ہو گا۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص دوبارہ اوّلین موقع پاتے ہی پھر چوری کرے گا۔ اس طرح کے عادی مجرمین کی ہمارے ہاں کثرت ہے اور انہی کو جرائم سے باز رکھنا مشکل ترین مسئلہ ہے۔ لیکن اگر چور کو یہ معلوم ہو گیا ایک مرتبہ پکڑے جانے کے بعد ایک ہاتھ اور دوسری مرتبہ پکڑے جانے کے بعد دوسرا ہاتھ کٹ جائے گا تو وہ چوری کرنے پر بآسانی آمادہ نہ ہو گا۔ پھر جس چور کا ہاتھ ایک مرتبہ کٹ جائے گا وہ جہاں جائے گا اس کا کٹا ہوا ہاتھ پکار پکار کر داستان حال بیان کرے گا اور موجودہ صورت حال باقی نہیں رہے گی جس میں پیشہ ور چور اور ڈاکو مہذب انسانوں کے بھیس میں چارسُوا اپنے شکار تلاش کرتے پھرتے ہیں اور کوئی انہیں پہچان بھی نہیں سکتا۔ میری قطعی رائے یہ ہے کہ چوری کے انسداد کے لیے اس قانون کے نفاذ کی شدید ضرورت ہے تہذیب جدید کے بہت سے نقائص میں سے ایک نقص یہ بھی ہے کہ اس کی ساری ہمدردیاں مجرم کے ساتھ ہیں، اس سوسائٹی کے ساتھ نہیں ہیں جس

کے خلاف مجرم سرگرم کار ہے۔ مجرد یہ سننے پر کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا اس تہذیب کے فرزندوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہولناک جرائم کو معاشرے میں پروان چڑھتے دیکھ کر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ آخر میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اسلام صرف چور کا ہاتھ ہی نہیں کاٹتا۔ بلکہ وہ زکوٰۃ و صدقات کا نظام بھی قائم کرتا ہے، ہر شخص کی بنیادی ضروریات بھی پوری کرتا ہے، وہ شہریوں کی اخلاقی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کرتا ہے، وہ لوگوں کو حلال اور جائز طریق پر کمانا اور خرچ کرنا بھی سکھاتا ہے۔ اس کے بعد اگر ایک شخص کی حلال کمائی کو کوئی دوسرا حرام طریقے سے چراتا ہے تو اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جاتی ہے۔

(ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ۔ ستمبر ۱۹۵۴ء)

اسلامی ریاست میں شاتمِ رسولؐ ذمی کی حیثیت

سوال: راقم الحروف نے پچھلے دنوں آپ کی تصنیف "الجہاد فی الاسلام" کا مطالعہ کیا۔ "اسلام کا قانونِ صلح و جنگ کے باب میں صفحہ ۲۴۷ ضمن (۶) میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ:

"ذمی خواہ کیسے ہی جرم کا ارتکاب کرے اس کا ذمہ نہیں ٹوٹتا حتیٰ کہ جزیہ بند کر دینا، مسلمانوں کو قتل کرنا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنا یا کسی مسلمان عورت کی آبروریزی کرنا، اس کے

حق میں ناقض ذمہ نہیں ہے۔ البتہ صرف دو صورتیں ایسی ہیں کہ جن میں عقدِ ذمہ باقی نہیں رہتا۔ ایک یہ کہ وہ دارالاسلام سے نکلے اور دشمنوں سے جا ملے، دوسرے یہ کہ حکومت اسلامیہ کے خلاف عَلانیہ بغاوت کرکے فتنہ وفساد برپا کرے"۔

فدوی کو اس امر سے اختلاف ہے اور میں اسے قرآن و سنّت کے مطابق نہیں سمجھتا۔ میری تحقیق یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنا اور دوسرے امور جن کا آپ نے ذکر فرمایا ہے ان سے ذمی کا عقد ذمہ ٹوٹ جاتا ہے۔ آپ نے اپنی رائے کی تائید میں فتح القدیر جلد ۴ اور بدائع ص ۱۱۳ کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن دوسری طرف علامہ ابن تیمیہؒ نے "الصارم المسلول علی شاتم الرسول" کے نام سے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ زاد المعاد، تاریخ الخلفاء، عون المعبود، نیل الاوطار جیسی کتابوں میں علمائے سلف کے دلائل آپ کی رائے کے خلاف ہیں۔ یہاں ایک حدیث کی طرف بھی توجہ دلاتا ہوں۔ عن علی ان یھودیۃ کانت تشتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم وتقع فیہ فخنقھا رجل حتی ماتت فبطل النبی صلی اللہ علیہ وسلم دمھا حضرت علی کی روایت ہے کہ ایک یہودیہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بد زبانی کرتی تھی اور آپ پر باتیں چھانٹتی رہتی تھی۔ ایک شخص نے اس کا گلا گھونٹا یہاں تک کہ وہ مر گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خون کو رائیگاں قرار دے دیا (ابوداؤد ملاحظہ

ہو مشکوٰۃ باب قتل اہل الردۃ والافساد ص۳۰۸)

ضمناً یہ بھی بیان کر دوں کہ یہاں کے ایک مقامی اہل حدیث عالم نے آپ کی اس رائے کے خلاف ایک مضمون بعنوان "مولانا مودودی کی ایک غلطی" شائع کیا ہے اور اس میں متعدد احادیث اور علماء کے فتاویٰ درج کئے ہیں۔

جواب: یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ اس میں آپ یا دوسرے حضرات جو رائے بھی رکھتے ہوں، رکھیں اور اپنے دلائل بیان کریں۔ دوسری طرف بھی علماء کا ایک بڑا گروہ ہے اور اس کے پاس بھی دلائل ہیں۔ اصل اختلاف اس بات میں نہیں ہے کہ جزیہ نہ دینا، یا سبِّ نبی صلعم، یا ہتکِ مسلمات قانونی جُرم مستلزمِ سزا ہیں یا نہیں، بلکہ اس امر میں ہے کہ یہ جرائم آیا قانون کے خلاف جرائم ہیں یا دستورِ مملکت کے خلاف۔ ایک جرم وہ ہے جو رعیّت کا کوئی فرد کرے تو صرف مجرم ہوتا ہے۔ دوسرا جرم یہ ہے جس کا ارتکاب وہ کرے تو سرے سے رعیّت ہونے ہی سے خارج ہو جاتا ہے۔ حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ ذمی کے یہ جرائم پہلی نوعیّت کے ہیں۔ بعض دوسرے علماء کے نزدیک ان کی نوعیّت دوسری قسم کے جرائم کی سی ہے۔ یہ ایک دستوری بحث ہے جس میں دونوں طرف کافی دلائل ہیں۔ اس میں کسی کے ناراض ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ جن صاحب نے مضمون لکھا ہے انہوں نے انصاف نہیں کیا کہ اسے صرف میری غلطی قرار دیا۔ یہ اگر غلطی ہے تو سلف میں بہت سے اس کے مرتکب ہیں۔ میرا تو صرف یہ مقصود ہے کہ کسی مسئلے میں مسلکِ حنفی کی تائید کرتا

ہوں تو اہل حدیث خفا ہو جاتے ہیں اور کسی مسئلے میں اہل حدیث کی تائید کرتا ہوں تو حنفی پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

(ترجمان القرآن ذی القعدہ ۱۳۷۴ھ۔ جولائی ۱۹۵۵ء)

اسلامی جمہوریت اور ملازمین حکومت کی حیثیت

سوال:۔ اگست ۱۹۵۵ء کے ترجمان میں اشارات کے زیر عنوان آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان سے مجھے جزوی اختلاف ہے۔ میرے شبہات درج ذیل ہیں۔

۱۔ آپ نے جمہوریت کو قرآن وسنت کا منشا قرار دیا ہے۔ آپ بخوبی واقف ہیں کہ فی زمانہٖ جمہوریت ایک مخصوص طرز حکومت کا نام ہے جس کی بنیاد عوام کی غیر محدود حاکمیت کے تصوّر پر قائم ہے جسے ہم کسی طرح بھی کتاب وسنت کے منشا کے مطابق قرار نہیں دے سکتے۔ آپ جمہوریت کے لفظ کو اس کے معروف معنی سے ہٹا کر استعمال کر رہے ہیں۔ آپ نے خود اسلامی طرز حکومت کے لیے تھیوڈیماکریسی کی اصطلاح وضع کی تھی، اب اس اصطلاح کو چھوڑ کر آپ ڈیماکریسی کی طرف کیوں رجعت کر رہے ہیں۔

۲۔ آپ کا یہ خیال کہ ملازمین حکومت کو سیاسیات میں دخل انداز نہ ہونا چاہیے، بالکل مبہم اور مجمل ہے۔ کیا آپ بھی سیاسیات و

مذہب کی مصنوعی تقسیم کے قائل ہیں۔

۴۔ آپ کا یہ کہنا بھی تعلیمات اسلامی کے مطابق نہیں کہ سرکاری ملازم ہر اس ہیئتِ حاکمہ کی اطاعت قبول کریں جسے ملک کے باشندوں کی اکثریت آئینی طور پر ملک کا اقتدار سونپ دے۔ مسلمانوں کے لیے خواہ وہ سرکاری ملازم ہو یا عام شہری، اطاعت صرف اسی حکمران کی لازم ہے جو کتاب و سنت کا پابند ہو۔ محض آئینی حیثیت سے ملک کی مسند اقتدار پر متمکن ہو جانا کسی طرح بھی مسلمانوں سے اطاعت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

جواب: جمہوریت کے متعلق میں بارہا اپنی تحریروں اور تقریروں میں یہ بات اچھی طرح واضح کر چکا ہوں کہ اسلام میں جمہوریت کا اصل جوہر موجود ہے مگر جمہوریت کے اسلامی تصور اور جمہوریت کے مغربی تصورات میں بڑا فرق ہے۔ اسلام عوام کی لامحدود حاکمیت کا قائل نہیں ہے، بلکہ خدا کی حاکمیت کے تحت عمومی خلافت کا قائل ہے۔ اس عمومی خلافت کے اختیارات چونکہ کسی شخص یا خاندان یا گروہ میں مرکوز نہیں ہوتے بلکہ بحیثیت مجموعی پوری ملت کو حاصل ہوتے ہیں اور وہی اس کی مجاز ہے کہ جس کو چاہے ان اختیارات کے استعمال کے لیے منتخب کرے، اس لیے شخصی اور گروہی حکومت سے ممتاز کرنے کے لیے اسلام کے طرزِ حکومت کو جمہوری حکومت کہا جا سکتا ہے۔ یہی اسلام کا مخصوص تصورِ جمہوریت ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ دنیا بھر میں جمہوریت کا ایک ہی معروف اور متفق علیہ تصور رائج ہے۔ مغرب میں بھی جمہوریت کے مختلف تصورات،

مثلاً سرمایہ دارانہ جمہوریت، اشتراکی جمہوریت وغیرہ موجود ہیں۔ ان کے بالمقابل اسلام کے طرزِ حکومت کو اسلامی جمہوریت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اسی اسلامی جمہوریت کو میں نے تھیوڈیماکریسی کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ اس اصطلاح سے بھی مراد جمہوریت ہی کی ایک قسم ہے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہے۔

ملازمین حکومت کے سیاسیات میں دخل انداز ہونے کی جو مخالفت میں نے کی ہے اس کے وجوہ و دلائل بھی میں نے بیان کر دیئے ہیں۔ آپ نے ان دلائل پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہ کی اور ایسے پہلوؤں سے اعتراضات شروع کر دیتے جو اصل معاملے سے غیر متعلق ہیں۔ ملازمین حکومت کی ایک حیثیت ذاتی ہے اور دوسری حیثیت ملازم ہونے کی ہے۔ ذاتی حیثیت میں کوئی بھی نہیں کہتا کہ وہ سیاسیات سے علیحدہ رہیں۔ اسی وجہ سے تو ان کو بھی عام لوگوں کی طرح ووٹ کا حق حاصل ہے۔ لیکن ملازم حکومت ہونیکی حیثیت سے ان کا سیاسیات میں دخل انداز ہونا اور اُن سرکاری اختیارات کو، جو انتظام ملکی کے لیے انہیں دیتے گیے ہیں، سیاسی نظریوں اور پارٹیوں میں سے کسی کے حق میں اور کسی کے خلاف استعمال کرنا، اصولاً بھی غلط ہے اور عملاً بھی ملک کیلئے سخت نقصان دہ ہے۔ کیا آپ اسے صحیح سمجھتے ہیں کہ پولیس اور فوج اور سول سیکرٹریٹ کے لوگ اپنی جتھہ بندی کر کے خود اپنا ایک نظریہ قائم کریں اور یہ فیصلہ کر بیٹھیں کہ وہ خود ملک پر قبضہ کر کے اپنے نظریے کو زبردستی نافذ کریں گے، یا کوئی ایسی پارٹی اگر انتخابات کے نتیجہ میں برسرِ اقتدار آجاتے جو ان کے نظریہ سے مختلف نظریہ رکھتی ہو تو اس کی حکومت نہ چلنے دیں گے۔

یہ صحیح ہے کہ ایک سرکاری ملازم کو، ایک عام شہری کی طرح، صرف اسی حکمران کی اطاعت کرنی چاہیے جو کتاب وسنت کا پابند ہو، لیکن کیا یہ بھی صحیح ہے کہ اگر کوئی حکمران کتاب وسنت کا پابند نہ ہو تو اس کی ملازمت تو کی جاتے مگر اطاعت نہ کی جاتے؟ میں نے تو جس سیاق وسباق میں یہ بات کہی تھی کہ باشندوں کی اکثریت جس ہیئت حاکمہ کے سپرد اختیارات کرے اس کی اطاعت ملازمین کو کرنی چاہیئے میں اُس میں جمہوری اصول بیان کرنے سے پہلے اسلامی دستور کے اصول بھی بیان کر چکا تھا اور میری یہ بات اسی سیاق وسباق سے متعلق سمجھی جانی چاہیئے تھی۔ لیکن اگر آپ اس سیاق وسباق سے الگ کر کے بھی اسے لیں تو میں کہوں گا کہ ملک کی اکثریت اگر کسی ایسی ہیئت حاکمہ کو اختیارات سونپ دے جو کتاب وسنت سے منحرف ہو تو ایک دیندار ملازم حکومت کو استعفیٰ دے دینا چاہیئے۔ بہرحال اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ملازمت تو کرتا رہے مگر اطاعت سے انکار کر دے۔

(ترجمان القرآن جمادی الاخری ۱۳۷۵ھ۔ فروری ۱۹۵۶ء)

اسلامی نظریۂ جہاد سے متعلق ایک شبہ

سوال: آپ نے ایک مضمون "جہاد فی سبیل اللہ" کے عنوان سے لکھا ہے جو کہ تفہیمات حصہ اول اور "حقیقت جہاد" میں چھپ چکا ہے۔ اس مضمون میں ایک جگہ پر آپ نے ذیل کی عبارت تحریر کی ہے۔

"مسلم پارٹی کے لیے یہ ضروری ہے کہ کسی ایک خطہ میں اسلامی

نظام کی حکومت قائم کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ جہاں تک اس کی قوتیں ساتھ دیں اس نظام کو اطراف عالم میں وسیع کرنے کی کوشش کرے۔ یہی پالیسی تھی جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد خلفائے راشدین نے عمل کیا۔ عرب، جہاں مسلم پارٹی پیدا ہوئی تھی، سب سے پہلے اسی کو اسلامی حکومت کے زیر نگیں کیا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف کے ممالک کو اپنے اصول ومسلک کی طرف دعوت دی، مگر اس کا انتظار نہ کیا کہ یہ دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں، بلکہ قوت حاصل کرتے ہی رومی سلطنت سے تصادم شروع کر دیا۔"

اس عبارت پر بعض لوگ یہ اعتراض وارد کرتے ہیں کہ یہ تعلیم اسلام اور تاریخ اسلام کی صحیح نمائندگی نہیں ہے اور اس سے اس الزام کو تقویت پہنچتی ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے۔ آپ ترجمان میں توضیح فرمائیں کہ اس عبارت سے آپ کا مدعا کیا ہے اور اس کے لیے دلیل کونسی ہے؟"

جواب: میں نے اس عبارت میں ایک تاریخی حقیقت کو بیان کیا ہے جس کی پشت پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور خلفائے راشدین کا عمل موجود ہے۔ حدیث اور تاریخ کی کتابوں سے مجھے اس امر کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا کہ سلاطین روم وعجم کے خلاف فوج کشی سے پہلے ان ممالک میں صحابہ کرام کو عام تبلیغی مہمات پر روانہ کیا گیا ہو اور پھر اس دعوت وتبلیغ کے نتائج کا انتظار کیا

گیا ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف سلاطین کو خطوط بھیجنے پر اکتفا فرمایا۔ اس کے ساتھ آپ نے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ براہِ راست باشندگان روم و ایران و مصر کو خطاب کریں اور ان کے جواب کا انتظار فرمائیں۔ خلفائے راشدین کے عہد میں بھی صورت حال یہی رہی ہے۔ روم کی طرف پہلے غزوۂ موتہ پھر غزوۂ تبوک اور آخر میں جیشِ اُسامہ کی مہم اس کی بیّن دلیل ہے۔ ایران کیخلاف حضرت ابوبکرؓ کی جنگ اور مصر پر حضرت عمرؓ کی چڑھائی بھی اسی کا ثبوت ہے۔

اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو اس کی وجہ بھی بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان ممالک کے عوام کو مخاطب کرنے کے بجائے صرف ان کے حکمرانوں سے کیوں خطاب کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان ممالک میں شخصی حکومتیں قائم تھیں اور مستبد فرمانروا اقتدار پر قابض تھے۔ ان کا برسرِ اقتدار ہونا ہی اشاعت اسلام کے رستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ ان کی موجودگی میں نہ تو اس امر کا امکان تھا کہ دعوت عام باشندگانِ ملک میں پھیلائی جا سکے اور نہ عوام کو اتنی آزادی رائے اور آزادیٔ عمل حاصل تھی کہ اگر وہ اس دعوت کو حق پائیں تو اسے قبول کر کے اس پر عمل پیرا ہوسکیں۔ ان حالات میں حکمرانوں سے نمٹے بغیر نہ اسلام کی اشاعت کما حقہٗ سرانجام پاسکتی تھی اور نہ اس کے نتائج وثمرات رونما ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سلاطین کے نام اپنے مکتوباتِ مبارکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر تم یہ دعوت قبول نہ کروگے یا ہماری اطاعت تسلیم نہ کروگے تو اپنی رعایا کی گمراہی کا وبال بھی تمہارے سر ہوگا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے اس عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی

ملک میں ایسی حکومت قائم ہو جس کے ہوتے عوام کے لیے یہ عملاً ناممکن ہو کہ وہ دعوتِ اسلام کو سن کر قبول کر سکیں تو ایسی حکومت کو رستے سے ہٹانا ضروری ہے۔ اس حکومت کو ہٹانا دراصل عوام الناس کو عقیدہ وعمل کی آزادی بخشنے کا ہم معنی ہے۔ اس کا مقصود یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ اس کا مقصود صرف یہ ہے کہ ملک کے سیاسی نظام سے ان تمام موانع کا خاتمہ کر دیا جائے جو حق کے ادراک اور اس کے اتباع میں مزاحم ہوتے ہیں۔

یہاں اس بات کی صراحت بھی مناسب ہو گی کہ آپ جس عبارت کے متعلق سوال کر رہے ہیں اس میں اسلامی دعوت وتبلیغ اور قانون صلح وجنگ کا کوئی مکمل اور جامع ضابطہ بیان نہیں کیا گیا ہے۔ وہ تو ایک بڑے مسئلے کی طرف محض ایک سرسری اشارہ ہے۔ میں نے خاص اس موضوع پر اپنی کتابوں میں جو مفصل بحثیں کی ہیں ان سب کو چھوڑ کر ایک ضمنی بحث کے چند فقرات چھانٹ لینا کسی آئین انصاف وتحقیق کی رو سے بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔

(ترجمان القرآن بشوال ۱۳۷۵ھ - جون ۱۹۵۶ء)

دارالاسلام کی ایک نئی تعریف

سوال: میرے دو سوال حاضر خدمت ہیں امید ہے کہ تسلی بخش جواب مرحمت فرمائیں گے۔

۱۔ دارالکفر، دارالحرب اور دارالاسلام کی صحیح تعریف کیا ہے؟ دارالکفر اور دارالاسلام میں کس چیز کو ہم اصلی اور بنیادی قرار دے سکتے ہیں؟ مجھے اس مسئلے میں تردد مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کی حسبِ ذیل عبارت سے ہوا ہے۔

"اگر کسی ملک میں اقتدارِ اعلیٰ کسی غیر مسلم جماعت کے ہاتھوں میں ہو لیکن مسلمان بھی بہر حال اُس اقتدار میں شریک ہوں اور ان کے مذہبی و دینی شعائر کا احترام کیا جاتا ہو تو وہ ملک حضرت شاہ صاحب[1] کے نزدیک بے شبہ دارالاسلام ہوگا اور از روئے شرع مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس ملک کو اپنا ملک سمجھ کر اس کیلئے ہر نوع کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا معاملہ کریں۔ (نقش حیات جلد دوم ص۱۱)

آپ اس مسئلے میں میری راہنمائی فرمائیں۔

۲۔ آیت وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ میں لفظ لَعَلَّ آیا ہے جو شک کا کلمہ ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا قطعی علم ہے۔ پھر اس کی کیا توجیہہ کی جائے گی؟

جواب: آپ نے اپنا پہلا سوال مجھ سے کرنے کے بجائے مولانا حسین احمد صاحب ہی سے کیا ہوتا تو بہتر تھا۔ آپ ان سے پوچھئے کہ ہندوستان کی موجودہ حکومت میں مسلمان جس درجہ شریک ہیں اور ان کے مذہبی و دینی شعائر کا جیسا کچھ احترام

---

[1] یعنی شاہ عبدالعزیز صاحبؒ

کیا جاتا ہے، اس سے تو بدرجہا زیادہ وہ انگریزی دور میں شریک حکومت تھے اور اس سے بہت زیادہ ان کے شعائر مذہبی کا احترام انگریزی دور میں ہو رہا تھا۔ اگر کسی کو اس سے انکار ہو تو انگریزی دور کے مسلم وزرا، اور ایگزیکیٹو کونسل کے مسلم ممبروں اور فوجی اور سول محکموں کے مسلم ملازموں کی تعداد کا موجودہ بھارتی حکومت کے ہر شعبے میں حصہ پانے والے مسلمانوں کی تعداد سے مقابلہ کر کے ہر وقت اسے قائل کیا جا سکتا ہے۔ رہا شعائر مذہبی کا احترام تو موجودہ ہندو اقتدار کے دور میں مساجد کی جتنی بے حرمتی ہوئی ہے، اس کا مقابلہ انگریزی دور سے کر کے دیکھ لیا جائے۔ اس دور میں مسلمانوں کی جان و مال اور ان کی عورتوں کی عصمت پر جتنے حملے ہوئے ہیں ان کا مقابلہ انگریزی دور کے ایسے ہی حملوں سے کر لیا جائے۔ اور اس دور میں مسلمانوں کے پرسنل لا کا جو حشر ہوا ہے اس کے مقابلے میں دیکھ لیا جائے کہ ڈیڑھ سو برس کے انگریزی دور میں اس پرسنل لا کا کیا حال رہا ہے۔ اب اگر حضرت شاہ صاحب کی تعریف کے مطابق موجودہ بھارت بے شبہ دارالاسلام ہے تو انگریزی دور کا ہندوستان کیوں نہ تھا؟ آپ مولانا سے صاف صاف وہ وجہ فرق و امتیاز پوچھیں جس کی بنا پر ان کو انگریزی دور کا ہندوستان تو دارالکفر نظر آتا تھا اور موجودہ ہندوستان دارالاسلام نظر آتا ہے۔ اس سوال کا جو جواب مولانا دیں اس سے مجھے بھی مطلع فرمائیے تاکہ میں بھی اس نئی فقہی تحقیق سے فائدہ اٹھا سکوں۔ میں یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ موجودہ بھارت بھی اگر دارالاسلام ہے تو پھر دنیا میں کوئی ملک دارالکفر ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟

مولانا حسین احمد صاحب کے معتقدین چاہے کتنا ہی بُرا مانیں مگر امر واقعہ یہ ہے کہ آج مولانا کی قیادت میں دیوبند اس مقام سے بھی بدرجہا زیادہ فروتر مقام پر کھڑا ہے جہاں انگریزی دورِ اقتدار کے آغاز میں علی گڑھ کھڑا ہوا تھا۔ سرسید اور چراغ علی اور محسن الملک وغیرہم نے انگریزی اقتدار کے ساتھ مصالحت کرنے میں اس تنزل کا عُشرِ عشیر بھی اختیار نہیں کیا تھا جو اب مولانا حسین احمد اور ان کے ہم خیال علماء نے ہندو اقتدار کے ساتھ مصالحت میں اختیار کیا ہے۔ اُن نیچریوں نے اسلامی تصوّرات کو مسخ کرنے میں وہ جسارت کبھی نہ دکھائی تھی جس کا اظہار اب یہ سکّہ بند علماء کر رہے ہیں اور غضب یہ ہے کہ اپنے ساتھ خاندان شاہ ولی اللہ اور اپنے دوسرے اکابر کو بھی لے ڈوبنا چاہتے ہیں تاکہ اپنے تقدس پر آنچ نہ آنے دیں۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ جن امور میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار تفویض کیا ہے، ان میں اللہ تعالیٰ انسان کی اصلاح کے لیے جو تدبیر اختیار فرماتا ہے اس سے نتیجہ مطلوب کا برآمد ہونا اُس پر موقوف ہے کہ انسان اپنے اختیار کو صحیح استعمال کرے۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ اسے ایسا کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہتا اس لیے وہ اس نتیجہ مطلوب کے برآمد کرنے کا ذکر لعل کے ساتھ کرتا ہے۔ یعنی اس نتیجے کا برآمد ہونا یقینی نہیں ہے بلکہ اگر انسان صحیح طرزِ فکر اختیار کرے گا تب ہی یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ نتیجہ رونما ہو

(ترجمان القرآن جمادی الاخری ۱۳۷۶ھ مارچ ۱۹۵۷ء)

اسلامی حکومت یا فرقہ وارانہ حکومت

سوال :۔ مولانا حسین احمد صاحب مدنی مرحوم کی تصنیف "نقش حیات" کی بعض قابلِ اعتراض عبارتوں کے بارے میں آپ سے پہلے خط و کتابت ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں نے مولانا مرحوم کو بعض دوسری عبارتوں کی طرف توجہ دلائی تھی اور انہوں نے وعدہ فرمالیا تھا کہ وہ آئندہ ایڈیشن میں قابل اعتراض عبارتوں کو یا تو بالکل تبدیل فرمادیں گے یا اس میں ایسی ترمیم فرمائیں گے کہ کسی کو ان کی طرف غیر اسلامی نظریات کے منسوب کرنے کا موقع نہ مل سکے گا۔ مولانا کا جواب اس سلسلے میں درج ذیل ہے۔

یہ اعتراض کہ حضرت سید صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو سیکولر اسٹیٹ بنانے کا ارادہ کرنے والا اور صرف انگریزوں کا نکالنے والا میں قرار دیتا ہوں، بالکل خلافِ واقعہ اور تصریحات سے روگردانی ہے۔ بہرحال یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں اور اگر بالفرض کوئی عبارت ایسی ہے جس کی دلالت مطابقی یہی ہے، دوسری توجیہہ اس میں نہیں ہو سکتی تو وہ غلط ہے۔ ہندوستان کی حکومت کے شرمناک کارناموں سے مجھے انکار نہیں، پھر میں کس طرح اس کو دارالاسلام قرار دے سکتا ہوں؟ لیکن فرقہ وارانہ حکومت اور سیکولر اسٹیٹ کے درمیان بھی تو ایسی صورتیں ہیں جن کو اسلام قبول

کر سکتا ہے۔ مغلیہ حکومت کو دیکھیے اور غور فرمائیے"۔

مولانا مرحوم کے جواب سے اس بات کی خوشی ضرور ہوئی کہ حضرت مولانا دار الکفر کو دار الاسلام نہیں سمجھتے، مگر اس کا افسوس بھی ہوا کہ میں "نقش حیات" کی تصریحات اور مولانا کے اس جواب میں کوئی مطابقت نہیں پاتا۔ میں اس سلسلہ میں ابھی مزید خط و کتابت کی ضرورت محسوس کرتا ہوں"۔

جواب: یہ دیکھ کر مجھے بھی بہت خوشی ہوئی کہ مولانا حسین احمد صاحب مرحوم کم از کم ہندوستان کی موجودہ حکومت کو تو دار الاسلام قرار نہیں دیتے۔ اور وہاں کی موجودہ حکومت کے "شرمناک" کاموں سے انہوں نے اظہار برآت فرمایا ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ نے بھی محسوس کیا ہے، ان کی کتاب "نقش حیات" کی ایک دو نہیں متعدد عبارتیں ایک بہت ہی گمراہ کن نظریہ پیش کرتی ہیں اس لیے ایک مجمل تردید یا استدراک کے بجائے اس نظریہ کی مفصل تردید اور اس سے کلی برآت کی ضرورت ہے۔ مولانا مرحوم حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے جہاد کا مقصد یہ بتاتے ہیں کہ بس ہندوستان اس بدیشی قوم (انگریز) کے مظالم سے پاک ہو جاتے اور "اس کے بعد ہندو اور مسلمان مل کر بادشاہت کے لیے جس کو مناسب سمجھیں منتخب کریں"۔ حالانکہ اس کے ثبوت میں حضرت شہید کے جس خط کو وہ پیش کرتے ہیں وہ ہندو مسلمانوں کی مشترک حکومت کے تخیل سے بالکل خالی ہے۔ پھر وہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی عبارات کا، جنہیں خود انہوں نے نقل کیا ہے، بالکل الٹا

مطلب نکالتے ہیں کہ" اگر کسی ملک میں سیاسی اقتدار اعلیٰ کسی غیر مسلم جماعت کے ہاتھوں میں ہو لیکن مسلمان بھی بہر حال اس اقتدار میں شریک ہوں اور ان کے مذہبی و دینی شعار کا احترام کیا جاتا ہو تو وہ ملک حضرت شاہ صاحب کے نزدیک بے شبہ دارالاسلام ہوگا۔ اور از روئے شرع مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس ملک کو اپنا ملک سمجھ کر اس کے لیے ہر نوع کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا معاملہ کریں"۔ اس پر بھی وہ بس نہیں کرتے بلکہ یہ عجیب و غریب دعوے کرتے ہیں کہ سلطنت مغلیہ کے دور زوال میں جن علماء نے بھی اصلاح احوال کی کوشش کی" ان کا مقصد ملک کی خوشحالی، امن وامان، سکون واطمینان ظلم و جور کی بیخ کنی، اور خلقِ خدا کی عام رفاہیت وبہبودی تھا، ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ حکومت مسلمان کی ہو یا غیر مسلم کی"۔ اس سے آگے بڑھ کر انتہائی گمراہ کن بات جو انہوں نے لکھی ہے اور غضب یہ ہے کہ حضرت سید احمد شہید کی طرف بالکل غلط طور پر منسوب کر کے لکھی ہے، وہ یہ ہے :۔

"اعلاء کلمۃ اللہ کا ذریعہ صرف یہی نہیں ہے کہ ایک "فرقہ وار" گورنمنٹ قائم کی جائے اور خود حاکم بن کر دوسرے برادرانِ وطن کو اپنا محکوم بنایا جائے، بلکہ اس کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ یہ ہے کہ برادرانِ وطن کو سیاسی اقتدار میں اپنا شریک کر کے اسلامی فضائلِ اخلاق سے ان کے دلوں کو فتح کیا جائے۔

(نقشِ حیات جلد دوم صـ۱۲)

یہ عبارت سرے سے اسلامی حکومت کے تخیل ہی کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور ایک ایسا نظریہ پیش کرتی ہے جو اسلامی نظریہ ریاست کی بالکل ضد ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جہاں مسلم اور غیر مسلم ملے جلے آباد ہوں وہاں اسلام کی حکومت قائم کرنا اگر غلط نہیں تو مرجوح طریقہ ضرور ہے۔ ایسی حکومت کو مولانا اسلامی حکومت کہنے کے بجائے بار بار ایک "فرقہ دار حکومت" کے نام سے یاد فرماتے ہیں، اور برادران وطن کو محکوم بنا کر خود حاکم بن جانا ان کی نگاہ میں اگر زیادتی نہیں تو کم از کم نامناسب تو ہے ہی۔ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے افضل اور اولیٰ طریقہ اس کو سمجھتے ہیں کہ مسلم اور غیر مسلم کی مشترک حکومت بنائی جائے، جو بہرحال اسلامی حکومت نہ ہوگی، اور صرف فضائل اخلاق سے غیر مسلموں کا دل موہنے کی کوشش کی جائے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلافتِ راشدہ کی پوزیشن پھر کیا ہے، جس میں غیر مسلموں کی آبادی ۸۰-۹۰ فی صدی سے کم نہ تھی، مگر اس کے باوجود "فرقہ وار گورنمنٹ" قائم کر کے مسلمان خود حاکم بن بیٹھے تھے، اور غیر مسلموں کو سیاسی اقتدار میں شریک کرنے کے بجائے اپنا محکوم انہوں نے بنا لیا تھا؟ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اس کی زد خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی پڑتی ہے جنہوں نے "برادران وطن" کو اقتدار میں شریک نہیں کیا تھا اور اسلام کی خالص "فرقہ دار گورنمنٹ" قائم کر دی تھی۔ کیا مولانا یہ فرمائیں گے کہ حضورؐ نے اعلاء کلمۃ اللہ کا بہتر اور زیادہ مؤثر طریقہ چھوڑ کر ایک کمتر درجہ کا طریقہ اختیار فرمایا؟ یہی وہ باتیں ہیں جن کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ ہندو اقتدار کی آمد پر اس کے ساتھ مصالحت کرنے میں مولانا

حسین احمد صاحب مرحوم جتنی دور چلے گئے ہیں اتنی دُور تو انگریزی اقتدار کے ساتھ مصالحت کرنے میں سرسید اور اُن کے ساتھی بھی نہ گئے تھے۔ یہ خیالات تو اسلام کے متعلق مسلمانوں کے اصولی نقطۂ نظر تک کو بدل ڈالیں گے اور ایک مسلمان ان کو قبول کرنے کے بعد رسولؐ اور اصحابِ رسول صلوات اللہ علیہم اجمعین کے مقابلے میں ہندوستانی سیکولرزم کے بانیوں کو زیادہ انصاف پسند سمجھنے لگے گا۔

مولانا مرحوم کی یہ مداہنت میری نگاہ میں ایک بہت بڑا مظلمہ ہے۔ اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ انہیں اس پر معاف فرمائے اور عامۃ المسلمین کو ایسے غلط نظریات کے برے اثرات سے بچائے۔

(ترجمان القرآن شوال ۱۳۷۷ھ۔ جولائی ۱۹۵۸ء)

اسلامی حکومت یا فرقہ وارانہ حکومت کی مزید وضاحت

سوال:۔ بہت دنوں سے ارادہ تھا کہ عریضہ ارسال خدمت کروں۔ چند ضروری امور کے بارے میں عرض کرنا چاہتا تھا مگر فرصت نہ ملی کہ اطمینان خاطر کے ساتھ لکھ سکوں۔ ایک نئی بات کی وجہ سے اب فوراً خط لکھا۔ پرسوں تازہ پرچہ ترجمان القرآن کا موصول ہوا۔ میرا معمول یہ ہے کہ رسال وصول کرتے ہی پہلی نشست میں تقریباً سارا رسالہ ختم کر دیتا ہوں۔ اس دفعہ "رسائل و مسائل" میں جو کچھ آپ نے

لکھا ہے اس کو پڑھ کر طبیعت متاثر ہوئی اور دل کا شدید تقاضا ہوا کہ اس بارے میں آپ کی خدمت میں ضرور عریضہ لکھوں اور اپنے تاثرات کا اظہار کروں۔

میں حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا شاگرد اور مسترشد ہوں اس عام تعلق کے علاوہ بعض وجوہات کی بنا پر حضرتؒ سے خصوصی ربط و تعلق بھی ہے۔ اور موجودہ دور کے تمام علماء و مشائخ میں سب سے بڑھ کر مجھے عقیدت حضرت کے ساتھ ہے اور میں نے جو کمالات اور علمی و عملی فضائل کا ادراک ان کو دیکھ کر اور آزما کر کیا ہے اب تک اور کہیں سے نہیں ہوا۔ لیکن اس قدر شدید تعلق اور عقیدت و احترام کا جذبہ رکھنے کے باوجود جماعت اسلامی کے بارے میں حضرت شیخ کی جو رائے تھی چونکہ میرا ایمانی ضمیر اس پر مطمئن نہیں تھا اس لئے میں نے حضرت کی رائے قبول نہیں کی۔ اگرچہ اس سے ان کی عقیدت میں بھی کوئی فرق اپنے اندر نہ آنے دیا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ شرعاً میرے لیے ضروری نہ تھا کہ اگرچہ مجھے شرح صدر نہ بھی ہوا ہو اور بات بالکل سمجھ میں نہ آتی ہو لیکن پھر بھی ضرور حضرت کی یہ رائے میں مان لوں اور جماعت اسلامی یا اس کے بارے میں وہ رائے رکھوں جو خود حضرت رکھتے تھے۔ چونکہ جماعت اسلامی کے بارے میں میرا رویّہ اپنی پوری جماعت مسلک دیوبند کے خلاف رہا اس لیے بعض لوگوں نے اس کو اپنے اساتذہ سے

بغاوت سمجھا اور اسی جرم میں آج تک میں بعض کے ہاں مغضوب معتوب ہوں اور بعض کے ہاں ملوم و مخزول کوئی احسان جتانا مقصود نہیں محض اظہار واقعہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ محض اس "جُرم" پر مجھے کافی دینوی اور مادی خسارہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ اور بہت سے فوائد و منافع کے تمتع سے محروم رہا ہوں۔ اور مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں۔ کیونکہ میں نے جو روش اب تک اختیار کی ہے خالص اللہ تعالیٰ کی خاطر کی ہے اور میں اس کو ایمانی تقاضا سمجھتا ہوں۔ بہرحال یہ تو ایک تمہید تھی۔ مقصد یہ ہے کہ میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں یہ کسی گروہی عصبیت کی بنا پر نہیں بلکہ میں خود دینی تقاضا اور خیر خواہی سمجھ کر یہ چند سطور لکھ رہا ہوں۔ کچھ عرصہ قبل بھی ترجمان القرآن میں حضرت مدنی کی کتاب "نقشِ حیات" کی ایک عبارت کے بارے میں آپ سے کسی نے سوال کیا تھا اور آپ نے اس کے جواب میں جو لکھا تھا اس میں کافی تلخی اور تیز و تندی پائی جاتی تھی۔ اوّل تو اس سوال کا جواب آپ کو دینا نہیں چاہیے تھا۔ سائل سے آپ یہ کہہ سکتے تھے جیسا کہ ابتدائی جواب میں لکھا بھی گیا تھا کہ عبارت کا مطلب خود مولانا سے پوچھئے۔ ان کی عبارت ہے وہ خود اس کی تشریح کر دیں۔ لیکن آپ نے اپنی طرف سے خواہ مخواہ بلا ضرورت سخت کلمات لکھ دیئے۔ میں نے وہ جواب پڑھا تو مجھے بھی مناسب معلوم نہ ہوا مگر مجھے آپ سے بھی تعلق و عقیدت ہے

اس لیے اس کی توجیہہ و تاویل کی اور اپنے تاثر کو دبا دیا۔ لیکن انہی ایام میں مجھے معلوم ہوا کہ بہت سے اہل علم جو جماعت کے ساتھ غیر رسمی طور سے وابستہ تھے اور بہت کام بھی کیا کرتے تھے اس طرز جواب پر سخت ناراض ہو گئے۔ ان کی رائے آپ کے بارے میں بدلنے لگی اور انہوں نے جماعت کی حمایت سے ہاتھ اٹھا لیا۔ مجھ سے بھی انہوں نے گفتگو کی بلکہ مجھے مجبور کیا کہ میں آپ سے اس سلسلہ میں خط و کتابت کروں کہ آپ یہ بالکل بلا ضرورت اس قدر دل آزاری کے کلمات کیوں شائع فرماتے ہیں۔ مگر میں نے اس وقت سکوت اختیار کیا۔ تازہ پرچہ میں پھر اسی بات کو ذرا اس سے بھی زیادہ تیز الفاظ میں دُہرایا ہے۔ حضرت مدنیؒ کی وفات کے بعد پھر ایسی باتیں تازہ کرنا اور اس انداز کے ساتھ لکھنا تو اور بھی نامناسب ہے۔ عام طور سے لوگ ایسا کیا کرتے ہیں اور آپ کہہ سکتے ہیں کہ مولوی صاحبان اور دوسرے لوگ میرے بارے میں اور جماعت کے بارے میں ایسا ہی طرز اختیار کئے ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کو ایسے امور میں دوسروں کی تقلید تو نہیں کرنی چاہیے۔ میں واقعہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک داعی حق ہونے کی حیثیت سے آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے اور یہ اندازِ تحریر آپ کی شان سے بہت ہی فروتر ہے۔ اگر اس تحریر پر آپ کا نام نہ ہوتا تو میں تو اپنے ذوق کے مطابق یہ کبھی یقین نہ کرتا کہ آپ اس سطح پر آسکتے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر کسی

نے یہ سوال آپ کے پاس بھیجا تو آپ کو اس کا جواب دینا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ اگر مستفسر کو یہ افسوس ہے کہ "نقش حیات" کی تصریحات اور مولانا کے اس جواب میں کوئی مطابقت نہیں تو اپنے اس افسوس کے ازالہ کے لیے آخر وہ آپ سے کیوں خط و کتابت کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ یا تو وہ حضرت کی حیات میں ان سے خط و کتابت کرتے۔ یا ان کی وفات کے بعد ان کے کسی جانشین، تلمیذ خاص، یا کسی اور متعلق سے پوچھ لیتے۔ مولانا مرحوم کے ساتھ تو آپ کا کوئی تعلق نہیں تھا کہ ان کی متعارض عبارات کی تطبیق کی ذمہ داری آپ پر پڑتی ہے اور آپ خواہ مخواہ جواب دہ ہیں۔ میں تو آپ پر اس کی کوئی بدگمانی نہیں کرتا لیکن یہاں بعض لوگوں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ یہ مستفسر بھی بالکل فرضی ہے تاکہ اس طریقہ سے اسی قسم کے جواب کی اشاعت کا موقع مہیا کر دیا جائے۔ مولانا مرحوم کی عبارت سے جو نتائج آپ نے اخذ کیے ہیں اور پھر ان پر تنقید کی ہے میرے خیال میں آپ نے اس میں بھی اپنے بلند مقام سے اتر کر گفتگو کی ہے۔ عام علماء اگر آپ کی عبارات کے ساتھ یہی طریقہ برتتے ہیں تو جائز طور پر وجہ شکایت ہوتی ہے اور انصاف کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس پر احتجاج کیا جائے۔ اس لیے میں آپ سے بھی شکایت کو جائز اور احتجاج کو تقاضائے انصاف سمجھتا ہوں۔ یہ جواب شائع کر کے واقعہ یہ ہے کہ آپ نے دینی لحاظ سے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔

اقامتِ دین کی منزل قریب لانے میں بھی اس کا کوئی دخل نہیں بلکہ اس سے سینکڑوں نہیں ہزاروں ایسے اشخاص کی دل آزاری ہوئی جو آپ کے ساتھ ہیں اور آپ کی جدوجہد کو ایک دینی جدوجہد سمجھ کر نظریہ یا عمل کے اعتبار سے آپ کے شریکِ کار ہیں۔ خواہ آپ اسے اندھی عقیدت و تقلید کہیں یا اور کچھ۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت مدنیؒ کی محبت و عقیدت تمام علماء اور دیندار طبقہ کے سویدائے قلب میں جاگزین ہے۔ ان کی کسی رائے یا فتویٰ کو ممکن ہے بعض حضرات کسی وجہ سے قبول نہ کریں لیکن ان کی شان میں اگر ایسے کلمات کہے یا لکھے جائیں جن سے تنقیص و توہین ہوتی ہو تو ان کو برداشت کرنا بڑا مشکل ہے۔ پس ان کی وفات کے بعد جن باتوں کو چھیڑنے کی بالکل کوئی ضرورت نہیں اور ان کو چھیڑنے اور شائع کرنے سے دین کا ذرہ برابر فائدہ نہ ہو رہا ہو تو خواہ مخواہ کے لیے ایک نیا میدانِ جنگ کیوں گرم کر دیا جائے۔ موجودہ نازک حالات میں آنے والے انتخابات کی اہمیت کو محسوس فرما کر آپ نے بھی الاہم فالاہم کے اصول پر اور حکمتِ عملی سے کام لے کر دوسرے بہت سے امور میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی ہے اور ایسا کرنا بھی چاہیے تھا، تو کیا یہ حکمتِ عملی میں شامل نہیں ہو سکتا کہ ان ایام میں علمائے کرام کو بالکل نہ چھیڑا جاتے خواہ ان میں سے بعض تجاوز بھی کر جائیں لیکن کوئی انتقامی کارروائی نہ کی جائے۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ

حضرات کا تمام چھوٹے بڑے الزامات کے مقابلہ میں سکوت اختیار کرنا اور مرّوا کراماً پر عامل بن جانا، دین کے لحاظ سے زیادہ مفید ہے اور اسی میں جماعت کا وقار بھی ہے۔ بات بہت طویل ہو گئی، مقصد آپ مختصر اشارہ سے بھی سمجھ سکتے تھے۔ آپ ضرور اس بات پر غور فرما کر اس کا اب تدارک کریں اور اس کے مضر اثرات کو کسی احسن طریقہ سے زائل کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کے بارے میں جو کچھ علماء اعتراضات کر رہے ہیں ہم کو تو شب و روز ان کی جواب دہی کرنی پڑتی ہے۔ میں تو رسمی طور سے متعلق نہ ہونے کے باوجود لوگوں کے خیال میں "پکا مودودی" ہوں۔ میں ان اعتراضات کی مدافعت کرتا رہا ہوں۔ لیکن اس تازہ تحریر پر کوئی اعتراض کرے تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں اور پھر آپ کے بارے میں کچھ کہا جائے اس کی برداشت بھی مشکل سے ہوتی ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں اس کا اثر تحریک پر اور اس واسطہ سے اقامت دین کے فریضہ پر پڑ جاتا ہے۔ آپ کا بہت سا قیمتی وقت اس پریشان گوئی میں خرچ کر دیا۔ مگر خدا کرے اس کا نتیجہ کوئی اچھا نکلے۔"

جواب: مولانا مدنی مرحوم کے ساتھ آپ کے تعلق سے میں واقف ہوں، اور اس گہرے تعلق کے باوجود میرے اور جماعت اسلامی کے ساتھ آپ کا جو ربط ہے اسے میں آپ کی انصاف پسندی و حق پرستی کی کھلی دلیل سمجھتا ہوں جس کی اگر قدر نہ کی جائے تو ظلم ہو گا۔ لیکن رسائل و مسائل میں "نقش حیات" کی جن عبارتوں

کے متعلق ایک صاحب سے میری جو مراسلت شائع ہوئی ہے اس پر آپ کے اعتراضات میری سمجھ میں نہیں آئے۔ آپ خود بھی اگر مولانا کی عقیدت سے صرفِ نظر کر کے دوبارہ اس مسئلے پر غور کریں تو مجھے امید ہے کہ آپ بھی اپنے ان اعتراضات میں کوئی معقولیت محسوس نہ فرمائیں گے۔

"نقش حیات" جلد دوم کی جو عبارات زیر بحث ہیں، سب سے پہلے آپ خود ان کو مولانا کی کتاب میں پورے سیاق و سباق کے ساتھ ملاحظہ فرمالیں، عبارات حسب ذیل ہیں:

(۱) حضرت سید احمد صاحب بریلوی شہید رحمۃ اللہ علیہ جو کہ اس تحریک کے سردار اور بانی ہیں ان کے خط میں جو کہ وزیر گوالیار کے نام مدد طلب کرنے کے لیے لکھا گیا تھا (جس کو ہم بجنسہٖ آگے ذکر کریں گے) صاف طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ ہمارا مقصد ہندوستان کو اس بدیسی قوم (انگریز) کے مظالم سے پاک کرنا ہے۔ اس کے بعد ہندو اور مسلم مل کر بادشاہت کے لیے جس کو مناسب سمجھیں منتخب کریں"

(نقش حیات صفحہ ۵)

آگے صفحہ ۱۳، ۱۴ پر مولانا نے سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مذکورۂ بالا خط نقل فرمایا ہے مگر اس میں خط کشیدہ مضمون موجود نہیں ہے بلکہ اس میں اس کے برعکس یہ لکھا گیا ہے کہ "ایں ضعفاء را از رؤسا، کبار و عظماء عالی مقدار ہمیں قدر مطلوب است کہ خدمت اسلام بجان و دل کنند و بر مسند مملکت متمکن شوند"

(۲) "علاوہ ازیں کسی فرقے کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اس فرقے کے لیے بھی حکومت کے عہدوں اور منصوبوں (منصبوں) کے دروازے ایسے ہی کھلے رکھے جائیں جیسے کہ خود اپنے فرقہ کے لوگوں کے لیے اور ملکی و انتظامی معاملات میں کسی قسم کا کوئی تعصب نہ برتا جاتے۔ قرآن کا حکم ہے ولا یجرمنکم شنان قوم" الآیہ (صفحہ ۱۰)

۳۔ "اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد اس میں اضمحلال آنا شروع ہوا اور حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے رہے۔ تو اب علماء نے ان کی اصلاح کی کوشش کی اور اس کوشش سے ان کا مقصد ملک کی خوشحالی، امن و امان، سکون و اطمینان، ظلم و جور کی بیخ کنی اور خلقِ خدا کی عام رفاہیت و بہبود تھا۔ ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ حکومت مسلمان کی ہو یا غیر مسلم کی۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ جس کی بھی حکومت ہو انصاف کرے۔" (صفحہ ۱۱)

۴ "شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فتوے کا جو اقتباس اوپر گزر چکا ہے اس میں دو باتیں خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہیں۔۔۔ (۲) شاہ صاحب کسی ملک کے دارالاسلام ہونے کے لیے اس میں محض مسلمانوں کی آبادی کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے لیے وہ یہ بھی ضروری جانتے ہیں کہ مسلمان باعزت طریقہ پر رہیں اور ان کے شعائرِ مذہبی کا احترام کیا جاتے۔ اس سے یہ ثابت

ہوا کہ اگر کسی ملک میں سیاسی اقتدارِ اعلیٰ کسی غیر مسلم جماعت کے ہاتھوں میں ہو لیکن مسلمان بھی بہرحال اس اقتدار میں شریک ہوں اور ان کے مذہبی و دینی شعائر کا احترام کیا جاتا ہو تو وہ ملک حضرت شاہ صاحب کے نزدیک بے شبہ دار الاسلام ہوگا (صفحہ ۱۱)

حضرت شاہ صاحب کا جو فتوے مولانا نے صفحہ ۶۰ پر نقل کیا ہے وہ اس کے برعکس معنی دے رہا ہے۔ اس میں تو شاہ صاحب یہ فرماتے ہیں کہ جہاں امام مسلمین کا حکم جاری نہ ہو بلکہ کفار کا حکم چل رہا ہو وہاں بعض احکام اسلام سے تعرض نہ ہونا لاحاصل ہے۔ محض جمعہ و عیدین یا اذان و ذبح بقر کی آزادی ایسی سرزمین کو دار الاسلام نہیں بنا سکتی۔

۵۔ "بے شک سید صاحب جگہ جگہ اعلاء کلمۃ اللہ اور دین رب العلمین کی خدمت کا ذکر کرتے ہیں اور اسی کو اپنی مساعی کا محرک بتاتے ہیں لیکن آپ یہ خوب سمجھتے تھے کہ اعلائے کلمۃ اللہ کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ ایک فرقہ وار گورنمنٹ قائم کی جائے اور خود حاکم بن کر دوسرے برادرانِ وطن کو اپنا محکوم بنایا جائے بلکہ اس کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ یہ ہے کہ برادرانِ وطن کو سیاسی اقتدار میں اپنا شریک کر کے اسلامی فضائل اخلاق سے ان کے دلوں کو فتح کیا جائے۔" (صفحہ ۱۵)

عبارت نمبر ۱ کے متعلق تو کوئی شک کرنے کی گنجائش ہی نہیں کہ یہ مولانا کی اپنی ہے، کیونکہ اس سے پہلے اور بعد کوئی علامت ایسی نہیں پائی جاتی

جس کی بنا پر یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ یہ کسی اور کی عبارت نقل کی گئی ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۶ پر مولانا نے کسی البرہان نامی پرچے سے ایک اقتباس نقل فرمایا ہے جو کتابت کے معروف قاعدے کے مطابق دونوں طرف حاشیہ چھوڑ کر متن کے قلم سے خفی تر قلم میں لکھا گیا ہے اور یہ اقتباس صفحہ ۷ کی ابتدائی تین سطروں پر ختم ہو گیا ہے۔ پھر صفحہ ۷ سے مسلسل صفحہ ۱۶ تک ساری عبارت متن کے انداز میں چلتی ہے جس کے اندر جگہ جگہ دوسری کتابوں کے اقتباسات معہ حوالہ نقل ہوئے ہیں۔ تحریر و کتابت کے جو معروف قواعد ہمارے ہاں رائج ہیں ان کے لحاظ سے جو شخص بھی ان صفحات کی عبارتوں کو پڑھے گا وہ لامحالہ انہیں متن ہی کی عبارات سمجھے گا۔ لیکن صفحہ ۱۶ کا پہلا پیراگراف ختم ہوتے ہی یکایک ہمارے سامنے پھر (البرہان ع۲ جلد ۱۲ صفحہ از ۴۷ تا ۸۷) کا حوالہ آجاتا ہے اور الٹ پلٹ کر دیکھنے سے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ البرہان سے نقل کردہ عبارت کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ حوالہ صرف عبارت نمبر ۵ سے متعلق ہو جسے کسی طویل تحریر سے خلاصے کے طور پر لیا گیا ہو اور ہو سکتا ہے کہ عبارات نمبر ۲، ۳، ۴ بھی البرہان ہی سے منقول ہوں۔ اس البرہان کو ہم نہیں جانتے کہ یہ کونسا پرچہ ہے۔ دہلی کا جریدۃ برہان تو اس سے مراد نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کا نام برہان ہے، البرہان نہیں۔ اس لیے اصل کی طرف رجوع کر کے تحقیق کرنا مشکل ہے۔ تاہم اگر صفحہ ۶ سے ۱۶ تک کا پورا مضمون بھی (جس میں عبارات نمبر ۲، ۳، ۴، ۵ واقع ہوئی ہیں) البرہان کا مان لیا جائے تو اس سے پہلے اور اس کے بعد جو کچھ مولانا نے فرمایا ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ تسلیم

کرنا پڑے گا کہ مولانا اس پورے بیان کی توثیق فرما رہے ہیں، اسے استشہاداً نقل فرما رہے ہیں، اور انھوں نے اشارۃً وکنایۃً بھی اس کے کسی جز سے اختلاف نہیں فرمایا ہے۔ اس طرح جب کوئی شخص اپنے کسی بیان کی تائید میں کسی دوسرے کی عبارت نقل کرتا ہے اور اس کے کسی جزو سے اختلاف کا اظہار کیے بغیر اس کی توثیق کر دیتا ہے تو اس سے لازماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس کا ہم خیال ہے اور الفاظ میں نہیں تو معنی میں ضرور اس کے ساتھ اتفاق رکھتا ہے۔

اب ذرا ان عبارتوں کو آپ خود دیکھیے۔ ان میں کوئی باریکی یا پیچیدگی نہیں ہے کہ ایک عام آدمی ان کا مطلب نہ سمجھ سکے، اور تاویل سے ان کے مختلف مفہومات نکل سکتے ہوں۔ صاف صاف زبان میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ:

۱۔ جس ملک میں مسلم اور غیر مسلم ملے جلے آباد ہوں وہاں اسلامی حکومت قائم کرنا ایک نامناسب فعل ہے کیونکہ یہ ایک "فرقہ وار گورنمنٹ" ہو گی، اور اگر مسلمان اس میں خود حاکم بن کر دوسرے برادرانِ وطن کو اپنا محکوم بنائیں تو یہ خلافِ انصاف ہو گا۔ ایسے ملک میں صحیح طریق کار یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی مشترکہ حکومت بنے اور یہی اعلائے کلمۃ اللہ کا بھی سب سے زیادہ موثر طریقہ ہے۔

۲۔ کسی ملک کے دار الاسلام ہونے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہاں اسلام کے احکام جاری ہوں اور حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ اقتدارِ اعلیٰ

غیر مسلموں کے ہاتھ میں بھی ہو تو ملک دارالاسلام ہو سکتا ہے اگر مسلمان بھی فی الجملہ اقتدار میں شریک رہیں اور ان کے مذہبی شعائر کا احترام کیا جاتا ہے

۳۔ مسلمانوں کے ہاتھ میں بھی اگر حکومت ہو تو یہ ضروری ہے کہ غیر مسلموں کے لیے تمام عہدوں اور منصبوں کے دروازے کھلے رکھے جائیں۔ یہ خود قرآن کی تعلیم ہے اور ایسا نہ کرنا خلاف عدل ہے۔

۴۔ پچھلے دو ڈھائی سو برس میں ہمارے علماء و صلحا نے برعظیم ہند میں اصلاح احوال کی جتنی کوششیں کی ہیں ان میں سے کسی کا مقصود بھی یہاں اسلامی حکومت قائم کرنا نہ تھا۔ وہ صرف اچھی حکومت چاہتے تھے خواہ اس کے حاکم مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔

۵۔ حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید رحمہما اللہ کی تحریک کا مقصود بھی اسلامی حکومت کا قیام نہ تھا۔ وہ صرف انگریزوں کو نکالنے کے لیے اٹھے تھے اور اس کے بعد ان کے پیش نظر یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک مشترک حکومت قائم کر لیں۔

ان باتوں میں سے نمبر ۲ کے متعلق مولانا حسین احمد صاحب مرحوم نے توجہ دلانے پر صرف اتنی توضیح فرمائی تھی کہ وہ ہندوستان کی موجودہ حکومت پر دارالاسلام کی اصطلاح کا اطلاق نہیں فرماتے اور نمبر ۵ کے متعلق صرف یہ تشریح کی تھی کہ ان کے نزدیک حضرت سیّد احمد شہید کے پیش نظر سیکولر اسٹیٹ (لادینی ریاست) قائم کرنا نہ تھا۔ لیکن آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ ان توضیحات سے ان اصولی باتوں میں قطعاً کوئی فرق واقع نہیں ہوتا جو مذکورہ بالا ۵ نکات میں بیان ہوتی ہیں۔

ان میں سے ہر نکتہ اپنی جگہ جوں کا توں قائم ہے اور ہر ایک اسلام اور مسلمانوں کے لیے زہر قاتل ہے۔ اس کا زہریلا اثر صرف ہندوستان کے مسلمانوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ پاکستان تک بھی پہنچتا ہے۔ یہاں بھی جو لوگ مولانا کے شاگرد، مرید یا عقیدت مند ہیں، یا دین کے معاملہ میں ان کے علم پر اعتماد رکھتے ہیں، ان کی ایک کثیر تعداد مولانا کے ان خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی، اور ان خیالات کا اثر جو بھی قبول کرے گا اس کا نقطۂ نظر لازماً یہ بنے گا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم کرنا غلط اور مسلم و غیر مسلم کی مشترک حکومت قائم کرنا ہی صحیح ہے۔ اس کے ذہن میں دارالاسلام کی ایک سراسر غلط تعریف بیٹھ جائے گی۔ وہ ایک رواداری لادینی حکومت کو بھی اطمینان کے ساتھ دارالاسلام سمجھ لے گا اور اس کے بعد مشکل سے ایک خالص اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے کوئی تڑپ اس کے دل میں باقی رہ جائے گی۔ وہ ماضی قریب کی تمام اسلامی تحریکوں کے متعلق بھی بالکل ایک غلط تصور لے کر بیٹھ جائے گا اور یہ باور کر لے گا کہ اس دور میں ہمارے تمام دینی پیشوا اسلامی حکومت قائم کرنے کے بجائے اصولاً اسی طرز کی مشترک ہندو مسلم حکومت قائم کرنا چاہتے تھے جیسی ہندوستان کے کانگریسیوں نے قائم کی ہے اور پاکستان کے کانگریسی، عوامی لیگی، ری پبلکن اور نیشنل عوامی پارٹی کے لوگ قائم کرنا چاہتے ہیں پھر ان سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ یہ نقطۂ نظر جس شخص کا بھی بن جائیگا وہ مشکل ہی سے اس الجھن میں مبتلا ہونے سے بچ سکے گا کہ اگر فی الحقیقت انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ مسلم و غیر مسلم کے مشترک وطن میں ایک "فرقہ وار گورنمنٹ" قائم نہ کی جائے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے جو فرقہ وار

گورنمنٹ" قائم کی تھی جس کی مجلس شوریٰ میں ایک بھی غیر مسلم نہ تھا جس میں کوئی جج، کوئی گورنر، کوئی عامل، کوئی سپہ سالار غیر مسلم نہ تھا، جس میں غیر مسلم ذمی بنائے گئے تھے اور ان پر جزیہ لگایا گیا تھا۔ جس میں خالص اسلامی آئین وقانون رائج تھا اور نظم حکومت کی پالیسی متعین کرنے میں بھی غیر مسلموں کا کوئی دخل نہ تھا، آخر اس کو کس دلیل سے انصاف قرار دیا جائے گا؟ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کا راجح طریقہ قرار پائے گا یا مرجوح؟ وہ حکومت ہمارے لیے معیار قرار پائے گی یا مغل حکومت جسے مولانا "نقش حیات" میں بار بار نظیر کے طور پر پیش کرتے ہیں؟

یہ باتیں ہیں جن کے متعلق آپ مجھ سے چاہتے ہیں کہ میں ان پر گرفت نہ کروں اور ان کے معاملہ میں خاموشی اختیار کروں۔ میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ کسی وقت تنہائی میں خالصتہً لوجہ اللہ اپنے ضمیر سے پوچھیے کہ کیا واقعی مجھ سے آپ کا یہ مطالبہ حق بجانب ہے؟ اس میں دین اور اس کی مصلحت کی بہ نسبت اپنا استاد اور اپنا گروہ تو آپ کے لیے عزیز تر نہیں ہو گیا ہے؟ اس کے لیے جو دلائل و وجوہ آپ نے بیان کیے ہیں ان میں سے کسی کے اندر بھی خود آپ کوئی وزن محسوس کرتے ہیں؟

آپ کہتے ہیں کہ حضرت مدنیؒ کی وفات کے بعد ایسی باتیں کرنا مناسب نہ تھا، لیکن یہ بات اسی صورت میں درست ہو سکتی ہے جبکہ حضرت موصوف کے ذاتی عیوب پر کوئی کلام کیا جاتے۔ ایسی بات جو شخص بھی کرے اسے ملامت کرنے میں آپ کے ساتھ میں بھی شریک ہوں گا۔ لیکن دینی معاملات یا اجتماعی مسائل میں کسی شخص کے خیالات پر بحث نہ کرنے کے لیے یہ کوئی دلیل

نہیں ہے کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کا انتقال تو بے شک ہو چکا ہے مگر اس کے خیالات تو شائع شدہ صورت میں موجود ہیں اور رہیں گے اور لوگوں کے ذہن پر اثر ڈالتے رہیں گے۔ ان پر اگر اس دلیل سے بحث کرنا غیر مناسب ہے کہ ان خیالات کا پیش کرنے والا دنیا سے رخصت ہو چکا ہے تو یہ چیز مولانا حسین احمد صاحب ہی کے لیے خاص کیوں ہو۔ پھر تو کسی وفات یافتہ شخص کے کارنامے پر بھی بحث کرنا درست نہ ہوگا اور ہمیں تمام ہی پچھلے لوگوں کے غلط خیالات کو پھیلنے کی کھلی چھٹی دینی پڑے گی۔

آپ کہتے ہیں کہ مستفسر نے مولانا مرحوم کے ارشادات کے متعلق تم سے جو سوال کیا تھا اس کا جواب تمہارے ذمہ تو نہ تھا۔ تمہیں اس کا جواب دینے کی کیا ضرورت تھی؟ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر مولانا کے سوا کسی اور شخص کے گمراہ کن خیالات سے پریشان ہو کر کسی نے مجھ سے سوالات کیے ہوتے اور میں نے اس کے جواب میں ان خیالات کی تردید کر کے اسے اور دوسرے بندگانِ خدا کو ان سے بچانے کی کوشش کی ہوتی تو کیا اس وقت بھی آپ مجھ سے یہی بات کہتے جواب کہہ رہے ہیں؟ اس سوال کا جواب مجھے دینے کے بجائے آپ اپنے ضمیر ہی کو دے لیں اور خود ہی غور کریں کہ اس خاص معاملے میں عام حالات سے مختلف طرزِ عمل جو آپ اختیار فرما رہے ہیں اس کا اصل محرک کونسا جذبہ ہے اور آیا وہ للہ وفی اللہ ایک محمود جذبہ ہے یا اس میں نادانستہ اسی تحزب اور اپنوں کی جانبداری کا وہ لوث شامل ہو گیا ہے جو خدا کے بے لاگ دین کی نظر میں کبھی محمود نہیں ہو سکتا۔

آپ کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت مدنی کی محبت و عقیدت تمام علماء اور دیندار طبقہ کے سویدائے قلب میں جاگزین ہے اور ان کے خیالات پر تنقید کرنا ان لوگوں کو ناگوار ہوتا ہے، اس لیے مجھے یہ کام نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے وہ لوگ میری اور جماعت کی تائید سے ہاتھ کھینچ لیں گے۔ میں اس کے جواب میں مختصراً صرف اتنا عرض کرنا کافی سمجھتا ہوں کہ جو شخص میرے اور جماعت اسلامی کے اس کام کو میرا اور جماعت کا کوئی ذاتی "کاروبار" سمجھتا ہو اور اس میں بطور احسان ہاتھ بٹانے آرہا ہو تو وہ سخت گنہگار ہے کیونکہ دین کے نام سے کاروبار کرنا اور اس کاروبار میں حصہ لینا وہ بدترین تجارت ہے جس سے زیادہ خسارے کا سودا شاید ہی کوئی ہو۔ کسی نے اگر آج تک یہ سمجھتے ہوئے ہماری تائید کی ہے تو اب اسے توبہ کرنی چاہیئے اور فوراً اس تائید سے دستکش ہو جانا چاہیئے۔ لیکن اگر کوئی ہمارے اس کام کو خالصتہً للہ دین کا کام سمجھ کر ہماری تائید کرنے آتا ہے تو اس کے اور ہمارے درمیان جو معاملہ بھی ہو گا خالص حق پرستی کی بنیاد پر ہو گا۔ نہ ہم اس سے کوئی مطالبہ حق کے خلاف کر سکتے ہیں اور نہ وہ ہم سے خلافِ حق کوئی مطالبہ کر سکتا ہے۔ کسی کے پاس اگر اس مطالبے کے لیے کوئی دلیل ہو کہ "دنیا میں اور جو بھی دینی تصورات اور اصولوں کے خلاف کوئی کام کرے اس کی تو خبر لے ڈالو مگر ہمارے حضرتوں میں سے کوئی یہ کام کرے تو اس پہ دم نہ مارو"۔ تو وہ براہِ کرم اپنی دلیل پیش کرے۔ ہم بھی غور کریں گے کہ قرآن و حدیث یا سلف صالحین کے اسوے میں اس دلیل کو کوئی مقام حاصل ہے یا نہیں

اور اگر ایسی کوئی دلیل اس کے پاس نہیں ہے تو ہم صاف کہتے ہیں کہ اس کا یہ مطالبہ ماننے کے لیے ہم تیار نہیں ہیں۔ اس طرح کی شرطیں لے کر جو لوگ خدا کا کام کرنے کے لیے ہمارے ساتھ آئیں وہ ہمارے لیے سبب قوت نہیں بلکہ سراسر سبب ضعف ہیں۔ ایسے لوگ دنیا میں کبھی حق قائم نہیں کر سکتے۔ وہ سب بیک وقت ہماری تائید سے دستکش ہو جائیں تو ہم اللہ کا شکر کریں گے۔

آپ نے بار بار اس بات کی بھی شکایت کی ہے کہ میں نے حضرت مدنی کی عبارتوں پر تنقید کرنے میں بڑا دل آزار اندازِ بیان اختیار کیا ہے اور بہت نیچی سطح پر اتر گیا ہوں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ایک دل آزاری تو وہ ہے جو ایسی صورت میں لازماً ہر عقیدت مند آدمی کی ہو جاتی ہے جبکہ اس کے کسی محبوب بزرگ کے خیالات کی تردید کی جائے۔ یہ چیز بجائے خود ہی تکلیف دہ ہے، اس لیے اس کا شکوہ آپ کریں تو میں اس کی کوئی تلافی نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر اس سے زائد کوئی چیز آپ کو میری تحریر میں نظر آتی ہو جس پر واقعی "دل آزاری" کے معروف معنی کا اطلاق ہو سکتا ہو تو اس کی نشاندہی فرمائیں۔ مجھے اس پر اظہارِ معذرت کرنے میں ذرہ برابر تامل نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ اپنے بزرگوں کے معاملہ میں شاگردوں اور مریدوں کی زبان استعمال کرنا آپ حضرات کے لیے تو بلاشبہ درست ہے اور آپ کو ایسا ہی کرنا چاہیے، مگر دنیا بھر سے آپ یہ مطالبہ نہیں کر سکتے کہ وہ بھی آپ کے بزرگوں کے سامنے شاگردانہ اور مریدانہ عجز و نیاز مندی اختیار کرے۔ آپ کے اپنے گروہ میں دوسرے گروہوں کے بڑوں سے اختلاف کرتے ہوئے جو بہتیرے

بہتر اسالیب بیان استعمال ہوتے ہیں انہی کو آپ معیار مان لیں اور اس کے لحاظ سے دیکھیں کہ میری ان دونوں تحریروں میں جن کا آپ نے شکوہ کیا ہے کیا یہ چیز واقعی قابلِ شکایت ہے۔

آپ نے اشارۃً یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ میں نے مولانا مرحوم کی کتاب سے عبارات نقل کرنے اور ان سے نتائج نکالنے میں وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو بعض مولوی صاحبان نے میرے ساتھ اختیار کیا ہے۔ میں نے آپ کی اس تنبیہ کے بعد پھر ایک مرتبہ نقشِ حیات کو پڑھ کر یہ تحقیق کرنے کی پوری کوشش کی کہ کہیں واقعی مجھ سے ایسی کوئی زیادتی تو نہیں ہو گئی ہے، مگر خدا گواہ ہے کہ مجھے ایسی کوئی چیز نہ ملی۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں گا اگر آپ واضح طور پر نشاندہی فرمائیں کہ میں نے کہاں عبارات میں کوئی تحریف کی ہے۔ یا سابق و لاحق سے کاٹ کر ان میں کوئی نئے معنی داخل کیے ہیں، یا ان سے ایسے نتائج اخذ کیے ہیں جو خود ان عبارات سے نہیں نکلتے۔ ایسی جس زیادتی کی بھی آپ نشاندہی فرمائیں گے مجھے اس پر اعترافِ قصور اور اظہارِ ندامت میں ذرّہ برابر تامل نہ ہو گا۔

آپ نے یہ خیال بھی ظاہر فرمایا ہے کہ میں نے ان عبارات پر گرفت کرنے میں انتقامی جذبہ سے کام لیا ہے۔ یہ بد گمانی آپ کرنا چاہیں تو کریں، مگر میں عنداللہ دوسروں کے گمانوں کے لیے نہیں بلکہ اپنی نیّت ہی کے لیے جواب دہ ہوں۔ میرے نزدیک دین کا نام لے کر ذاتی محبت و نفرت یا نفسیاتی جذبات و اغراض کے لیے کوئی بات یا کام کرنا بدترین فریب کاری

ہے اور میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب اور ان کے زیر قیادت دیوبند کے ایک خاص اسکول کی سیاست کو میں برسوں سے دیکھ رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اس کو پوری ایمانداری کے ساتھ غلط سمجھا اور کہا ہے۔ اس سیاست کی تائید میں اسلام اور اسلامی تاریخ کی جو عجیب تعبیریں یہ سکول کرتا رہا ہے وہ میرے نزدیک نہایت غلط اور دین واہل دین کے لیے سخت مضر ہیں۔ اور میری قطعی رائے، خوب سوچی سمجھی رائے، بالکل بے لاگ رائے یہ ہے کہ انگریزی دور کی آمد پر سرسید اسکول جس مقام پر کھڑا ہوا تھا بدقسمتی سے ہندو دور کی آمد پر اسی مقام پر دیوبند کا حسین احمد اسکول آکھڑا ہوا، بلکہ مزید افسوس یہ ہے کہ اس سے بھی کچھ آگے بڑھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس رائے کی بنیاد محض نقش حیات کی چند عبارات نہیں ہیں بلکہ اس اسکول کا وہ پورا کارنامہ ہے جو پچھلے پندرہ بیس سال کی مدت میں اس سے ظہور میں آیا ہے

آپ نے مولانا کے بعض عقیدت مندوں کی اس رائے کا ذکر بھی فرمایا ہے کہ یہ "مستفسر بھی بالکل فرضی ہے تاکہ اس طریقہ سے اسی قسم کے جواب کی اشاعت کا موقع مہیا کر دیا جائے"۔ دوسرے الفاظ میں ان حضرات کا مطلب یہ ہے کہ دراصل مجھے کسی شخص نے ان عبارات کے متعلق کوئی خط نہیں لکھا تھا بلکہ میں خود مولانا حسین احمد مرحوم پر حملہ کرنا چاہتا تھا، اس لیے یونہی ایک خط و کتابت گھڑ لی گئی۔ واقعہ کے اعتبار سے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصل خط و کتابت دفتر میں محفوظ ہے اور وہ صاحب بھی ہندوستان میں زندہ موجود ہیں جن کے خطوط کے جوابات میں نے دیتے ہیں۔ آپ حضرات جب چاہیں وہ خط و کتابت بھی

دیکھ سکتے ہیں اور خود اصل کاتب سے بھی اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ رہی اس گمان کی اخلاقی حیثیت تو جنہوں نے بے تکلف یہ افسانہ تصنیف کر ڈالا وہ خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر سوچیں کہ یہ کیسا تزکیۂ نفس و اخلاق ہے جو مولانا مرحوم کے فیضِ صحبت سے ان کو میسر آیا ہے۔ اپنے گروہ کے لوگوں کے معاملے میں تو ان کے احساسات اتنے نازک ہیں کہ ان کی صریح غلطیوں پر بھی کوئی تنقید وہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مگر دوسروں کے دین و اخلاق پر ہر حملہ ان کے نزدیک بالکل مباح ہے حتیٰ کہ اپنے دل سے ایک خیالی الزام بھی تصنیف کر کے وہ ان کے سر تھوپ سکتے ہیں۔ اس پر میں اس کے سوا اور کیا کہوں کہ خدا ان حضرات کو وہ حقیقی تقویٰ عطا فرمائے جس کی بنا پر آدمی زبان سے ایک بات نکالنے سے پہلے سوچ لیتا ہے کہ وہ خدا کو اس کا کیا جواب دے گا۔

(ترجمان القرآن ذی قعدہ ۱۳۷۷ھ۔ جولائی ۱۹۵۸ء)

طریقِ انتخاب کے مسئلے میں ریفرنڈم

سوال: طریقِ انتخاب کے مسئلے میں جماعت اسلامی نے ریفرنڈم کرانے کا جو مطالبہ کیا تھا اس پر مختلف حلقوں کی طرف سے مختلف اعتراضات کیے گئے ہیں۔ میں ان کا خلاصہ پیش کر کے آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس ان اعتراضات کا کیا جواب ہے۔

۱۔ جداگانہ انتخاب اگر دین اور شریعت کے اصول اور احکام کا

لازمی تقاضا ہے تو اس پر عوام سے استصواب کے کیا معنی؟ کیا اسی طرح کل نماز اور روزے پر بھی استصواب کرایا جائے گا؟ کیا آپ یہ اصول قائم کرنا چاہتے ہیں کہ عوام کی اکثریت جس چیز کو حق کہے وہ حق اور جس چیز کو باطل کہے وہ باطل؟ فرض کیجئے کہ ریفرنڈم میں اکثریت کا فیصلہ مخلوط انتخاب کے حق میں نکلے تو کیا آپ اس کو حق مان لیں گے اور پھر جداگانہ انتخاب اسلامی اصول و احکام کا تقاضا نہ رہے گا۔

۲۔ جداگانہ اور مخلوط دونوں ہی طریقے غیر اسلامی ہیں، کیونکہ اسلام کی رُو سے تو مجلس شوریٰ میں غیر مسلم کی نمائندگی ہی اصولاً غلط ہے۔ آپ جب جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کرتے ہیں تو کیا اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ نے اسلامی ریاست کی مجلس شوریٰ میں غیر مسلم کی شرکت کا اصول مان لیا؟

۳۔ استصواب رائے کی تجویز لاکر آپ نے طریق انتخاب کے مسئلے کو اس خطرے میں ڈال دیا ہے کہ شائد اس کا فیصلہ مخلوط انتخاب کے حق میں ہو۔ آخر آپ کے پاس اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ اس کا نتیجہ لازماً جداگانہ طریق انتخاب ہی کے حق میں ہو گا۔

۴۔ یہ عجیب بات ہے کہ آپ مخلوط انتخاب کے مخالف ہیں مگر طریق انتخاب کا فیصلہ مخلوط رائے شماری سے کرانے کے لیے تیار ہیں۔ آخر ریفرنڈم بھی تو مخلوط ہی ہو گا۔

۵۔ آپ طریقِ انتخاب کے مسئلے پر ریفرنڈم کرانے کے بجائے یہ کیوں نہیں کرتے کہ ملک کے آئندہ انتخاباتِ عام میں اس مسئلے پر الیکشن لڑیں؟ اگر عوام الناس جداگانہ انتخاب کے حامی ہیں تو وہ انہی لوگوں کو ووٹ دیں گے جو اس طریق انتخاب کے حامی ہوں گے اس طرح اس مسئلے کا تصفیہ ہو جائے گا۔

۶۔ ریفرنڈم کے لیے ملک کے موجودہ دستور میں کوئی گنجائش نہیں ہے، اس لیے ناگزیر ہو گا کہ پہلے قومی اسمبلی اس مقصد کے لیے دستور میں ترمیم کرے، اور ترمیم کے لیے لامحالہ ۲/۳ اکثریت درکار ہو گی۔ سوال یہ ہے کہ جب مخلوط انتخاب کے قانون کو بدلنے کے لیے مجرّد اکثریت بہم نہیں پہنچ رہی ہے تو ریفرنڈم کے لیے ۲/۳ اکثریت کہاں سے بہم پہنچے گی؟

۷۔ جمہوری ممالک میں بالعموم ریفرنڈم کے ذریعہ سے ملکی مسائل کا فیصلہ کرنے کے بجائے پارلیمنٹ یا ایوان نمائندگان ہی کو آخری فیصلے کے اختیارات دیئے گئے ہیں۔ براہ راست عوام سے مسائل کا تصفیہ کرانے میں بہت سی قباحتیں ہیں جن کی وجہ سے یہ طریقہ جمہوری ملکوں میں مقبول نہیں ہوا ہے۔

یہ ہیں وہ بڑے بڑے اعتراضات جو ریفرنڈم کی تجویز پر میں نے سنے یا پڑھے ہیں۔ ان سے کم از کم شک یا تذبذب کی کیفیت تو ذہنوں میں پیدا ہو ہی جاتی ہے، اس لیے مناسب ہو گا کہ آپ ان

سب کو صاف کر کے عوام کو اس مسئلے میں پوری طرح مطمئن کر دیں۔

جواب :- ا۔ پہلا اعتراض جن اصحاب نے پیش فرمایا ہے ان کو شاید معلوم نہیں ہے کہ پاکستان کا نظام حکومت ابھی تک دین اور شریعت کے اصول و احکام پر قائم نہیں ہوا ہے بلکہ یہ اس جمہوری دستور پر قائم ہے جو اکثریت کو فیصلہ کن اختیار دیتا ہے۔ اگر کہیں یہ بات یہاں طے ہو چکی ہوتی کہ جو کچھ دین اور شریعت کی رو سے ثابت ہو وہی ملک کا قانون ہوگا تو پھر رونا ہی کس بات کا تھا۔ یہی ایک مسئلہ کیا معنی کسی مسئلے کو بھی دین کے منشا کے مطابق حل کرنے میں کوئی زحمت پیش نہ آتی۔ جس مسئلے میں بھی دلائل شرعیہ سے ایک حکم ثابت کر دیا جاتا وہ خود بخود قانون بن جاتا اور اس کے خلاف جو قانون بھی ہوتا وہ آپ سے آپ منسوخ ہو جاتا۔ لیکن آخر یہ بات کس سے چھپی ہوتی ہے کہ یہاں عملاً یہ صورت حال موجود نہیں ہے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے نیشنل اسمبلی کی اکثریت نے مخلوط انتخاب کا قانون پاس کیا اور وہ ملک کا قانون بن گیا۔ اب اس قانون کو اگر بدلا جا سکتا ہے تو اکثریت ہی کے فیصلے سے بدلا جا سکتا ہے ورنہ تمام علماء مل کر بھی اگر متفقہ فتویٰ دے دیں کہ مخلوط انتخاب اسلام کے خلاف ہے تب بھی قانون اپنی جگہ جوں کا توں قائم رہے گا۔ ایسی حالت میں خواہ مخواہ خیالی باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟ آپ طریق انتخاب کے اس ملحدانہ قانون کو واقعی بدلوانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے وہ طریقہ اختیار کیجیے جو موجودہ جمہوری نظام میں ممکن العمل اور موثر ہو سکتا ہے۔ ایسا نہ کریں گے تو حاصل اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ آپ دلائل و براہین کے انبار لگاتے رہیں گے اور انتخابات مخلوط بنیاد

پر ہوتے رہیں گے۔

یہ کہنا کہ کیا کل نماز اور روزے پر بھی ریفرنڈم کرایا جائے گا، ایک اور بے خبری کی دلیل ہے۔ ان حضرات کو یہ معلوم نہیں ہے کہ یہاں آج نماز اور روزے کی جو آزادی حاصل ہے وہ بھی اس بنا پر نہیں ہے کہ شریعت سے یہ احکام ثابت ہیں بلکہ صرف اس بنا پر ہے کہ دستور نے بنیادی حقوق کے سلسلے میں باشندوں کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کا حق دیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ملک کی مجالس قانون ساز اکثریت کے ووٹ سے نماز اور روزے کے احکام میں بھی ردوبدل کر سکتی تھیں اور اس کے ایسے قوانین سے نجات پانے کی کوئی سبیل اس کے سوا نہ ہو سکتی تھی کہ یا تو بغاوت کیجیے، ورنہ جمہوری طریقے سے فیصلہ کرانے کے لیے ریفرنڈم کا مطالبہ کیجیے۔

مجلس قانون ساز کے فیصلے اور ریفرنڈم کے فیصلے میں درحقیقت اصولی حیثیت سے کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں جگہ اکثریت ہی کا فیصلہ مؤثر ہوتا ہے۔ فرق صرف عملی صورت کا ہے۔ ایک جگہ مجلسِ قانون ساز کے ارکان کی اکثریت فیصلہ کرتی ہے اور دوسری جگہ ملک کے عام باشندوں کی اکثریت۔ اب یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جو لوگ مجالس قانون ساز کے معاملے میں اکثریت کے اختیاراتِ قانون سازی کو مانے بیٹھے ہیں وہ عوام کی اکثریت کے اختیار کا نام سن کر شور مچانے لگتے ہیں۔

ریفرنڈم کے متعلق یہ بات بھی ان حضرات کو معلوم نہیں ہے کہ وہ حق اور باطل کا فیصلہ کرنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ یہ فیصلہ کرنے کے لیے ہوتا ہے کہ ملک کا قانون کیا ہو اور کیا نہ ہو۔ جس چیز کو ہم باطل سمجھتے ہیں اگر ریفرنڈم میں اکثریت

کا فیصلہ اس کی تائید میں ہو جائے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم اسے حق مان لیں گے، بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ملک کا قانون وہ چیز قرار پائے گی جس کی تائید میں اکثریت نے فیصلہ دیا ہے۔ ہمیں اس کے بعد بھی یہ حق حاصل رہے گا کہ اسے باطل کہیں، اس کے بطلان پر دلائل لائیں، اور عوام کی رائے کو اس کے خلاف تیار کرتے رہیں، یہاں تک کہ عوام ہی کی اکثریت کو فیصلہ بدلنے پر راضی کرلیں۔ آخر اب جو اکثریت کے فیصلے سے ملک کی اسمبلیوں میں قوانین بنتے ہیں ان میں سے کس قانون کا بن جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اقلیت نے اس کو حق مان لیا اور اس کے خلاف اپنی رائے کو باطل تسلیم کر لیا؟

۲۔ دوسرا اعتراض جن لوگوں نے پیش کیا ہے ان کی پوزیشن بھی عجیب ہے جب دستور میں غیر مسلموں کو نمائندگی کا حق دیا گیا اُس وقت وہ خاموش رہے۔ جب مخلوط انتخاب کا قانون پاس ہوا اس وقت بھی وہ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ آج بھی غیر مسلموں کے حق نمائندگی کو دستور سے منسوخ کرانے کے لیے وہ کوئی ایجی ٹیشن نہیں فرما رہے ہیں۔ یہ نکتہ اُن کو صرف اس وقت سوجھتا ہے جب جُداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ دراصل یہ اپنے مخصوص پیشواؤں کی پیروی میں مسلم و غیر مسلم کی متحدہ قومیت کے قائل ہیں اور ان کے پیشِ نظر صرف یہ ہے کہ کسی طرح مخلوط انتخاب یہاں رائج ہو جائے۔ غیر مسلم کے حق نمائندگی کا انکار صرف ایک بہانہ ہے جو اپنی اغراض کے لیے انہوں نے استعمال کرنا شروع کیا ہے، ورنہ وہ بتائیں کہ اپنے ان پیشواؤں کے متعلق ان کی کیا رائے ہے جنہوں نے ہندوستان میں لادینی سیاست کے

قیام کی حمایت فرمائی تھی۔

رہا ان کا اصل اعتراض، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے مخلوط اور جُداگانہ انتخاب کی حیثیت ہرگز یکساں نہیں ہے۔ مخلوط انتخاب کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ ایک ملک کے رہنے والے تمام باشندے، خواہ وہ مسلم ہوں یا ہندو یا عیسائی یا پارسی، سب ایک قوم ہیں، ملک کی حکومت اس واحد قومیت کی مشترک حکومت ہے، اور اسے چلانے کا کام ان لوگوں کے سپرد ہونا چاہیے جو بلا امتیاز دین و مذہب اس قوم کے تمام افراد کے مشترک نمائندے ہوں۔ یہ نظریہ سرے سے اسلامی ریاست ہی کے تصوّر کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ اس پر جو نظامِ حکومت قائم ہوگا وہ صرف لادینی ہوگا۔ اس میں اسلام اور دوسرے مذاہب ایک سطح پر آجائیں گے اور ان میں سے کسی کو بھی ملک کے معاملات میں دخل دینے کا حق نہ ہوگا۔ اس کی اسمبلیوں میں منتخب ہوکر آنے والے نمائندے اپنی شخصی حیثیت میں خواہ مسلم یا ہندو یا عیسائی ہوں، مگر نمائندہ ہونے کی حیثیت سے وہ صرف "پاکستانی قوم" کے نمائندے ہوں گے اور ان کو کسی مذہب یا مذہبی گروہ کی طرف سے بولنے کا حق نہ ہوگا۔ اس کے بعد یہاں موجودہ دستور کی اُن دفعات کے بھی باقی رہنے کا کوئی امکان نہیں ہے جنہیں ہم اسلامی دفعات کہتے ہیں۔ کجاکہ یہاں کبھی پورے معنوں میں اسلامی حکومت قائم ہونے کی امید کی جا سکے۔ اب کون صاحبِ عقل آدمی کہہ سکتا ہے کہ یہ نظریہ اور جداگانہ انتخاب کا نظریہ دونوں اسلامی نقطۂ نظر سے برابر کی حیثیت رکھتے ہیں؟ جداگانہ انتخاب قومیت کی بنیاد دین پر رکھتا ہے اور اس سے مسلمانوں کی مستقل قومیت برقرار

رہتی ہے۔ اس کے ذریعہ سے مسلمان نمائندے صرف مسلمانوں کی رائے سے منتخب ہوں گے اور وہ اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے بولنے کے مجاز ہوں گے۔ ان نمائندوں کی اکثریت اگر اسلامی ذہنیت رکھنے والی ہو تو وہ موجودہ دستور کی دی ہوئی گنجائشوں سے فائدہ اٹھا کر نظام حکومت کو اسلام کی راہ پر چلا سکے گی اور اس صورت میں ہر وقت یہ ممکن ہوگا کہ دستور کو بھی بدل کر پورا پورا اسلامی بنا دیا جائے۔ اس نظام میں زیادہ سے زیادہ اگر کوئی قباحت ہے تو صرف یہ کہ اس کے اندر غیر مسلم نمائندے بھی قانون سازی اور حکومت کی رہنمائی میں حصہ دار ہوں گے۔ اس چیز کی اصلاح اس صورت میں تو کسی نہ کسی وقت ہو سکے گی جب کہ نظام حکومت کی بنیاد اسلامی رہے۔ لیکن مخلوط وطنی قومیت کا نظریہ قائم ہو جانے کے بعد تو سرے سے یہ بنیاد ہی باقی نہ رہے گی۔

۳۔ تیسرا اعتراض صرف ایک واہمہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر پورے ملک میں طریق انتخاب کے مسئلے پر استصواب رائے ہو تو مخلوط انتخاب کے حق میں فیصلہ ہونے کا ایک فی صدی بھی امکان نہیں ہے۔ جہاں تک مغربی پاکستان کا تعلق ہے، یہاں ہر شخص جانتا ہے کہ عوام اور خواص کی بڑی عظیم اکثریت اس طریق انتخاب کی سخت مخالف ہے حتیٰ کہ اُن لوگوں کے خلاف یہاں شدید نفرت پائی جاتی ہے جو اس لعنت کو پاکستان میں لانے کے موجب ہوتے ہیں۔ رہا مشرقی پاکستان تو اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ وہاں مسلمانوں کی رائے کم از کم ۹۰ فیصدی جداگانہ انتخاب کے حق میں ہے اور اب تو وہاں کے عوام ہی نہیں تعلیم یافتہ طبقے کی اکثریت بھی مخلوط انتخاب

کی مخالفت ہو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود غرض سیاسی لیڈر جو محض اپنے اقتدار کے لیے سودے بازی کر کے اس ملعون طریق انتخاب کو رائج کرنے کے ذمہ دار ہیں، ریفرنڈم کا نام سنتے ہی کانپ اٹھتے ہیں، کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ ورنہ اگر ریفرنڈم میں ان کے جیتنے کا کچھ بھی امکان ہوتا تو وہ اس چیلنج کا سامنا کرنے سے یوں نہ گھبراتے۔

۴۔ چوتھے اعتراض کو پیش کرنے والے حضرات شائد اس غلط فہمی میں ہیں کہ یہاں غیر مسلموں کو ووٹ دینے کا حق حاصل نہ تھا اور اب یہ بات ہم نے بطورِ خود تجویز کر دی ہے کہ ریفرنڈم میں ان کی رائے بھی لی جاتے۔ حالانکہ ملک کا دستور پہلے ہی یہ حق ان کو دے چکا ہے اور اس دستور کے تحت جو رائے شماری بھی کسی ملکی مسئلے پر ہو گی اس سے ان کو الگ نہ کیا جا سکے گا۔

۵۔ انتخاباتِ عام سے پہلے جس بنا پر ہم طریق انتخاب کے مسئلے کا فیصلہ ریفرنڈم کے ذریعے سے کرانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جاتے تو لامحالہ ملک کے پہلے انتخابات مخلوط بنیاد ہی پر ہوں گے، اور اس طریق انتخاب کی تبدیلی صرف انتخابات کے بعد ہی ہو سکے گی جس کا کوئی فائدہ دوسرے انتخابات کی نوبت آنے تک مترتب نہ ہو سکے گا۔ اب یہ بات ہم مشرقی پاکستان کے حلقاتے انتخاب کا پورا تجزیہ کر کے ناقابلِ تردید اعداد و شمار سے ثابت کر چکے ہیں کہ پہلا ہی انتخاب جو مخلوط بنیاد پر ہو گا اس کی بدولت وہاں ایسے لوگ بڑی تعداد میں منتخب ہو کر آجاتیں گے جو بنگالی قوم پرستی کے نشے میں سرشار ہیں اور آج بھی متحدہ بنگال کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ لوگ اگر وہاں طاقت

پکڑ گئے تو دوسرے انتخاب کی نوبت آنے سے پہلے ہی چند سال کے اندر وہ پاکستان کی وحدت و سالمیت پر ایک کاری ضرب لگا چکے ہوں گے۔ اس خطرے کو جو لوگ برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں انہیں اختیار ہے کہ ریفرنڈم کی مخالفت کر کے مخلوط بنیاد پر انتخاباتِ عام منعقد کرانے کی راہ ہموار کرتے رہیں۔ لیکن جو لوگ اس کے خطرناک نتائج کا کوئی احساس رکھتے ہیں ان کی پوزیشن سمجھنے سے ہم بالکل قاصر ہیں۔

۶۔ چھٹا اعتراض ہمارے نزدیک دستوری پوزیشن سے سراسر ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ طریقِ انتخاب پر ریفرنڈم کرانے کے لیے دستور میں کسی ترمیم کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، کیونکہ دستور کی کوئی دفعہ اس خاص مسئلے پر یا کسی ملکی مسئلے پر بھی ریفرنڈم کرانے میں مانع نہیں ہے جسے بدلے بغیر یہ کام نہ کیا جا سکتا ہو۔ دستور نے طریقِ انتخاب کا فیصلہ کرنے کے لیے نیشنل اسمبلی کو صرف ایک دفعہ دونوں صوبائی اسمبلیوں سے رائے لینے کا پابند کیا تھا، سو یہ شرط پوری کی جا چکی ہے۔ اس پابندی کا تقاضا پورا ہو جانے کے بعد اب اسمبلی پر کوئی پابندی نہیں ہے جسے رفع کرنے کے لئے کسی دستوری ترمیم کی حاجت ہو۔ اور اس پابندی کو کسی ہیر پھیر سے بھی یہ معنی نہیں پہناتے جا سکتے کہ نیشنل اسمبلی دونوں صوبائی اسمبلیوں سے رائے لینے کے علاوہ اگر کسی اور طریقے سے بھی رائے عام معلوم کرنے کی ضرورت محسوس کرے تو دستور ایسا کرنے میں مانع ہے۔ اس لیے یہ اسمبلی جب چاہے ریفرنڈم کرانے کے لیے ایک مجرد اکثریت سے ایک قانون پاس کر سکتی ہے۔

۷۔ ساتویں اعتراض میں اوّل تو یہی بات غلط کہی گئی ہے کہ جمہوری ممالک میں بالعموم ریفرنڈم کا طریقہ رائج نہیں ہے۔ یہ بات صرف اُن ممالک کے حق میں صحیح ہے جو برطانوی جمہوریت کے نقال یا فرانسیسی طرز جمہوریت کے مقلد ہیں۔ باقی رہے دوسرے جمہوری ممالک تو ان میں یہ طریقہ بالعموم رائج ہے۔ سوئٹزرلینڈ تو اس معاملہ میں مشہور رہی ہے۔ اس کے علاوہ آسٹریلیا، کینیڈا، نیوزی لینڈ اور آئرش فری اسٹیٹ کے دستوروں میں بھی اس کے متعلق واضح دفعات موجود ہیں۔ آسٹریلیا میں سنہ ۱۹۱۰ء سے سنہ ۱۹۲۵ء تک ۱۲ مرتبہ اور نیوزی لینڈ میں سنہ ۱۹۱۱ء سے سنہ ۱۹۲۸ء تک ۶ مرتبہ ریفرنڈم ہو چکا ہے۔ کینیڈا میں بھی کئی مرتبہ دستوری مسائل پر ریفرنڈم ہوا ہے اور لوکل گورنمنٹ کے مسائل کا فیصلہ کرنے کے لیے تو وہاں کثرت سے یہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ یورپ میں آسٹریا، جرمنی، البسٹونیا، لتھوانیا، لیٹویا اور چیکوسلوواکیہ کے جمہوری دستور ریفرنڈم کے متعلق اہم دفعات پر مشتمل ہیں۔ امریکہ کی دو ریاستوں کے سوا باقی تمام ریاستوں میں دستوری مسائل پر ریفرنڈم کرانے کا طریقہ رائج ہے اور قانونی امور پر بھی ۲۱ ریاستوں میں ریفرنڈم کرایا جا سکتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بالکل خلاف واقعہ ہے کہ جمہوری ممالک میں بالعموم پارلیمنٹ یا ایوانِ نمائندگان ہی کو فیصلے کے آخری اور قطعی اختیارات دے دیئے گئے ہیں اور عوام کو قوانین بنانے یا بدلنے کے ہر اختیار سے محروم کر کے رکھ دیا گیا ہے۔

رہی یہ بات کہ عوام سے مسائل کا تصفیہ کرانے میں کچھ قباحتیں ہیں جن کی وجہ سے یہ طریقہ جمہوری ملکوں میں مقبول نہیں ہوا ہے تو درحقیقت یہ بھی ایک

دعویٰ ہے جو ناواقفیت کی وجہ سے کر دیا گیا ہے، ورنہ اصل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ایوان نمائندگان کو آخری اور قطعی اختیارات دے دینے میں کچھ ایسی قباحتیں ہیں جن کا تجربہ کرنے کے بعد جمہوری ممالک میں ریفرنڈم کے طریقے کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ امریکہ میں اس طریقے کا رواج بیسویں صدی کے آغاز سے ہوا ہے اور اس کی وجہ ایک ماہر دستوریات یہ بیان کرتا ہے۔

ممالک متحدہ امریکہ میں عوام کی طرف سے براہِ راست قانون سازی کا طریقہ رائج ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگ اپنی ریاستوں کے ارکانِ مجالسِ قانون ساز کی کارگزاری سے غیر مطمئن ہو گئے ہیں۔ قابلِ اعتماد قیادت کا فقدان، مخصوص مفادات رکھنے والوں کا ارکان مجالس سے مل مل کر ان کی رائے پر اثر انداز ہونا اور بعض بڑے بڑے سیاسی اجارہ داروں کا وقتاً فوقتاً قانون ساز مجالس پر حاوی ہو جانا، یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں دیکھ دیکھ کر انیسویں صدی کے آخری دور میں لوگ اپنے قانون سازوں سے غیر مطمئن ہوتے چلے گئے۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ اگر ہم براہ راست کام کریں تو اس سے بدتر کارگزاری تو نہ دکھائیں گے، بلکہ شاید اس سے بہتر ہی کر دکھائیں۔ اس بنا پر انہوں نے قوانین بنانے اور مجالس قانون ساز کے بنائے ہوئے قوانین کو رد کرنے کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے، نہ اس غرض کے لیے کہ روزمرّہ کے معاملات میں بالعموم وہ یہ کام کیا کریں، بلکہ صرف اس غرض کے لیے کہ جب کسی دوسرے ذریعہ سے نتیجہ مطلوب حاصل

نہ ہو تو اس ذریعہ کو استعمال کیا جاتے۔

(انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسز جلد ۸ صفحہ ۱۵۱)

اب ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ ہمارے ہاں اس آخری چارہ کار کے اختیار کرنے کی ضرورت امریکہ اور دنیا کے ہر دوسرے ملک سے زیادہ ہے جہاں کھلی کھلی دھاندلیوں اور جعلسازیوں اور زر پاشیوں سے کچھ لوگ زبردستی ایوانِ نمائندگان میں پہنچے ہوں، جہاں بڑے بڑے بااثر لوگ چور دروازوں سے پارلیمنٹ میں داخل ہوتے ہوں جہاں سازشیں اور سودے بازیاں کر کے نہایت نازک اور اہم ملکی مسائل کے متعلق ایسے قوانین بنائے جاتے ہوں جن کا اصل مقصود بس چند لوگوں کو برسر اقتدار رکھنا ہو اور جہاں حالت یہ ہو کہ ایک طرف سارا ملک چیخ رہا ہے اور دوسری طرف قانون سازی کے اجارہ دار اپنی من مانی کیے جا رہے ہیں، ایسی جگہ تو عوام کے لیے ان بددیانت قانون سازوں کی زیادتیوں سے نجات پانے کا یہ راستہ لازماً کھلنا چاہیئے، کہ جو قانون ان کی مرضی کے خلاف اور ان کے احتجاج کے علی الرغم بنایا گیا ہو اسے وہ ریفرنڈم کے ذریعہ سے بدل سکیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ جو لوگ جمہوریت پسندی کے دعوے کرتے ہیں وہ آخر کس منہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ناجائز ہتھکنڈوں سے برسرِ اقتدار آنے والے لوگ چند سال کے لیے ملک میں مختار کل بنا کر رکھ دیئے جائیں اور وہ اپنی اغراض کے لیے خواہ کیسے ہی ناروا قوانین بنا بیٹھیں، عوام کے پاس ان کے فیصلے بدلوانے کا کوئی اختیار نہ ہو۔

(ترجمان القرآن شعبان ۱۳۷۵ھ، مئی ۱۹۵۶ء)

اسلامی ریاست اور خلافت کے متعلق چند سوالات

سوال:- یہ ایک سوالنامہ ہے جو جرمنی سے ایک طالب علم نے اسلامی ریاست اور خلافت کے بعض مسائل کی تحقیق کے لیے بھیجا ہے اصل سوالات انگریزی میں ہیں۔ ذیل میں ہم ان کا ترجمہ دے رہے ہیں

۱۔ کیا اموی خلفا صحیح معنوں میں خلفاء کہلاتے جانے کے مستحق ہیں۔

۲۔ کیا اسلامی ریاست کے سربراہ کے لیے صرف خلیفہ کی اصطلاح استعمال کی جا سکتی ہے؟

۳۔ خلفائے بنو عباس خصوصاً المامون کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

۴۔ حضرت امام حسنؓ حضرت امام حسینؓ اور ابن زبیرؓ کی سیاسی سرگرمیوں کے متعلق آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟ آپ کی نظر میں ۶۸۰ء میں ملتِ اسلامیہ کا اصل رہنما کون تھا؟ حسینؓ یا یزید؟

۵۔ کیا اسلامی ریاست میں خروج ایک نیکی کا کام قرار پا سکتا ہے۔

۶۔ اگر خروج کرنے والے مساجد یا دوسرے مقدس مقامات (حرم اور کعبہ) میں پناہ گزیں ہوں تو ایسی صورت میں اسلامی ریاست کا ایسے لوگوں کے ساتھ کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے؟

۷۔ وہ ایسے کون سے ٹیکس ہیں جو ایک اسلامی ریاست اپنے شہریوں سے ازروئے قرآن و سنت وصول کرنے کی مجاز ہے؟

۸۔ کیا کوئی خلیفہ ایسا کام بھی کر سکتا ہے جو سابق خلفاء کے طرزِ عمل سے مختلف ہو؟

۹۔ حجاج بن یوسف کو بحیثیت گورنر اور منتظم آپ کیا حیثیت دیتے ہیں؟

۱۰۔ کیا اسلامی ریاست اس بات کا استحقاق رکھتی ہے کہ وہ اپنے شہریوں پر ایسے ٹیکس عائد کرے جو نہ تو قرآن و سنت میں مذکور ہوں اور نہ ہی ان کی کوئی نظیر سابق خلفاء کے ہاں ملتی ہو؟

جواب: آپ کے ارسال کردہ سوالات کے مفصل جوابات لکھنے کے لیے تو فرصت درکار ہے جو مجھے میسّر نہیں۔ البتہ مختصر جوابات حاضر ہیں۔

۱۔ اسلامی ریاست کے رئیس یا صدر کے لیے "خلیفہ" کا لفظ کوئی لازمی اصطلاح نہیں ہے۔ امیر، امام، سلطان وغیرہ الفاظ بھی حدیث، فقہ، کلام اور اسلامی تاریخ میں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں مگر اصولاً جو چیز ضروری ہے وہ یہ کہ ریاست کی بنیاد نظریۂ خلافت پر قائم ہو۔ ایک صحیح اسلامی ریاست نہ تو بادشاہی یا آمریت ہو سکتی ہے اور نہ ایسی جمہوریت جو حاکمیت عوام (Popular sovereignty) کے نظریے پر مبنی ہو۔ اس کے برعکس صرف وہی ریاست حقیقت میں اسلامی ہو سکتی ہے جو خدا کی حاکمیّت تسلیم کرے، خدا اور اس کے رسول کی شریعت کو قانونِ برتر اور اوّلین ماخذ قوانین مانے،

اور حدود اللہ کے اندر رہ کر کام کرنے کی پابند ہو۔ اس ریاست میں اقتدار کی اصل غرض خدا کے احکام کا اجرا اور اس کی رضا کے مطابق برائیوں کا استیصال اور بھلائیوں کا ارتقاء ہے۔ اس ریاست کا اقتدار، اقتدار اعلیٰ نہیں ہے بلکہ خدا کی نیابت و امانت ہے۔ یہی معنی ہیں خلافت کے۔

۲۔ اموی فرمانرواؤں کی حکومت حقیقت میں خلافت نہ تھی۔ اگرچہ ان کی حکومت میں قانون اسلام ہی کا تھا، لیکن دستور (Constitution) کے بہت سے اسلامی اصولوں کو انہوں نے توڑ دیا تھا۔ نیز ان کی حکومت اپنی روح میں اسلام کی روح سے بہت ہٹی ہوئی تھی۔ اس فرق کو ان کی حکومت کے آغاز ہی میں محسوس کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ اس حکومت کے بانی امیر معاویہ کا اپنا قول یہ تھا کہ انا اول الملوک (میں سب سے پہلا بادشاہ ہوں)، اور جس وقت امیر معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد مقرر کیا اس وقت حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے عبدالرحمان نے اٹھ کر برملا کہا کہ "یہ تو قیصریت ہے کہ جب قیصر مرا تو اس کا بیٹا قیصر ہو گیا"۔

۳۔ اصولی حیثیت سے خلافتِ عباسیہ کی پوزیشن بھی وہی ہے جو خلافت بنی امیہ کی ہے۔ فرق بس اتنا تھا کہ خلفائے بنی امیہ دین کے معاملہ میں بے پروا (Indifferent) تھے اور اس کے برعکس خلفائے بنی عباس نے اپنی مذہبی خلافت اور روحانی ریاست کا سکہ بٹھانے کے لیے دین کے معاملہ میں ایجابی طور پر دلچسپی لی۔ لیکن ان کی یہ دلچسپی اکثر دین کے لیے مضر ہی ثابت ہوئی۔ مثلاً مامون کی دلچسپی نے جو شکل اختیار کی وہ یہ کہ اس نے ایک فلسفیانہ مسئلے

کو جو دین کا مسئلہ نہ تھا، خواہ مخواہ دین کا ایک عقیدہ بنایا اور پھر حکومت کی طاقت سے زبردستی اس کو تسلیم کرانے کے لیے ظلم وستم کیا۔

۴۔ جس دَور کے متعلق یہ سوال کیا گیا ہے وہ حقیقت میں فتنے کا دور تھا۔ مسلمان اس وقت سخت انتشارِ ذہنی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس وقت عملاً مسلمانوں کا حقیقی لیڈر کون تھا۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ یزید کا سیاسی اثر جو کچھ بھی تھا صرف اس بنا پر تھا کہ اس کے پاس طاقت تھی اور اس کے والد نے ایک مضبوط سلطنت قائم کرنے کے بعد اسے اپنا ولی عہد بنا دیا تھا۔ یہ بات اگر نہ ہوتی اور یزید عام مسلمانوں کی صف میں شامل ہوتا تو شاید وہ آخری شخص ہوتا جس پر لیڈرشپ کے لیے مسلمانوں کی نگاہِ انتخاب پڑ سکتی۔ اس کے برعکس حسین ابن علی رضی اللہ عنہ اس وقت امت کے نمایاں آدمی تھے اور ایک آزادانہ انتخاب میں اغلب یہ ہے کہ سب سے زیادہ ووٹ ان کے حق ہی میں پڑتے۔

۵۔ ظالم امراء کے مقابلے میں خروج ایسی صورت میں نہ صرف جائز بلکہ فرض ہو جاتا ہے جبکہ ان کو ہٹا کر ایک صالح و عادل حکومت کرنے کا امکان ہو۔ اس معاملہ میں امام ابو حنیفہ کا مسلک بہت واضح ہے جیسے ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں اور الموفق المکی نے مناقب ابو حنیفہ میں نقل کیا ہے۔ اس کے برعکس ایک حکومت عادلہ کے خلاف خروج بہت بڑا گناہ ہے اور تمام اہلِ ایمان پر لازم ہے کہ ایسے خروج کو دبا دینے میں حکومت کی تائید کریں۔ بین بین حالت میں جبکہ حکومت عادل نہ ہو مگر صالح انقلاب کے بھی

امکانات واضح نہ ہوں، پوزیشن مشتبہ ہے اور ائمہ وفقہا نے اس معاملے میں مختلف طرزِ عمل اختیار کیے ہیں۔ بعض نے صرف کلمۂ حق کہنے پر اکتفا کیا مگر خروج کو ناجائز سمجھا۔ بعض نے خروج کیا اور جام شہادت نوش کرنے کو ترجیح دی۔ اور بعض نے بامیدِ اصلاح تعاون بھی کیا۔

۶۔ حکومت عادلہ کے مقابلہ میں جو لوگ خروج کریں وہ اگر مساجد میں پناہ لیں تو ان کا محاصرہ کیا جا سکتا ہے اور اگر وہ وہاں سے گولہ باری کریں تو جوابی گولہ باری بھی کی جا سکتی ہے۔ رہا حرم میں ان کا پناہ لینا تو اس صورت میں صرف محاصرہ کر کے اس حد تک تنگ کیا جا سکتا ہے کہ بالآخر باغی ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائیں۔ حرم میں قتل و خون کرنا یا حرم پر سنگ باری یا گولہ باری کرنا درست نہیں ہے۔ بخلاف اس کے ایک ظالم حکومت کا وجود خود گناہ ہے اور اپنے قیام و بقا کے لیے اس کی کوشش بھی گناہ میں اضافے کے سوا کچھ نہیں۔

۷۔ قرآن وسنت نے ٹیکسوں کا کوئی نظام تجویز نہیں کیا ہے بلکہ مسلمانوں پر زکوٰۃ بطور عبادت اور غیر مسلموں پر جزیہ (بطور علامتِ اطاعت) لازم کرنے کے بعد یہ بات حکومت کی صوابدید پر چھوڑی ہے کہ جیسی ملک کی ضروریات ہوں ان کے مطابق باشندوں پر ٹیکس عائد کریں۔ خراج اور محاصلِ درآمد و برآمد اس کی ایک مثال ہیں جنہیں قرآن وسنت میں شرعاً مقرر نہیں کیا گیا تھا اور حکومت اسلامی نے اپنی صوابدید کے مطابق انہیں خود مقرر کیا۔ اس معاملہ میں اصل معیار ملک کی حقیقی ضروریات ہیں۔ اگر کوئی فرمانروا اپنے تصرّف میں لانے کے لیے ٹیکس وصول کرے تو حرام ہے۔ ملک کی حقیقی ضروریات پر صرف

کرنے کے لیے لوگوں کی رضامندی سے ان پر عائد کرے تو حلال ہے۔

۸۔ جی ہاں۔ صرف یہی نہیں بلکہ خود اپنے کیے ہوتے سابق فیصلوں کو بھی بدل سکتا ہے۔

۹۔ حجاج بن یوسف دنیوی سیاست کے نقطۂ نظر سے بڑا لائق اور دینی نقطۂ نظر سے سخت ظالم حاکم تھا۔

۱۰۔ جی ہاں، اُن شرائط کے ساتھ جو نمبر ۷ میں بیان ہوئی ہیں۔

دورِ جدید کی رہنما قوت، اسلام یا عیسائیت؟

سوال: بیسویں صدی کے اس مہذب ترقی یافتہ دور کی رہنمائی مذہبی نقطۂ نظر سے اسلام کر سکتا ہے یا عیسائیت؟ کیا انسان کو سیکولرزم یا دہریت روحانی و مادی ترقی کی معراج نصیب کرا سکتی ہے؟ بالخصوص کمیونزم کے بڑھتے ہوتے سیلاب کو روکنے اور ختم کرنے کی صلاحیت کس میں ہے؟

جواب: یہ سوال کئی سوالات کا مجموعہ ہے۔ اس لیے ایک ایک جزو پر علیحدہ علیحدہ بحث ہو گی۔

(الف) جہاں تک عیسائیت کا تعلق ہے اس دور کی رہنمائی سے وہ پہلے ہی دستبردار ہو چکی ہے۔ بلکہ درحقیقت وہ کسی دور میں بھی انسانی تہذیب و تمدن کی رہنمائی نہیں کر سکی ہے۔ عیسائیت سے مراد اگر حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کی وہ تعلیمات ہیں جو اب عیسائیوں کے پاس ہیں تو بائیبل کے عہد جدید کو دیکھ کر ہر شخص معلوم کرسکتا ہے کہ وہ انسانی تہذیب وتمدن کے متعلق کیا رہنمائی اور کتنی رہنمائی کرتی ہے ؛ اس میں چند مجرد (Abstract) اخلاقی اصولوں کے سوا سرے سے کوئی چیز موجود نہیں جس سے انسان اپنی معاشرت اور اپنی معیشت اور سیاست اور عدالت اور قانون کے متعلق کوئی ہدایت حاصل کرسکے ۔ لیکن اگر عیسائیت سے مراد وہ نظام زندگی ہے جو عیسائی پادریوں نے بنایا تھا تو سب کو معلوم ہے کہ یورپ میں احیائے علوم کی نئی تحریک کے رونما ہونے کے بعد وہ ناکام ہوگیا اور مغربی قوموں نے اس کے بعد جتنی کچھ بھی مادی ترقی کی وہ عیسائیت کی رہنمائی سے آزاد ہو کر ہی کی ہے ، اگرچہ اسلام کے خلاف عیسائیت کا تعصب اور عیسائیت کے ساتھ ایک جذباتی تعلق اُن میں اس کے بعد بھی موجود رہا اور اب بھی ہے ۔

(ب) جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ اپنے آغاز ہی سے تمدن وتہذیب کے معاملے میں نہ صرف یہ کہ رہنمائی کرتا ہے بلکہ اس نے خود اپنا ایک مستقل تمدّن اور اپنی ایک خاص تہذیب پیدا کی ہے ۔ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق قرآن مجید نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کو ہدایت نہ دی ہو اور ان ہدایات کے مطابق عملی ادارے قائم نہ کردیئے ہوں ۔ یہ چیزیں جس طرح ساتویں صدی عیسوی میں قابلِ عمل تھیں اسی طرح اس بیسویں صدی میں بھی قابل عمل ہیں اور ہزاروں برس آئندہ بھی انشاء اللہ قابل عمل رہیں گی ۔ اسُ ترقی یافتہ دوُر میں کسی ایسی چیز کی نشاندہی

نہیں کی جا سکتی جس کی وجہ سے اسلام آج نہ چل سکتا ہو یا انسان کی رہنمائی نہ کر سکتا ہو۔ جو شخص اس معاملہ میں اسلام کو ناقص سمجھتا ہو، اس کا کام ہے کہ کسی ایسی چیز کی نشان دہی کرے جس کے معاملہ میں اسلام اس کو رہنمائی سے قاصر نظر آتا ہو۔

(ج) سیکولرزم یا دہریت درحقیقت نہ کسی روحانی ترقی میں مددگار ہیں اور نہ مادی ترقی میں۔ معراج نصیب کرنے کا ذکر ہی کیا ہے؟ میں یہ سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانے کے اہل مغرب نے جو ترقی مادی حیثیت سے کی ہے وہ سیکولرزم یا مادہ پرستی یا دہریت کے ذریعہ سے نہیں کی بلکہ اس کے باوجود کی ہے۔ مختصراً میری اس رائے کی دلیل یہ ہے کہ انسان کوئی ترقی اس کے بغیر نہیں کر سکتا کہ وہ کسی بلند مقصد کے لیے اپنی جان و مال کی، اپنے اوقات اور محنتوں کی اور اپنے ذاتی مفاد کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو لیکن سیکولرزم اور دہریت ایسی کوئی بنیاد فراہم کرنے سے قاصر ہیں جس کی بنا پر انسان یہ قربانی دینے کو تیار ہو سکے۔ اسی طرح کوئی انسانی ترقی اجتماعی کوشش کے بغیر نہیں ہو سکتی اور اجتماعی کوشش لازماً انسانوں کے درمیان ایسی رفاقت چاہتی ہے جس میں ایک دوسرے کے لیے محبت اور ایثار ہو۔ لیکن سیکولرزم اور دہریت میں محبت و ایثار کے لیے کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اب یہ ساری چیزیں مغربی قوموں نے مسیحیت سے بغاوت کرنے کے باوجود اُن مسیحی اخلاقیات ہی سے لی ہیں جو ان کی سوسائٹی میں روایتاً باقی رہ گئی تھیں۔ ان چیزوں کو سیکولرزم یا دہریت کے حساب میں درج کرنا غلط ہے۔ سیکولرزم اور دہریت نے جو کام کیا ہے وہ یہ کہ مغربی

قوموں کو خدا اور آخرت سے بے فکر کر کے خالص مادہ پرستی کا عاشق اور مادی لذائذ و فوائد کا طالب بنا دیا ہے۔ مگر ان قوموں نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جن اخلاقی اوصاف سے کام لیا وہ ان کو سیکولرزم یا دہریت سے نہیں ملے بلکہ اس مذہب ہی سے ملے جس سے وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے تھے اس لیے یہ خیال کرنا سرے سے غلط ہے کہ سیکولرزم یا دہریت ترقی کی موجب ہیں۔ وہ تو اس کے برعکس انسان کے اندر خود غرضی، ایک دوسرے کے خلاف کشمکش اور جرائم پیشگی کے اوصاف پیدا کرتی ہیں جو انسان کی ترقی میں مددگار نہیں بلکہ مانع ہیں۔

(د) کمیونزم کے سیلاب کو روکنے کی صلاحیت کسی ایسے ہی نظامِ زندگی میں ہو سکتی ہے جو انسانی زندگی کے عملی مسائل کو اس سے بہتر طریقہ پر حل کر سکے اور اس کے ساتھ انسان کو وہ روحانی اطمینان بھی بہم پہنچا سکے جس کا کمیونزم میں فقدان ہے۔ ایسا نظام اگر بن سکتا ہے تو صرف اسلام کی بنیاد پر بن سکتا ہے۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۷ عدد ۱۔ اکتوبر ۱۹۶۱ء)

الخلافت یا الحکومت

سوال :۔ اگر بیسویں صدی میں بھی اسلام قابلِ نفاذ ہے تو موجودہ رجحان و نظریات کی جگہ لینے میں جو مشکلات یا موانع درپیش ہوں گے اُن

کا بہترین حل ابن خلدون کے ہر دو نظریہ حکومت و ریاست یعنی الخلافت یا الحکومت کس سے ممکن ہے؟

جواب :- اس زمانے میں اسلامی نظام کو جو چیز روک رہی ہے اور جو رجحانات اور نظریات اس کے راستے میں سدِ راہ ہیں ان کا اگر تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ انہیں مسلمان ملکوں پر مغربی قوموں کے طویل سیاسی غلبہ نے پیدا کیا ہے۔ مغربی قومیں جب ہمارے ملکوں پر مسلط ہوئیں تو انہوں نے ہمارے قانون کو ہٹا کر اپنا قانون ملک میں رائج کیا۔ ہمارے نظامِ تعلیم کو معطل کر کے اپنا نظام تعلیم رائج کیا۔ تمام چھوٹی بڑی ملازمتوں سے ان سب لوگوں کو برطرف کیا جو ہمارے تعلیمی نظام کی پیداوار تھے اور ہر ملازمت اُن لوگوں کے لیے مخصوص کر دی جو ان کے قائم کردہ نظام تعلیم سے فارغ ہو کر نکلے تھے۔ معاشی زندگی میں بھی اپنے ادارے اور طور طریقے رائج کیے اور معیشت کا میدان بھی رفتہ رفتہ اُن لوگوں کے لیے مخصوص ہو گیا جنہوں نے مغربی تہذیب و تعلیم کو اختیار کیا تھا۔ اس طریقہ سے انہوں نے ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن اور اس کے اصولوں اور نظریات سے انحراف کرنے والی ایک نسل خود ہمارے اندر پیدا کر دی جو اسلام اور اس کی تاریخ، اس کی تعلیمات اور اس کی روایات ہر چیز سے عملی طور پر بھی بیگانہ ہے اور اپنے رجحانات کے اعتبار سے بھی بیگانہ۔ یہی وہ چیز ہے جو دراصل ہمارے اسلام کی طرف پلٹنے میں مانع ہے اور یہی اس غلط فہمی کا موجب بھی ہے کہ اسلام اس وقت قابل عمل نہیں ہے۔ جن لوگوں کو ساری تعلیم اور تربیت غیر اسلامی طریقے پر دی گئی ہو

ہو وہ آخر اس کے سوا اور کہہ بھی کیا سکتے ہیں کہ اسلام قابلِ عمل نہیں ہے، کیونکہ نہ تو وہ اسلام کو جانتے ہیں اور نہ اس پر عمل کرنے کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔ جس نظامِ زندگی کے لیے وہ تیار کیے گئے ہیں اسی کو وہ قابلِ عمل تصور کر سکتے ہیں۔ اب لامحالہ ہمارے لیے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔ یا تو ہم من حیث القوم کافر ہو جانے پر تیار ہو جائیں اور خواہ مخواہ اسلام کا نام لے کر دنیا کو دھوکا دینا چھوڑ دیں۔ یا پھر خلوص اور ایمانداری کے ساتھ (منافقانہ طریق سے نہیں) اپنے موجودہ نظامِ تعلیم کا جائزہ لیں اور اس کا پورے طریقہ سے تجزیہ کر کے دیکھیں کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہم کو اسلام سے منحرف بنانے والی ہیں اور اس میں کیا تغیرات کیے جائیں جن سے ہم ایک اسلامی نظام کو چلانے کے قابل لوگ تیار کر سکیں۔ مجھے بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے تعلیمی کمیشن نے اس مسئلہ کی طرف کوئی اچٹتی ہوئی توجہ بھی نہیں کی۔ یہ مسئلہ بڑی سنجیدگی سے غور کرنے کے قابل ہے اور جب تک ہم اسے حل نہیں کریں گے اس وقت تک اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ کبھی ہموار نہ کر سکیں گے۔

ابن خلدون کے کسی نظریہ کی طرف رجوع کرنے سے اس مسئلہ کے حل کرنے میں مدد نہیں مل سکتی، کیونکہ اس مسئلہ کی جو نوعیت اب پیدا ہوئی ہے وہ ابن خلدون کے زمانے میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ مسئلہ کی حقیقی نوعیت یہ ہے کہ مغربی استعمار رخصت ہوتے ہوتے ہمارے ملکوں میں اُس نسل کو حکمران بنا کر چھوڑ گیا ہے جس کو اس نے اپنی تعلیم اور اپنی تہذیب کا دودھ پلا پلا کر اس طرح تیار کیا تھا کہ وہ جسمانی حیثیت سے تو ہماری قوم کا حصہ ہے لیکن علمی اور ذہنی اور

اخلاقی اعتبار سے انگریزوں، فرانسیسیوں یا ولندیزیوں کا پورا جانشین ہے۔ اس طبقہ کی حکومت جو مشکلات پیدا کرتی ہے ان کو رفع کرنے کا معاملہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے جسے حل کرنا ابن خلدون کے نظریات کا کام نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑے سنجیدہ غور و فکر کی اور حالات کو سمجھ کر اصلاح کے لیے نئی راہیں نکالنے کی ضرورت ہے۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۷، عدد ۱۔ اکتوبر ۱۹۶۱ء)

اسلامی ریاست میں ذمیوں کے حقوق

سوال: اسلامی مملکت میں اقلیتی فرقوں کو، مثلاً عیسائی، یہودی، بدھ، جین، پارسی، ہندو وغیرہ کو کیا مسلمانوں کی طرح پورے حقوق حاصل ہوں گے؟ کیا ان کو اپنے مذہب کی تبلیغ بھی اسی طرح کرنے کی اجازت ہوگی جیسا کہ آجکل پاکستان اور دیگر ممالک میں کھلے بندوں پرچار ہوتا ہے؟ کیا اسلامی مملکت میں ایسے مذہبی یا نیم مذہبی ادارے مثلاً ادارہ مکتی فوج (Salvation Army) کیتھڈرل، کانونٹ، سینٹ جان یا سینٹ فرانسز وغیرہ جیسے ادارے قانوناً بند کر دیتے جائیں گے (جیسا کہ حال میں سیلون میں ہوا یا دو ایک ممالک میں ہو چکا ہے) یا فراخدلی سے مسلمان بچوں کو وہاں بھی ماڈرن ایجوکیشن حاصل کرنے کی عام اجازت ہوگی۔ کیا اس صدی میں بھی ان اقلیتی فرقوں سے جزیہ

وصول کرنا مناسب ہو گا (عالمی حقوقِ انسانی کی روشنی میں بھی) جبکہ وہ نہ صرف فوج اور سرکاری عہدوں پر فائز اور حکومت کے وفادار ہوں؟

جواب :- اسلامی مملکت میں غیر مسلم گروہوں کو تمام مدنی حقوق (Civil Rights) مسلمانوں کی طرح حاصل ہوں گے مگر سیاسی حقوق (Political Rights) مسلمانوں کے برابر نہیں ہو سکتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں ریاست کے نظام کو چلانا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے اور مسلمان اس بات پر مامور ہیں کہ جہاں بھی ان کو حکومت کے اختیارات حاصل ہوں وہاں وہ قرآن اور سنّت کی تعلیمات کے مطابق حکومت کا نظام چلائیں۔ چونکہ غیر مسلم نہ قرآن اور سنت کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں اور نہ اس کی اسپرٹ کے مطابق ایمانداری سے کام چلا سکتے ہیں اس لیے وہ اس ذمہ داری میں شریک نہیں کیے جا سکتے۔ البتہ نظم ونسق میں ایسے عہدے ان کو دیے جا سکتے ہیں جن کا کام پالیسی بنانا نہ ہو۔ اس معاملہ میں غیر مسلم حکومتوں کا طرزِ عمل منافقانہ ہے اور اسلامی حکومت کا طرزِ عمل صاف صاف ایماندارانہ۔ مسلمان اس بات کو صاف صاف کہتے ہیں اور اس پر عمل درآمد کرنے میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری ملحوظ رکھتے ہوئے غیر مسلموں کے ساتھ انتہائی شرافت اور فراخدلی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ غیر مسلم بظاہر کاغذ پر قومی اقلیتوں (National Minorities) کو سب قسم کے حقوق دے دیتے ہیں۔ مگر عملاً انسانی حقوق تک نہیں دیتے۔ اس میں اگر کسی کو شک ہو تو دیکھ لے کہ امریکہ میں سیاہ فام لوگوں (Negroes) کے ساتھ اور روس میں غیر کمیونسٹ باشندوں کے ساتھ اور چین وہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ خواہ مخواہ دوسروں

سے شرما کر ہم اپنے مسلک کو صاف صاف کیوں نہ بیان کریں اور اس پر صاف صاف کیوں نہ عمل کریں۔

جہاں تک غیر مسلموں کی تبلیغ کا معاملہ ہے اس کے بارے میں یہ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ جب تک ہم بالکل خودکشی کے لیے ہی تیار نہ ہو جائیں ہمیں یہ حماقت نہیں کرنی چاہیے کہ اپنے ملک کے اندر ایک طاقتور اقلیت پیدا ہونے دیں جو غیر ملکی سرمایہ سے پرورش پاتے اور بڑھے اور جس کی پشت پناہی بیرونی حکومتیں کر کے ہمارے لیے وہی مشکلات پیدا کریں جو ایک مدت دراز تک ترکی کے لیے عیسائی اقلیتیں پیدا کرتی رہی ہیں۔

عیسائی مشنریوں کو یہاں مدارس اور ہسپتال جاری رکھ کر مسلمانوں کے ایمان خریدنے کی کوشش کرنے اور مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اپنی ملت سے بیگانہ (De-Nationalise) کرنے کی کھلی اجازت دینا بھی میرے نزدیک قومی خودکشی ہے۔ ہمارے حکمران اس معاملے میں انتہائی کم نظری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ان کو قریب کے فائدے تو نظر آتے ہیں مگر دور رس نتائج دیکھنے سے ان کی آنکھیں عاجز ہیں۔

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا حکم اس حالت کے لیے دیا گیا ہے جبکہ وہ یا تو مفتوح ہوتے ہوں یا کسی معاہدہ کی رُو سے جزیہ دینے کی واضح شرط پر اسلامی حکومت کی رعایا بنائے گئے ہوں۔ پاکستان میں چونکہ یہ دونوں صورتیں پیش نہیں آئی ہیں اس لیے یہاں غیر مسلموں پر جزیہ عائد کرنا میرے نزدیک شرعاً ضروری نہیں ہے۔ (ترجمان القرآن جلد ۵۷، عدد ۱۔ اکتوبر ۱۹۶۱ء)

اسلامی حکومت میں متعصب مستشرقین کے افکار کی اشاعت

سوال :۔ کیا اسلامی ملک میں ان مغربی مستشرقین، غیر مسلم اسکالرز اور پروفیسروں کو تعلیم یا تقریر کے لیے مدعو کیا جا سکتا ہے جنہوں نے اپنے نقطۂ نظر سے اسلام کے موضوعات پر کتابیں لکھتے ہوتے نہ صرف اسلام پر بے جا تنقیدی تبصرے کیے ہیں بلکہ عمداً یا کم علمی و تعصب سے اسلامی تاریخ لکھنے میں حضور اکرمؐ، اہل بیت، خلفائے راشدین، صحابۂ کرام وائمہ کرام (جن پر اسلام اور مسلمانوں کو فخر ہے) کی شان میں نازیبا فقرات لکھ کر ہدف ملامت بنایا ہے۔ مثلاً امریکی و برطانوی قابل ترین پروفیسروں کی نظر ثانی شدہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں بھی دیگر اعتراضات کے علاوہ رسولِ مقبول کی ازواج مطہرات کو (Concubines) (لونڈیاں) لکھا ہے۔ ان میں سے اکثر یہاں آکر لکچر اور خطبات دینے اور ان کی تشہیر کرنے پر کیا اسلامی حکومت بالکل پابندی عائد نہ کر دے گی؟ یا ان کتابوں اور زہر آلودہ لٹریچر کی ہماری لائبریریوں میں موجودگی گوارا کی جا سکتی ہے؟ حکومت ان کے جوابات و تردید شائع کرنے ان کی تصحیح کرانے یا ان سے رجوع کرانے کے لیے کیا اقدام کر سکتی ہے؟

جواب :۔ یہ زمانے کے انقلابات ہیں۔ ایک وقت وہ تھا کہ یورپ کے عیسائی اندلس (Spain) جا کر مسلمانوں سے انجیل کا سبق لیا کرتے تھے۔ اب معاملہ الٹا

ہو گیا ہے کہ مسلمان یورپ والوں سے پوچھتے ہیں کہ اسلام کیا ہے اور اسلام کی تاریخ اور اس کی تہذیب کیا ہے۔ حتیٰ کہ عربی زبان بھی مغربی مستشرقین سے سیکھی جاتی ہے۔ مغربی ممالک سے استاد درآمد کرکے ان سے اسلامی تاریخ پڑھوائی جاتی ہے، اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو کچھ وہ لکھتے ہیں نہ صرف اسے پڑھا جاتا ہے بلکہ اس پر ایمان بھی لایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ لوگ خود اپنے مذہب اور اس کی تاریخ کے متعلق اپنے ہم مذہبوں کے سوا کسی کی راستے کو ذرہ برابر بھی دخل دینے کی اجازت نہیں دیتے۔ یہودیوں نے اپنی انسائیکلوپیڈیا (Jewish Encyclopaedia) شائع کی ہے اور اس میں کوئی ایک مضمون Article بھی کسی مسلمان تو درکنار کسی عیسائی مصنف کا بھی نہیں ہے۔ بائیبل کا ترجمہ بھی یہودیوں نے اپنا کیا ہے۔ عیسائیوں کے ترجمے کردہ ہاتھ نہیں لگاتے۔ اس کے برعکس یہودی مصنفین اسلام کے متعلق مضامین اور کتابیں لکھتے ہیں اور مسلمان ہاتھوں ہاتھ ان کو لیتے ہیں اور ان کا یہ حق مانتے ہیں کہ ہمارے مذہب اور ہماری فقہ اور ہماری تہذیب اور ہمارے بزرگوں کی تاریخ کے متعلق محققانہ کلام فرمائیں اور ہم یہ چیزیں ان سے سیکھیں۔ یہ صورت حال کسی صحیح اسلامی حکومت میں نہیں رہ سکتی اور نہ رہنی چاہیئے اور کوئی وجہ نہیں کہ رہ سکے۔ اسلامی حکومت بھی ہو اور اسلام اور مسلمان یتیم بھی ہوں، یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہیں۔ یہ رویہ مسلمانوں کی غیر اسلامی حکومت ہی کو مبارک رہے۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۷ عدد ۲ - نومبر ۱۹۶۱ء)

نظامِ عدل میں تغیرات اور ان کی نوعیت

سوال: اس برصغیر میں چونکہ تمام قانونی ضابطہ ہائے دیوانی، فوجداری، مالیاتی اور عملدرآمد کے قوانین (Procedural Law) وغیرہ عرصہ سے ہر عدالت میں جاری وساری ہیں، اور چونکہ ڈیڑھ صدی سے تمام لوگ بالخصوص جج اور وکلاء وغیرہ نہ صرف ان قوانین سے پوری طرح مانوس بلکہ اس کا وسیع علم رکھتے ہیں، اس لیے بھی اسلامی مملکت کے قیام سے یہاں برطانوی دور کے نظامِ عدل (British Rull of Law) کا سارا ڈھانچہ بدلنا ممکن نہ ہوگا۔ تو کیا پھر بھی عدالتی ریفارم لائی جائیں گی جبکہ اسلامی قانون کسی پہلو سے جامع، مرتب یا مکمل اور مدوّن (Codified) نہیں ہے؟ اسلامی عدالتی نظام میں وکلا کی حیثیت کیا ہوگی؟ کیا اسی طرح (Procedural Law) کے تحت انہیں مقدمہ جات لڑنے اور مقدمہ بازی (Litigation) کو طول دینے کا اختیار ہوگا؟ کیا اس موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی چور کا ہاتھ کاٹنے اور زانی کو سنگسار کی سزائیں دی جائیں گی؟ اور کیا قاضیوں کو قانونِ شہادت (Evidence Law) کی مدد کے بغیر فیصلے صادر کرنے ہوں گے؟ پھر بین الاقوامی قسم کے ادارے مثلاً اقوام متحدہ (United Nations) کی جنرل اسمبلی، سیکورٹی کونسل، بین الاقوامی عدالتِ انصاف یا کمرشل ٹربیونل اور لیبر قوانین وغیرہ کی عمل داری

دخل اندازی یا انٹرنیشنل لا پر عمل پیرا ہونے اور ان کی من وعن قبولیت کے لیے اسلامی حکومت کا کیا رویّہ ہوگا؟ اگر اسی قسم کے ادارے اسلامی کنفیڈریشن یا اسلامی بلاک بنا کر عمل میں لائے جائیں تو ان کو کیا حیثیت حاصل ہوگی؟ کیا اسلامی قانون ساز اسمبلی کے پاس شدہ یا اجتہادی احکام پر اسلامی عدلیہ کو نظر ثانی (Review) کرنے کا اختیار ہوگا؟ اسلامی ممالک اور مسلمانوں کو ایک اسٹیج پر لانے کے لیے اختلافات کس طرح رفع کیے جا سکتے ہیں؟

جواب:۔ اس سوال کے جواب میں یہ بات پہلے ہی سمجھ لینی چاہیے کہ جب انگریزی حکومت اس ملک میں آئی تھی تو اس وقت سارا قانونی نظام (legal) system اسلامی فقہ پر قائم تھا۔ انگریزوں نے آکر اس کو یک لخت تبدیل نہیں کیا بلکہ انگریزی حکومت میں سالہا سال تک اسلامی نظام ہی چلتا رہا۔ انگریز اس کو بتدریج تبدیل کرتے رہے اور رفتہ رفتہ انھوں نے اپنا نظام رائج کیا۔ اب اگر ہم اسلامی نظام قانون کو از سر نو قائم کرنا چاہیں تو یہ تبدیلی بھی یک لخت نہیں، بتدریج ہی ہوگی اور اس کے لیے بہت حکمت کے ساتھ ایک ایک قدم اٹھانا پڑے گا۔ اسلامی قوانین اگر مدوّن (Codified) نہیں ہیں تو ان کے مدوّن (CODIFY) کرنے میں کوئی دقت نہیں ہے۔ اسی طرح اسلامی قانون کی شرحیں کثرت سے موجود ہیں۔ ان کو آسانی سے اردو زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے اور آگے نئی شرحوں کا سلسلہ چل سکتا ہے۔

اسی موجودہ ترقی یافتہ دور میں سعودی عرب میں زنا اور چوری کی سزائیں

جاری ہیں اور تجربے نے تمام دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انہی سزاؤں کی وجہ سے سعودی عرب میں جرائم کی اتنی کمی ہوگئی ہے جتنی دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے۔ اب اگر اس دور کے ترقی یافتہ ہونے کے معنی یہی ہیں کہ جرائم میں ترقی ہو تو مغربی قانونی سسٹم پر شوق سے عمل کرتے رہیئے لیکن جرائم کا انسداد بھی اگر ترقی کے لیے ضروری ہے تو پھر یہ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ اسلامی قانون سے زیادہ کارگر کوئی قانون نہیں ہے۔ دراصل اس زمانے کی لادینی تہذیب کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی ساری ہمدردیاں مجرموں کے ساتھ ہیں۔ اسی لیے یہ نقطہ نظر پیش کیا جاتا ہے کہ یہ سزائیں وحشیانہ ہیں۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہوا کہ چوری کرنا کوئی وحشیانہ کام نہیں ہے۔ البتہ اس پر ہاتھ کاٹنا وحشیانہ کام ہے اور زنا کا ارتکاب تو مغربی تہذیب میں ایک تفریح ہے ہی۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس خیال کا ماخذ کیا ہے کہ اسلامی قانون میں قاضیوں کو قانون شہادت (Evidence Law) کی مدد کے بغیر فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہے یا کوئی ایسا دستور العمل رہا ہے۔ حالانکہ خود قرآن نے قانونِ شہادت کے بہت سے اصول بیان کیے ہیں اور اس کی بیشتر تشریحات حدیث اور خلفائے راشدین کے فیصلوں سے ملتی ہیں۔ بالخصوص فقہاء نے ان اصولوں کو نہایت محنت سے ترتیب دیا ہے اور اسلامی دور میں کوئی ایسا قاضی نہیں گزرا جس نے ثبوت کے بغیر فیصلے صادر کیے ہوں۔

وکالت کے بارے میں میرے نزدیک صرف اتنی اصلاح درکار ہے

کہ قانون کی پریکٹس بند کر دی جائے اور وکلاء کو اسٹیٹ معاوضہ دے۔ اب بھی قانون کا نظریہ یہ ہے کہ وکیل کا اصل کام اپنے موکل کی حمایت کرنا نہیں ہے بلکہ عدالت کو قانون سمجھنے اور منطبق (Apply) کرنے میں مدد دینا ہے۔ وکالت کے پیشہ بن جانے کی وجہ سے یہ خرابی پیدا ہوتی ہے کہ وکیل عدالت کو گمراہ (Mislead) کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مقدمات کو طول بھی دیتے ہیں اور مقدمہ بازی کو بڑھاتے بھی ہیں۔

بین الاقوامی قسم کے تمام اداروں میں ہم شریک ہو سکتے ہیں۔ ان کے اندر اگر کوئی چیز بھی ہمارے اصول کے مطابق نہ ہوگی تو ہم اس کی حد تک اپنی الگ پالیسی بنائیں گے اور اسی حد تک ہماری شرکت میں استثنا ہوگا۔ مسلمان ممالک خود اپنی دولت متحدہ (Common Wealth) یا تحالف (Confederations) بنا سکتے ہیں اور اسلامی اصول کے مطابق باہمی تعلقات کے طریقے مقرر کر سکتے ہیں

اسلامی قانون ساز اسمبلی کے طے کئے ہوئے اجتہادی احکام پر اسلامی عدلیہ نظر ثانی (Review) نہیں کر سکتی البتہ اگر وہ احکام قانون ساز اسمبلی کے اختیار سے متجاوز ہوں تو ان کو حدودِ اختیار سے متجاوز قرار دے سکتی ہے۔

اسلامی ممالک اور مسلمانوں کو ایک اسٹیج پر لانے کے لیے اختلافات رفع کرنے کی صورت ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ مسلمان ایمانداری کے ساتھ قرآن اور سنت کی ہدایات پر چلنے کے لیے تیار ہوں۔ قرآن کی تاویل اور سنت کی تحقیق میں اختلافات ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ مل کر کام کرنے میں مانع نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم اس اصول کو مان لیں کہ جو شخص بھی قرآن اور سنت کو سند و حجت

مان لے اور حضور سرورِ کائنات کے بعد کسی دوسری نبوت کا قائل نہ ہو وہ ہماری برادری کا آدمی ہے تو یہ چیز کسی آدمی کو ہماری برادری سے خارج نہیں کر سکتی کہ وہ قرآن کے معنی ہم سے مختلف سمجھ رہا ہے اور اس کے نزدیک کسی معاملہ میں سنت سے کوئی اور بات ثابت ہوتی ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جتنی عدالتیں بھی پاکستان کے دستور اور قانون کو واجب الاطاعت قانون مان کر کام کرتی ہیں وہ سب اس ملک کی جائز عدالتیں ہیں۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام عدالتوں کے فیصلے بھی یکساں ہوں۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۷، عدد ۲، نومبر ۱۹۶۱ء)

سائنسی دور میں اسلامی جہاد کی کیفیت

سوال: مسلمانوں کے جذبۂ "جہاد" کو زندہ رکھنے کے لیے آج بیسویں صدی میں کیا طریقِ کار اختیار کیا جائے گا۔ جبکہ آج کی جنگ شمشیر و سناں سے یا میدانِ جنگ میں صف آرا ہو کر دست بدست نبرد آزمائی سے نہیں ہوتی بلکہ سائنسی ہتھیاروں، جنگی چالوں STRATEGY اور جاسوسی سے لڑی جاتی ہے؟ آپ ایٹم بم، راکٹ میزائل اور مشینی ایجادات وغیرہ کا سہارا لے کر اس سائنسی و ایٹمی دور میں "جہاد" کی تشریح کس طرح کریں گے؟ کیا چاند، مریخ و مشتری پر اترنے اور سٹلائٹ چھوڑنے یا فضا میں راکٹ سے پرواز کرنے اور نت نئی ایجادات

کرنے والے مجاہدین کے زمرے میں آ سکتے ہیں ؟... انتظامی امور اور مملکتی نظام (Civil Administration) میں فوج کو کیا مقام دیا جا سکتا ہے ؟ موجودہ دور کے فوجی انقلابات سے ملکی نظام میں فوج کی شمولیت اور افادیت بہت حد تک ثابت ہو چکی ہے۔ کیوں نہ فوج کو دورِ امن میں بٹھا کر کھلانے کے بجائے ہر میدان میں قوم کی خدمت سپرد ہو ؟

جواب : جہاد کے متعلق اوّلین بات یہ سمجھ لینی چاہیئے کہ جہاد اور لڑاکا پن میں بہت فرق ہے۔ اسی طرح قومی اغراض کے لیے جہاد اور چیز ہے اور جہاد فی سبیل اللہ اور چیز۔ مسلمانوں میں جس جذبۂ جہاد کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے وہ اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک ان کے اندر ایمان ترقی کرتے کرتے اس حد تک نہ پہنچ جائے کہ وہ خدا کی زمین سے برائیوں کو مٹانے اور اس زمین میں خدا کا حکم بلند کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جائیں۔ سرِدست تو ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ سب کچھ اس جذبے کی جڑ کاٹ دینے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ تعلیم وہ دی جا رہی ہے جو ایمان کے بجائے شک اور انکار پیدا کرے تربیت وہ دی جا رہی ہے جس سے افراد میں اور سوسائٹی میں وہ برائیاں پھیلیں جنہیں ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام کے نزدیک وہ برائیاں ہیں۔ اس کے بعد یہ سوال لاحاصل ہے کہ مسلمانوں میں جذبۂ جہاد کیسے پیدا ہو گا۔ موجودہ حالت میں یا تو مسلمان کرائے کا سپاہی (Mercenary) بنے گا یا حد سے حد قومی اغراض کے لیے لڑے گا۔ رہے سائنسی ہتھیار اور جنگی چالیں (Strategy) تو یہ وہ اسباب

ہیں جو جائز اغراض اور ناجائز اغراض سب کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں اگر مسلمان میں سچا ایمان موجود ہو اور اسلام کا نصب العین اس کا اپنا نصب العین بن جاتے تو وہ پورے جذبہ کے ساتھ تمام وہ قابلیتیں اپنے اندر پیدا کرے گا جو اس زمانے میں لڑنے کے لیے درکار ہیں اور تمام وہ ذرائع اور وسائل فراہم کرے گا جو آج یا آئندہ جنگ کے لیے درکار ہوں۔

چاند اور مریخ اور مشتری پر اترنا اپنی نوعیت کے لحاظ سے کولمبس کے امریکہ پر اترنے اور واسکوڈی گاما کے جزائر شرق الہند پر اترنے سے زیادہ مختلف نہیں اگر یہ لوگ مجاہد فی سبیل اللہ مانے جا سکتے ہیں تو چاند اور مریخ پر اترنے والے بھی مجاہدین بن جائیں گے۔

انتظامی امور اور مملکتی نظام (Civil Administration) میں فوج کا داخل ہونا فوج کے لیے بھی اور ملک کے لیے بھی سخت تباہ کن ہے۔ فوج بیرونی دشمنوں سے ملک کی حفاظت کرنے کے لیے منظم کی جاتی ہے۔ ملک پر حکومت کرنے کے لیے منظم نہیں کی جاتی۔ اس کو تربیت دشمنوں سے لڑنے کی دی جاتی ہے۔ اس تربیت سے پیدا ہونے والے اوصاف خود اپنے ملک کے باشندوں سے معاملہ کرنے کے لیے موزوں نہیں ہوتے۔ علاوہ بریں ملکی معاملات کو جو لوگ بھی چلائیں خواہ وہ سیاست کار (Politician) ہوں یا ملکی نظم و نسق کے منتظم (Civil Administration) ان کے کام کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ ملک میں بہت سے لوگ اس سے خوش بھی ہوتے ہیں اور ناراض بھی۔ فوج کا اس میدان میں اترنا لامحالہ فوج کو غیر ہر دلعزیز (Unpopular)

بنانے کا موجب ہوتا ہے۔ حالانکہ فوج کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ سارے ملک کے باشندے اس کی پشت پر ہوں اور جنگ کے موقع پر ملک کا ہر فرد اس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو۔ دنیا میں زمانہ حال کے فوجی انقلابات نے ملکی نظام میں فوج کی شمولیّت کو مفید ثابت نہیں کیا ہے بلکہ درحقیقت تجربے نے اس کے برے نتائج ظاہر کر دیئے ہیں۔

(ترجمان القرآن جنوری ۱۹۶۲ء)

اسلامی حکومت میں خواتین کا دائرہ عمل

سوال: کیا اس دَور میں اسلامی حکومت خواتین کو مردوں کے برابر، سیاسی معاشی و معاشرتی حقوق ادا نہ کرے گی جبکہ اسلام کا دعوٰی ہے کہ اس نے تاریک ترین دَور میں بھی عورت کو ایک مقام (States) عطا کیا؟ کیا آج خواتین کو مردوں کے برابر اپنے وراثہ کا حصّہ لینے کا حق دیا جا سکتا ہے؟ کیا ان کو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم یا مردوں کے شانہ بشانہ کام کر کے ملک و قوم کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کی اجازت نہ ہوگی؟ فرض کیجیے اگر اسلامی حکومت خواتین کو برابر کا حق رائے دہندگی دے اور وہ کثرت آراء سے وزارت و صدارت کے عہدوں کے لیے الیکشن لڑ کر کامیاب ہو جائیں تو موجودہ بیسویں صدی میں بھی کیا ان کو منصب اعلیٰ کا حق اسلامی احکام کی

رُو سے نہیں مل سکتا جبکہ بہت سی مثالیں ایسی آج موجود ہیں، مثلاً سیلون میں وزارتِ عظمٰی ایک عورت کے پاس ہے یا نیدرلینڈ میں ایک خاتون ہی حکمرانِ اعلیٰ ہے۔ برطانیہ پر ملکہ کی شہنشاہیت ہے سفارتی حد تک جیسے عابدہ سلطانہ دختر نواب آف بھوپال رہ چکی ہیں اور اب بیگم رعنا لیاقت علی خاں نیدرلینڈ میں سفیر ہیں۔ یا دیگر جس طرح مسز وجے لکشمی پنڈت برطانیہ میں ہائی کمشنر ہیں۔ اور اقوام متحدہ کی صدر رہ چکی ہیں۔ اور بھی مثالیں جیسے نور جہاں جھانسی کی رانی رضیہ سلطانہ، حضرت محل زوجہ واجد علی شاہ جو کہ (Pride of Women) کہلاتی ہیں جنہوں نے انگریزوں کے خلاف لکھنو میں جنگ کی کمانڈ کی۔ اس طرح خواتین نے خود کو پورا اہل ثابت کر دیا ہے۔ تو کیا اگر آج محترمہ فاطمہ جناح صدارت کا عہدہ سنبھال لیں تو اسلامی اصول پاکستان کے اسلامی نظام میں اس کی اجازت نہ دیں گے؟ کیا آج بھی خواتین کو ڈاکٹر، وکلا، مجسٹریٹ، جج فوجی افسر یا پائیلٹ وغیرہ بننے کی مطلق اجازت نہ ہوگی؟ خواتین کا یہ بھی کارنامہ کہ وہ نرسوں کی حیثیت سے کس طرح مریضوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں قابلِ ذکر ہے۔ خود اسلام کی پہلی جنگ میں خواتین نے مرہم پٹی کی، پانی پلایا اور حوصلے بلند کیے۔ تو کیا آج بھی اسلامی حکومت میں آدھی قوم کو مکانات کی چار دیواری میں مقید رکھا جائے گا؟

جواب: اسلامی حکومت دنیا کے کسی معاملے میں بھی اسلامی اصولوں سے ہٹ کر

کوئی کام کرنے کی نہ تو مجاز ہے اور نہ وہ اس کا ارادہ ہی کر سکتی ہے۔اگر فی الواقع اس کو چلانے والے ایسے لوگ ہوں جو اسلام کے اصولوں کو سچے دل سے مانتے ہوں اور اس پر عمل کرتے ہوں۔ عورتوں کے معاملے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ عورت اور مرد عزت و احترام کے لحاظ سے برابر ہیں۔ اخلاقی معیار کے لحاظ سے بھی برابر ہیں۔ آخرت میں اپنے اجر کے لحاظ سے بھی برابر ہیں۔ لیکن دونوں کا دائرۂ عمل ایک نہیں ہے۔ سیاست اور ملکی انتظام اور فوجی خدمات اور اسی طرح کے دوسرے کام مرد کے دائرۂ عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس دائرے میں عورت کو گھسیٹ لانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو ہماری خانگی زندگی بالکل تباہ ہو جائے گی جس کی بیشتر ذمہ داریاں عورتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ یا پھر عورتوں پر دہرا بار ڈالا جائے گا کہ وہ اپنے فطری فرائض بھی انجام دیں جن میں مرد قطعاً شریک نہیں ہو سکتا اور پھر مرد کے فرائض کا بھی نصف حصہ اپنے اوپر اٹھائیں۔ عملاً یہ دوسری صورت ممکن نہیں ہے۔ لازماً پہلی صورت ہی رونما ہوگی اور مغربی ممالک کا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ رونما ہو چکی ہے۔ آنکھیں بند کر کے دوسری کی حماقتوں کی نقل اتارنا عقل مندی نہیں ہے۔

اسلام میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وراثت میں عورت کا حصہ مرد کے برابر ہو۔ اس باب میں قرآن کا صریح حکم مانع ہے۔ نیز یہ انصاف کے بھی خلاف ہے کہ عورت کا حصہ مرد کے برابر ہو۔ کیونکہ اسلامی احکام کی رُو سے خاندان کی پرورش کا سارا مالی بار مرد پر ڈالا گیا ہے۔ بیوی کا مہر اور نفقہ بھی اس پر واجب ہے اس کے مقابلہ میں عورت پر کوئی مالی بار نہیں ڈالا گیا ہے۔اس

صورت میں آخر عورت کو مرد کے برابر حصہ کیسے دلایا جا سکتا ہے۔

اسلام اصولاً مخلوط سوسائٹی کا مخالف ہے اور کوئی ایسا نظام جو خاندان کے استحکام کو اہمیت دیتا ہو اس کو پسند نہیں کرتا کہ عورتوں اور مردوں کی مخلوط سوسائٹی ہو۔ مغربی ممالک میں اُس کے بدترین نتائج ظاہر ہو چکے ہیں۔ اگر ہمارے ملک کے لوگ ان نتائج کو بھگتنے کے لیے تیار ہوں تو شوق سے بھگتتے رہیں لیکن آخر یہ کیا ضروری ہے کہ اسلام میں اُن افعال کی گنجائش زبردستی نکالی جائے جن سے وہ شدت کے ساتھ روکتا ہے۔

اسلام میں اگر جنگ کے موقع پر عورتوں سے مرہم پٹی کا کام لیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ امن کی حالت میں عورتوں کو دفتروں اور کارخانوں اور کلبوں اور پارلیمنٹوں میں لا کھڑا کیا جائے۔ مرد کے دائرہ عمل میں آ کر عورتیں کبھی مردوں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے کہ وہ ان کاموں کے لیے بنائی ہی نہیں گئی ہیں۔ ان کاموں کے لیے جن اخلاقی اور ذہنی اوصاف کی ضرورت ہے وہ دراصل مرد میں پیدا کیے گئے ہیں۔ عورت مصنوعی طور پر مرد بن کر کچھ تھوڑا بہت ان اوصاف کو اپنے اندر ابھارنے کی کوشش کرے بھی تو ان کا دہرا نقصان خود اس کو بھی ہوتا ہے اور معاشرہ کو بھی۔ اس کا اپنا نقصان یہ ہے کہ وہ نہ پوری عورت رہتی ہے، نہ پوری مرد بن سکتی ہے اور اپنے اصل دائرۂ عمل میں جس کے لیے وہ فطرتاً پیدا کی گئی ہے ناکام رہ جاتی ہے۔ معاشرہ اور ریاست کا نقصان یہ ہے کہ وہ اہل کارکنوں کے بجائے نااہل کارکنوں سے کام لیتا ہے اور عورت کی آدھی زنانہ اور آدھی مردانہ خصوصیات سیاست اور

معیشت کو خراب کر کے رکھ دیتی ہیں۔ اس سلسلہ میں گنتی کی چند سابقہ معروف خواتین کے نام گنانے سے کیا فائدہ۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ جہاں لاکھوں کارکنوں کی ضرورت ہو کیا وہاں تمام خواتین موزوں ہو سکیں گی؟ ابھی حال ہی میں مصر کے سرکاری محکموں اور تجارتی اداروں نے یہ شکایت کی ہے کہ وہاں بحیثیت مجموعی ایک لاکھ دس ہزار خواتین جو مختلف مناصب پر کام کر رہی ہیں بالعموم ناموزوں ثابت ہو رہی ہیں اور ان کی کارکردگی مردوں کی بہ نسبت ۵۵ فیصد سے زیادہ نہیں۔ پھر مصر کے تجارتی اداروں نے یہ عام شکایت کی ہے کہ عورتوں کے پاس پہنچ کر کوئی راز راز نہیں رہتا۔ مغربی ممالک میں جاسوسی کے جتنے واقعات پیش آتے ہیں ان میں بھی عموماً کسی نہ کسی طرح عورتوں کا دخل ہوتا ہے۔

عورتوں کی تعلیم سے اسلام ہرگز نہیں روکتا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم ان کو دلوائی جانی چاہیئے، لیکن چند شرطوں کے ساتھ۔ اوّل یہ کہ ان کو وہ تعلیم خاص طور پر دی جائے جس سے وہ اپنے دائرہ عمل میں کام کرنے کے لیے ٹھیک ٹھیک تیار ہو سکیں اور ان کی تعلیم بعینہٖ وہ نہ ہو جو مردوں کی ہو۔ دوسرے یہ کہ تعلیم مخلوط نہ ہو اور عورتوں کو زنانہ تعلیم گاہوں میں عورتوں ہی سے تعلیم دلوائی جائے۔ مخلوط تعلیم کے مہلک نتائج مغربی ترقی یافتہ ممالک میں اس حد تک سامنے آ چکے ہیں کہ اب صرف عقل کے اندھے ہی ان کا انکار کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیئے امریکہ میں ۱۷ سال تک عمر کی لڑکیاں جو ہائی سکولوں میں پڑھتی ہیں، مخلوط تعلیم کی وجہ سے ہر سال ان میں سے اوسطاً ایک ہزار حاملہ نکلتی ہیں۔ گو ابھی یہ شکل ہمارے ہاں رونما نہیں ہوئی ہے لیکن اس مخلوط تعلیم کے نتائج کچھ ہمارے

سامنے بھی آنے شروع ہو گئے ہیں۔ تیسرے یہ کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین سے ایسے اداروں میں کام لیا جاتے جو صرف عورتوں کے لیے ہی مخصوص۔ مثلاً زنانہ تعلیم گاہیں اور زنانہ ہسپتال وغیرہ۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۶۲ء)

اسلامی حکومت میں معاشرہ کی اصلاح و تربیت

سوال :- کیا اسلامی حکومت خواتین کی بڑھتی ہوئی آزادی کو سختی سے روکے گی؟ جیسے ان کی زیبائش اور نیم عریاں لباس زیب تن کرنے اور فیشن کا کا رجحان اور جیسے آج کل نوجوان لڑکیاں نہایت تنگ و دلفریب سنٹ سے معطر لباس اور غازہ و سرخی سے مزّین اپنے ہر خد و خال اور نشیب و فراز کی نمائش بر سر عام کرتی ہیں اور آجکل نوجوان لڑکے بھی ہالی وڈ فلموں سے متاثر ہو کر ٹیڈی بوائز بن رہے ہیں۔ تو کیا حکومت قانون Legislation کے ذریعے سے ہر مسلم و غیر مسلم لڑکے اور لڑکی کے آزادانہ رجحان کو روکے گی؟ خلاف ورزی پر سزا دے گی والدین و سرپرستوں کو جرمانہ کیا جا سکے گا؟ تو اس طرح کیا ان کی شہری آزادی پر ضرب نہ لگے گی؟ کیا گرلز گائیڈ۔ اپوا (APWA) یا دیگر وائی ایم سی اے (YMCA) اور وائی ڈبلیو سی اے (YWCA) جیسے ادارے اسلامی نظام میں گوارا کیے جا سکتے ہیں؟ کیا خواتین

اسلامی عدلیہ سے، خود طلاق لینے کی مجاز ہو سکیں گی اور مردوں پر ایک سے زیادہ شادی کی پابندی آج جائز ہوگی؛ یا خواہ اسلامی عدالت کے روبرو ہی ان کو اپنی پسند سے (Civil Marriage) کرنے کا حق حاصل ہو سکتا ہے؟ کیا خواتین کو یوتھ فیسٹیول، کھیلوں، نمائش ڈراموں، ناچ، فلموں یا مقابلہ حسن میں شرکت یا (Air Hostess) وغیرہ بننے کی آج بھی اسلامی حکومت مخالفت کرے گی۔ ساتھ ہی قومی کردار تباہ کرنے والے ادارے مثلاً سینما، فلمیں، ٹیلی ویژن ریڈیو پر فحش گانے یا عریاں رسائل ولٹریچر، موسیقی، ناچ ورنگ کی ثقافتی محفلیں وغیرہ کو بند کر دیا جائے گا یا فائدہ اٹھانا ممکن ہوگا؟

جواب: اسلام معاشرہ کی اصلاح وتربیت کا سارا کام محض قانون کے ڈنڈے سے نہیں لیتا، تعلیم، نشر واشاعت اور رائے عام کا دباؤ اس کے ذرائع اصلاح میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان تمام ذرائع کے استعمال کے بعد اگر کوئی خرابی باقی رہ جائے تو اسلام قانونی وسائل اور انتظامی تدابیر استعمال کرنے میں بھی تامل نہیں کرتا عورتوں کی عریانی اور بے حیائی فی الواقع ایک بہت بڑی بیماری ہے جسے کوئی سچی اسلامی حکومت برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ بیماری اگر دوسری تدابیر اصلاح سے درست نہ ہو یا اس کا وجود باقی رہ جائے تو یقیناً اس کو از روئے قانون روکنا پڑے گا۔ اس کا نام اگر شہری آزادی پر ضرب لگانا ہے تو جواریوں کو پکڑنا اور جیب کتروں کو سزائیں دینا بھی شہری آزادی پر ضرب لگانے کے مترادف ہے۔ اجتماعی زندگی لازماً افراد پر کچھ پابندیاں عائد کرتی ہے۔ افراد کو اس کے لیے آزاد نہیں

چھوڑا جا سکتا کہ وہ اپنے ذاتی رجحانات اور دوسروں سے سیکھی ہوئی برائیوں سے اپنے معاشرہ کو خراب کریں۔

گرلز گائیڈ (girl Guides) کے لیے اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔ اپوا (APWA) قائم رہ سکتی ہے بشرطیکہ وہ اپنے دائرہ عمل میں رہ کر کام کرے اور قرآن کا نام لے کر قرآن کے خلاف طریقے استعمال کرنا چھوڑ دے۔ (YMCA) عیسائی عورتوں کے لیے رہ سکتا ہے مگر کسی مسلمان عورت کو اس میں گھسنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ مسلمان عورتیں چاہیں تو (YWMA) بنا سکتی ہیں، بشرطیکہ وہ اسلامی حدود میں رہیں۔

مسلمان عورت اسلامی عدلیہ کے ذریعے سے خلع حاصل کر سکتی ہے۔ فسخ نکاح (Nullification) اور تفریق (Judicial Separation) کی ڈگری بھی عدالت سے حاصل کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ شریعت کے مقررہ کردہ قوانین کے مطابق ان میں سے کوئی ڈگری عدالت سے حاصل کرنے کی مجاز ہو۔ لیکن طلاق (Divorce) کے اختیارات قرآن نے صریح الفاظ میں صرف مرد کو دیتے ہیں اور کوئی قانون مردوں کے اس اختیار میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ قرآن کا نام لے کر قرآن کے خلاف قوانین بنائے جانے لگیں۔ پوری اسلامی تاریخ عہد رسالتؐ سے لے کر اس صدی تک اس تصور سے نا آشنا ہے کہ طلاق دینے کا اختیار مرد سے سلب کر لیا جائے اور کوئی عدالت یا پنچائت اس میں دخل دے۔ یہ تخیل سیدھا یورپ سے چل کر ہمارے ہاں درآمد ہوا ہے اور اس کے درآمد کرنے والوں نے کبھی آنکھیں کھول کر یہ نہیں دیکھا ہے کہ یورپ

میں اس قانونِ طلاق کا پس منظر (Background) کیا ہے اور وہاں اس کے کتنے بُرے نتائج رونما ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں جب گھروں کے سکینڈل نکل کر بازاروں میں پہنچیں گے تو لوگوں کو پتہ چلے گا کہ خدا کے قوانین میں ترمیم کے کیا نتائج ہوتے ہیں۔

مردوں پر ایک سے زیادہ شادی کے معاملہ میں از روئے قانون پابندی عائد کرنے کا یا اس میں رکاوٹ ڈالنے کا تخیل بھی ایک بیرونی مال ہے جسے قرآن کے جعلی پرمٹ پر درآمد کیا گیا ہے۔ یہ اُس سوسائٹی میں سے آیا ہے جس میں ایک ہی عورت اگر منکوحہ بیوی کی موجودگی میں داشتہ کے طور پر رکھی جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ قابلِ برداشت ہے بلکہ اس کے حرامی بچوں کے حقوق محفوظ کرنے کی بھی فکر کی جاتی ہے (فرانس کی مثال ہمارے سامنے ہے) لیکن اگر اسی عورت سے نکاح کر لیا جائے تو یہ جرم ہے۔ گویا ساری پابندیاں حلال کے لیے ہیں، حرام کے لیے نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن مجید کی ابجد سے بھی واقف ہو تو کیا وہ یہ اقدار (Values) اختیار کر سکتا ہے؟ کیا اس کے نزدیک زنا قانوناً جائز اور نکاح قانوناً حرام ہونے کا عجیب و غریب فلسفہ برحق ہو سکتا ہے؟ اس طرح کے قوانین بنانے کا حاصل اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ مسلمانوں میں زنا کا رواج بڑھے گا۔ گرل فرینڈز اور داشتائیں (Mistresses) فروغ پائیں گی اور دوسری بیوی ناپید ہو جائے گی۔ یہ ایک ایسی سوسائٹی ہو گی جو اپنے خدوخال میں اسلام کی اصل سوسائٹی سے بہت دُور اور مغربی سوسائٹی سے بہت قریب ہو گی۔ اس صورتِ حال کے تصوّر سے جس کا جی چاہے مطمئن

ہو۔ مسلمان کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔

سول میرج کا سوال ظاہر ہے کہ مسلمان عورت کے ساتھ تو پیدا نہیں ہوتا یہ سوال اگر پیدا ہوتا ہے تو کسی مشرک عورت سے شادی کرنے کے معاملہ میں یا کسی ایسی عیسائی یا یہودی عورت سے شادی کے معاملہ میں جو اسلامی قانون کے تحت کسی مسلمان سے نکاح کرنے کے لیے تیار نہ ہو اور مسلمان مرد اس کے عشق میں مبتلا ہو کر اس اقرار کے ساتھ شادی کرے کہ وہ کسی مذہب کا پابند نہ ہوگا۔ یہ کام اگر کسی کو کرنا ہی ہو تو اسے اسلام سے فتویٰ لینے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اسلام کیوں اپنے ایک پیرو کو اس کی اجازت دے؟ اور ایک اسلامی عدالت کا یہ کام کب ہے کہ مسلمانوں کی اس طریقہ پر شادیاں کرواتے۔

اگر ایک اسلامی حکومت بھی یوتھ فیسٹول (Youth Festival) اور کھیلوں کی نمائشوں اور ڈراموں اور رقص و سرود اور مقابلۂ حسن میں مسلمان عورتوں کو لاتے یا ایر ہوسٹس (Air Hostess) بنا کر مسافروں کے دل موہنے کی خدمت ان سے لے تو ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلامی حکومت کی آخر ضرورت کیا ہے۔ یہ سارے کام تو کفر اور کفار کی حکومت میں بآسانی ہو سکتے ہیں بلکہ زیادہ آزادی کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔

سنیما، فلم، ٹیلی ویژن اور ریڈیو وغیرہ تو خدا کی پیدا کردہ طاقتیں ہیں جن میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں۔ خرابی ان کے اس استعمال میں ہے جو انسانی اخلاق کو تباہ کرنے والا ہے۔ اسلامی حکومت کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ان ذرائع کو انسانیت کی فلاح کے لیے استعمال کرے اور اخلاقی فساد کے لیے استعمال ہونے

کا دروازہ بند کر دے۔

ترجمان القرآن جلد ۷۵۔ عدد ۴۔ جنوری ۱۹۶۲ء

پاکستان میں شرعی سزاؤں کے نفاذ کا مسئلہ

سوال: پاکستان میں جماعت اسلامی کے مخالف حضرات پھر اس مہم کو چلانے کی تیاریاں کر رہے ہیں جو مارشل لاء سے قبل اس کے چلانے میں سرگرمی دکھا رہے تھے۔ یعنی یہ کہ آپ اور جماعت اسلامی کو بدنام کیا جائے۔ چنانچہ بعض خاص جرائد کے دیکھنے سے بخوبی واضح ہے۔ ان حضرات کی تقریروں میں بھی اس قسم کی باتیں عام اجتماعات اور اجلاسوں میں سنی جاتی ہیں۔ اور منظرِ عام پر یہ باتیں آگئی ہیں۔

اس سلسلہ میں وہ سب سے زیادہ زور اس مسئلہ پر دیتے ہیں کہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان میں حدود و قصاص اور شرعی سزاؤں کے نفاذ کو "ظلم" کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ قرآن کی تجویز کردہ سزائیں ہیں۔ حال ہی میں ایک ممتاز عالم نے قومی اسمبلی میں آپ کے متعلق اس قسم کا ایک بیان دیا ہے جو بعض جرائد میں شائع ہو چکا ہے ان حضرات کا کہنا ہے کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں جب ہم جرائم کے انسداد کی غرض سے شرعی سزاؤں کے نفاذ کے لیے کوئی بل پیش کرتے ہیں تو الحاد پرست ممبروں کی طرف سے ہماری مخالفت اس بنیاد پر

کی جاتی ہے کہ مولانا مودودی نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ پاکستان کی مخلوط سوسائٹی میں حدود اور شرعی سزاؤں کا نفاذ ظلم ہے۔ اور مولانا کی تحریریں پڑھ کر ہمیں سناتی جاتی ہیں۔ یہ حضرات اسمبلیوں سے باہر آکر لوگوں سے کہا کرتے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام اور حدود و قصاص اور شرعی سزاؤں کے نفاذ کی راہ میں سب سے زیادہ رکاوٹ وہی لوگ ڈالتے ہیں جو خود اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں یعنے آپ اور جماعت اسلامی۔

اس قسم کی بحثیں اب عام و خاص کی مجلسوں میں شروع ہوتی ہیں اور عام طور پر ان بحثوں اور مباحثوں کا اثر عوام اور خواص دونوں پر اچھا نہیں پڑ رہا ہے۔ بلکہ وہ نئی نئی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں میں پڑ رہے ہیں۔ جس کے نتائج دُور رس اور اسلام اور عامۃ المسلمین کے حق میں خطرناک ثابت ہوں گے۔ اور جماعت کے کارکنوں کو بھی اس سے ہر جگہ مشکلات پیش آنے کا قوی اندیشہ ہے۔

اس سلسلہ میں آپ کا وضاحتی بیان یا کوئی ایسا مضمون میری نظر سے نہیں گزرا ہے جو پاکستان میں بحالت موجودہ شرعی سزاؤں کے نفاذ کے بارے میں آپ کے موقف کی وضاحت کے لیے کافی ہو

جواب: آپ کی نصح و خیر خواہی کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ مگر آپ نے اس بات پر غور نہیں فرمایا کہ یہ حضرات جو کھیل کھیل رہے ہیں اس کی تہ میں کیا ہے۔ شرعی سزاؤں کے متعلق میری ایک عبارت کو خاص معنی پہنا کر اچھالنے اور جگہ جگہ

اس کو پھیلانے کی جو خدمت وہ انجام دے رہے ہیں یہ کام کیا فی الواقع کسی ایسے شخص ہی کے کرنے کا تھا جو پاکستان میں حدودِ شرعیہ کے اجرا کا دل سے خواہاں ہو؟ اخلاص کے ساتھ اس بات کی خواہش رکھنے والا انسان تو یہ کوشش کرے گا کہ اجرائے حدود کے معاملہ کو تمام اہل دین کے متفق علیہ مسئلے کی حیثیت سے پیش کرے۔ لیکن یہ حضرات ایک ایسے خادم دین کو جو برسوں سے اسلامی قانون کے نفاذ کی خاطر لڑ رہا ہے اجرائے حدود کے مخالف کی حیثیت دے رہے ہیں اور اس کا نام اچھال اچھال کر دنیا کے سامنے یہ یقین دلانے کے لیے پیش کر رہے ہیں کہ وہ پاکستان میں حدود شرعیہ کے نفاذ کو ظلم کہتا ہے سوال یہ ہے کہ اُس عبارت کا یہ مفہوم و مدعا میں نے بیان کیا تھا یا وہ اس میں یہ مفہوم داخل کر رہے ہیں؟ اُس عبارت کی اشاعت عام میں کر رہا ہوں یا وہ کر رہے ہیں؟ اس کو اجرائے حدود کے معاملہ میں رکاوٹ ڈالنے کا ذریعہ میں بنا رہا ہوں یا وہ بنا رہے ہیں؟ آج یہ لوگ نہایت مکاری کے ساتھ کہتے ہیں کہ "جب ہم شرعی سزاؤں کے نفاذ کے لیے کوئی بل پیش کرتے ہیں تو الحاد پرست ممبروں کی طرف سے ہماری مخالفت اس بنیاد پر کی جاتی ہے کہ مولانا مودودی نے یہ اور یہ فتویٰ دیا ہے"۔ ان سے ذرا پوچھئے کہ مودودی کا یہ فتویٰ ان الحاد پرست ممبروں کے علم میں آپ لوگوں کے سوا اور کون لایا ہے؟ آپ لوگ ہی تو ہیں جو مودودی سے انتقام لینے کے لیے اس کی ایک عبارت کو زبردستی شرعی سزاؤں کے خلاف فتویٰ بنا کر اچھال رہے ہیں اور ہر روز اچھالے چلے جا رہے ہیں تاکہ کوئی الحاد پرست اس کو اپنی اغراض کے لیے ہتھیار بناتے۔

اور معاملہ صرف ایک عبارت ہی کا نہیں ہے۔ آئے دن میری کتابوں اور عبارتوں میں سے ایک نئی چیز نکالی جا رہی ہے اور ایک نیا الزام مجھ پر چسپاں کیا جا رہا ہے۔ میرے ساتھ ان لوگوں کا معاملہ وہی ہے جو اکابرِ دیوبند کے ساتھ بریلوی کرتے رہے ہیں۔ مجھے یقین ہو چکا ہے کہ یہ لوگ خدا اور آخرت سے بالکل بے فکر ہیں۔ بلکہ ان کے انداز گفتگو میں دیانت تو درکنار شرافت تک کے آثار نہیں پائے جاتے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ان کی کسی بات کی طرف التفات نہ کروں گا اور صبر کے ساتھ اپنا کام کرتا رہوں گا۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

سوال: تفہیمات کا مضمون (قطع ید اور دوسرے شرعی حدود) ایک عرصہ سے عنوان بحث بنا ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں جناب مفتی صاحب سے رجوع کیا گیا۔ انہوں نے مضمون متذکرہ کو غور سے مطالعہ کرنے کے بعد حکم دیا ہے کہ مندرجہ ذیل استفسار آنجناب سے کیا جاتے:۔

۱۔ اسلام کے قانون و اصول قطعی طور پر ناقابلِ تجزیہ ہیں؟ یا کچھ گنجائش ہے؟ مثلاً اگر حکومت اجرا۔ حدود کا قانون پاس کر دے اور جج حضرات ان قوانین کے عملی نفاذ کے مجاز ہو جائیں لیکن معاشرہ کی حالت یہی رہے جو اب ہے اور اصلاح معاشرہ کے لیے کوئی قانون نافذ ہی نہ کیا جاتے تو اس صورت میں شرعی ثبوت کے بعد رجم اور جلد کی سزا ظلم ہو گی یا نہیں؟

۲۔ آپ نے تفہیمات میں لکھا ہے کہ نکاح، طلاق اور حجاب شرعی کے اسلامی قوانین اور اخلاقِ صنفی کے متعلق اسلام کی تعلیمات سے ان حدود کا گہرا ربط ہے جسے منفک نہیں کیا جا سکتا۔

حالانکہ مندرجہ بالا صورت میں یہ ربط ٹوٹ جائے گا۔ جو لوگ اس فعل کے ذمہ دار ہوں گے (پارلیمنٹ یا حکومت) یقیناً ان کا یہ فعل نامناسب ہوگا۔ مگر کیا ان قوانین کی رو سے عدالت جو حکم اور حد جاری کرے گی کیا یہ حکم اور حد جاری کرنا ظلم ہوگا۔

۳۔ کیا حکومت کو اصلاح معاشرہ کے لیے اجراء حدود کو کچھ مدت کے لیے ملتوی رکھنا چاہیے اور احکام اسلامی کے اجراء میں کسی خاص ترتیب کو ملحوظ رکھنا چاہیئے؟

جواب: میرے اس مضمون کے متعلق سوال کرنے سے پہلے اچھا ہوتا کہ اسی مضمون کے آخر میں اس کی جو تاریخ تحریر درج کی گئی ہے اسے بھی دیکھ لیا جاتا اور یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی کہ مضمون کا اصل موضوع زیر بحث کیا تھا۔ تفہیمات حصہ دوم میں جہاں یہ مضمون درج ہے وہیں آخر میں یہ نوٹ بھی موجود ہے کہ یہ مارچ ۱۹۳۹ء میں لکھا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت کوئی حکومت ایسی موجود نہیں تھی جس میں یہ سوال درپیش ہوتا کہ اب یہاں حدودِ شرعیہ جاری کی جائیں یا نہیں۔ پھر مضمون کا موضوع بھی یہ نہیں تھا کہ یہاں اجرائے حدود کی کیا صورت ہو۔ اس کا موضوع تو ان لوگوں کے اعتراضات کا جواب دینا ہے جو زنا اور قذف اور سرقے کی شرعی سزاؤں کو انتہائی سخت قرار دیتے تھے اور وحشیانہ سزا کہنے

سے بھی نہ چوکتے تھے۔ اس کے جواب میں ان کو سمجھایا گیا تھا کہ اسلام محض ان جرائم پر سزا ہی نہیں دیتا ہے بلکہ ان کے ساتھ معاشرے میں ان اسباب کی روک تھام بھی کرتا ہے جن کی وجہ سے لوگ ان جرائم میں مبتلا ہوتے ہیں۔ تم اسلام کی اس اصلاحی اسکیم کو نظر انداز کر کے معاشرہ تو وہ فرض کرتے ہو جس میں فسق و فجور کو بڑھانے کے لیے تمام اسباب فراہم کر دیتے گئے ہیں اور پھر یہ تصوّر کر کے چیخ اٹھتے ہو کہ اس صورت حال کو باقی رکھتے ہوتے اسلام کا محض قانونِ تعزیرات نافذ کر دیا جاتے گا۔ یہی وجہ ہے کہ تمہیں یہ سزائیں حد سے زیادہ سخت نظر آتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس بحث میں سے جن لوگوں نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ میں اجراتے حدودِ شرعیہ کا مخالف ہوں وہ کس حد تک نیک نیت ہیں اور ان کی نکتہ آفرینیاں کہاں تک قابلِ التفات ہیں؟

اب جو سوالات مفتی صاحب نے اس مضمون پر اٹھاتے ہیں ان کا مختصر جواب حاضر ہے:

اس وقت اگر کوئی مسلمان حکومتِ اسلام کے تمام احکام و قوانین اور اس کی ساری اصلاحی ہدایات کو معطل رکھ کر اس کے قوانین میں سے صرف حدودِ شرعیہ کو الگ نکال لے اور عدالتوں میں ان کو نافذ کرنے کا حکم دے دے تو جو قاضی یا جج کسی زانی یا سارق یا شاربِ خمر پر حد جاری کرنے کا حکم دے گا وہ تو ظالم نہیں ہوگا، البتہ وہ حکومت ضرور ظالم ہوگی جس نے شریعتِ الٰہیہ کے ایک حصّے کو معطّل اور دوسرے حصّے کو نافذ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں ایسی حکومت کو اس آیتِ قرآنی کا مصداق سمجھتا ہوں جس میں فرمایا گیا ہے:

اَفَتُؤمِنُونَ بِبَعضِ الکِتَابِ وَتَکفُرُونَ بِبَعضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَن یَّفعَلُ ذٰلِکَ مِنکُم اِلَّا خِزیٌ فِی الحَیٰوۃِ الدُّنیَا وَیَومَ القِیٰمَۃِ یُرَدُّونَ اِلٰٓی اَشَدِّ العَذَابِ[له] میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ جو حکومت خود شراب بنانے اور بیچنے کے لائسنس دیتی ہو اور جس کی تقریبات میں خود حکومت کے کارفرما اور ان کے معزز مہمان شراب سے شغل کرتے ہوں ان کے قانون میں اگر شارب خمر کے لیے ۸۰ کوڑے لگانے کی سزا مقرر کر دی جاتے تو ہم اسے اسلامی قانون نافذ کرنے والی حکومت کہنے میں حق بجانب ہوں گے۔ میں یہ نہیں مانتا کہ ایک طرف عورتوں اور مردوں کے آزادانہ اختلاط کو رواج دینا، لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ کالجوں میں پڑھانا عورتوں سے سرکاری دفاتر میں مردوں کے ساتھ کام لینا، ننگی تصویروں اور عریاں فلموں اور فحش لٹریچر کی بے روک ٹوک اشاعت جاری رکھنا، ۱۶ سال سے کم عمر کی لڑکی اور ۱۸ سال سے کم عمر کے لڑکے کا نکاح قانوناً ممنوع ٹھہرانا، اور دوسری طرف زنا پر رجم اور کوڑوں کی سزا دینا فی الواقع اسلامی قانون کا اجراء ہے۔ مجھے یہ ہرگز تسلیم نہیں ہے کہ سود اور قمار کو حلال کرنے والی اور ان محرمات کو خود رواج دینے والی حکومت چوری پر ہاتھ کاٹنے کا قانون نافذ کر کے اسلامی قانون نافذ

له کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور روز قیامت وہ شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیتے جائیں گے۔

کرنے والی حکومت قرار دی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی عالم دین اس متضاد طرز عمل کے جواز کے قائل ہوں اور ان کے نزدیک شریعت کے ٹکڑے کرنا اور اس کے اجزا میں سے بعض کو ترک اور بعض کو اخذ کر لینا ظلم نہیں بلکہ ایک نیکی ہو تو وہ اپنے دلائل ارشاد فرمائیں۔

دراصل یہ مسئلہ محض اس سادہ سے قانونی سوال پر بحث کر کے حل نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ حالات میں شرعی حدود کا نفاذ جائز ہے یا نہیں۔ اللہ اور اس کے رسول نے ہم کو محض احکام ہی نہیں دیئے ہیں بلکہ ان کے ساتھ کوئی حکمت بھی سکھائی ہے جس سے کام لے کر ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ ایک مدتِ دراز تک کفر و فسق کی فرمانروائی کے تحت رہنے کے بعد ہمارے ملک میں جو حالات پیدا ہو چکے ہیں ان میں اقامت دین کا کام اب کس طرح ہونا چاہیئے۔ جہاں تک میں نے شریعت کو سمجھا ہے اس کے نظام میں اصلاح، سدباب ذرائع اور تعزیر کے درمیان ایک مکمل توازن قائم کیا گیا ہے۔ ایک طرف وہ ہر پہلو سے تزکیۂ اخلاق اور تطہیر نفوس کی تدابیر ہمیں بتاتی ہے، دوسری طرف وہ ایسی ہدایات ہمیں دیتی ہے جن پر عمل درآمد کر کے ہم بگاڑ کے اسباب کی روک تھام کر سکتے ہیں، اور تیسری طرف وہ تعزیرات کا ایک قانون ہمیں دیتی ہے تاکہ تمام اصلاحی و انسدادی تدابیر کے باوجود اگر کہیں بگاڑ رونما ہو جائے تو سختی کے ساتھ اس کا تدارک کر دیا جائے۔ شریعت کا منشا اس پوری اسکیم کو متوازن طریقے سے نافذ کر کے ہی پورا کیا جا سکتا ہے۔ اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کے کسی جز کو ساقط اور کسی کو نافذ کرنا حکمتِ دین کے بالکل خلاف ہے۔ اس کے جواز میں یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ

جس جز کو ہم نافذ کر رہے ہیں اس کے نفاذ کا حکم قرآن میں موجود ہے۔ اس استدلال کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک حکیم کا مرتب کردہ نسخہ کسی اناڑی کے ہاتھ آجائے اور وہ اس کے بہت سے اجزاء میں سے صرف دو چار اجزاء نکال کر کسی مریض کو استعمال کرائے اور اعتراض کرنے والے کا منہ بند کرنے کے لیے یہ دلیل پیش کرے کہ جو اجزاء میں استعمال کرا رہا ہوں وہ سب حکیم کے نسخے میں درج ہیں۔ اس کی اس دلیل کا جواب آخر آپ یہی تو دیں گے کہ بندۂ خدا حکیم کے نسخے میں جو مصلحات اور بدرقے درج تھے ان سب کو چھوڑ کر تو صرف سمیات مریض کو استعمال کرا رہا ہے اور نام حکیم کا لیتا ہے کہ میں اس کے نسخے سے علاج کر رہا ہوں۔ حکیم نے تجھ سے یہ کب کہا تھا کہ تو میرے نسخے میں سے جس جز کو چاہے چھانٹ کر نکال لے اور جس مریض کو چاہے کھلا دے۔

اس کے ساتھ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ شریعت آیا اپنے نفاذ کے لیے مومن و متقی کارکن چاہتی ہے یا فاسق و فاجر لوگ اور وہ جو لوگ جو اپنے ذہن میں اس کے احکام کی صحت کے معتقد تک نہیں ہیں؟ اس معاملے میں بھی محض جواز اور عدم جواز کی قانونی بحث مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ مجرد قانونی لحاظ سے ایک کام جائز بھی ہو تو یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ حکمت دین کے لحاظ سے وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ کیا حکمت دین کا یہ تقاضا ہے کہ احکام شرعیہ کا اجراء ایسے حکام کے ذریعہ سے کرایا جاتے جن کی اکثریت رشوت خور، بدکردار اور خدا و آخرت سے بے خوف ہے اور جن میں ایک بڑی تعداد عقیدۃً مغربی قوانین کو برحق اور اسلامی قوانین کو غلط اور فرسودہ سمجھتی ہے؟ میرے نزدیک تو اسلام کو دنیا بھر میں بدنام

کر دینے اور خود مسلم عوام کو بھی اسلام سے مایوس کر دینے کے لیے اس سے زیادہ کارگر نسخہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ان لوگوں کے ہاتھوں احکام شریعت جاری کرائے جائیں۔ اگر چند بندگانِ خدا پر بھی جھوٹے مقدمے بنا کر سرقے اور زنا کی حد جاری کر دی گئی تو آپ دیکھیں گے کہ اس ملک میں حدودِ شرعیہ کا نام لینا مشکل ہو جائے گا اور دنیا میں یہ چیز اسلام کی ناکامی کا اشتہار بن جائے گی۔ اس لیے اگر ہم دین کی کچھ خدمت کرنا چاہتے ہیں، اُس سے دشمنی نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں پہلے اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ ملک کا انتظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے جو دین کی سمجھ بھی رکھتے ہوں اور اخلاص کے ساتھ اس کو نافذ کرنے کے خواہشمند بھی ہوں۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہو گا کہ اسلام کی پوری اصلاحی اسکیم کو ہر جہت سے ہمہ گیر طریقے پر نافذ کیا جائے اور اسی سلسلے میں حدودِ شرعیہ کا اجراء بھی ہو۔ یہ کام بڑا صبر اور بڑی حکمت چاہتا ہے یہ ہتھیلی پر سرسوں جمانا نہیں ہے کہ آج مجلسِ قانون ساز میں ایک دو نشستیں ہاتھ آ گئیں اور کل حدودِ شرعیہ جاری کرنے کے لیے ایک مسودۂ قانون پیش کر دیا گیا۔

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی سمجھ لینی چاہیئے۔ ایک حالت تو وہ ہوتی ہے جس میں پہلے سے ملک کے اندر اسلامی قانون نافذ چلا آ رہا ہو اور بعد میں بتدریج انحطاط رونما ہوتے ہوتے یہ نوبت آ گئی ہو کہ شریعت کے بعض حصے متروک ہو گئے ہوں اور جن حصوں پر عمل ہو بھی رہا ہو ان کو نافذ کرنے والے بدکردار لوگ ہوں۔ اس حالت میں حکمتِ دین کا تقاضا یہ نہ ہو گا کہ شریعت کے جو حصے نافذ ہیں ان کو بھی چھوڑ دیا جائے بلکہ یہ ہو گا کہ عام اصلاح کی کوششیں کر کے ایک طرف صالح عناصر کو برسرِ اقتدار لایا جائے اور دوسری طرف شریعت کے باقی ماندہ حصوں کو نافذ کیا

جاتے۔ دوسری حالت وہ ہے جس میں کفر و فسق کا سیلاب سب کچھ بہا لے گیا ہو اور اب ہم کو نئے سرے سے تعمیر کا آغاز کرنا ہو۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ بنیادوں سے تعمیر شروع کرنی ہو گی نہ کہ اوپر کی منزلوں سے

(ترجمان القرآن جلد ۵۹، عدد ۱۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء)

تعبیرِ دستور کا حق

سوال:۔ دستور کی تعبیر کا حق کس کو ہونا چاہیئے؟ مقننہ کو یا عدلیہ کو؟ سابق میں میں یہ حق عدلیہ کو تھا اور موجودہ دستور میں یہ حق عدلیہ سے چھین کر مقننہ کو ہی دے دیا گیا ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ عدالتوں کے اختیارات کو کم کر دیا گیا ہے اور یہ حق عدلیہ کے پاس باقی رہنا چاہیئے۔ اس مسئلہ پر ایک صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ اسلام کے دورِ اوّل میں عدالتوں کا کام صرف مقدمات کا فیصلہ کرنا تھا۔ قانون کی تشریح اور تعبیر کا حق عدالتوں کو نہ تھا اور نہ عدالتیں یہ طے کرنے کی مجاز تھیں کہ قانون صحیح ہے یا غلط۔ یہ رائے کہاں تک درست ہے؟[1]

جواب:۔ موجودہ زمانے کے قانونی و دستوری مسائل پر اسلام کے دورِ اوّل کی نظیریں چسپاں کرنے کا رجحان آجکل بہت بڑھ گیا ہے۔ لیکن جو لوگ اس طرح کے استدلال

---

[1] واضح رہے کہ اب دستور میں ترمیم ہو چکی ہے اور تعبیرِ دستور کا حق عدلیہ کو دیا جا چکا ہے۔

کرتے ہیں وہ ہمیشہ اُس عظیم الشان فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو اُس وقت کے معاشرے اور ہمارے آج کے معاشرے میں، اور اس وقت کے کارفرماؤں اور اِس دور کے کارفرماؤں میں فی الواقع موجود ہے۔

خلافتِ راشدہ میں خلیفہ خود قرآن و سنت کا بہت بڑا عالم ہوتا تھا اور اس کی متقیانہ سیرت کی وجہ سے مسلمان اس پر یہ اعتماد رکھتے تھے کہ زندگی کے کسی مسئلے میں بھی اس کا اجتہاد کبھی دین کے راستے سے منحرف نہ ہوگا۔ اس کی مجلسِ شوریٰ کے ارکان بھی سب کے سب بلا استثنا۔ اس بنیاد پر رکنیت کا شرف حاصل کرتے تھے کہ وہ قوم میں سب سے زیادہ دین کے جاننے اور سمجھنے والے ہیں۔ ان کے زمرے میں کوئی ایسا آدمی بار نہیں پاسکتا تھا جو دین سے جاہل ہو، یا نفسانیت کی بنا پر دین میں تحریف کرنے والا ہو، یا جس سے مسلمانوں کو کسی بدعت یا غیر اسلامی رجحان کا اندیشہ ہو۔ معاشرے کی عظیم اکثریت بھی اس وقت دین کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی اور کوئی شخص اُس ماحول میں یہ جرآت نہ کرسکتا تھا کہ اسلام کے احکام اور اس کی رُوح کے خلاف کوئی حکم دے یا کوئی قاعدہ وضابطہ جاری کردے۔ یہی بلند معیار اسوقت کی عدالتوں کا بھی تھا۔ منصبِ قضا پر وہ لوگ سرفراز ہوتے تھے جو قرآن و سنّت میں گہری بصیرت رکھتے تھے، کمال درجہ کے متقی و پرہیزگار تھے، اور قانونِ خداوندی سے بال برابر بھی تجاوز کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان حالات میں مقننہ اور عدلیہ کے تعلقات کی وہی نوعیت تھی جو ایسے معاشرے میں ہونی چاہیے تھی۔ تمام جج مقدمات کے فیصلے براہ راست قرآن و سنّت کے احکام کی بنیاد پر کرتے تھے اور جن امور میں اجتہاد کی ضرورت پیش آتی تھی ان میں بالعموم وہ خود اجتہاد کرتے تھے۔ البتہ

جہاں معاملات کی نوعیت اس امر کا تقاضا کرتی تھی کہ جج اپنے انفرادی اجتہاد سے فیصلہ نہ کریں بلکہ خلیفہ کی مجلس شوریٰ اُن میں شریعت کا حکم مشخص کرے، ان کے بارے میں اجتماعی اجتہاد سے ایک ایسا ضابطہ بنا دیا جاتا تھا جو دین کے اصولوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھنے والا ہو سکتا تھا۔ اس نظام میں کوئی وجہ نہ تھی کہ ججوں کو مجلس شوریٰ کے بناتے ہوئے قانون پر نظرثانی کرنے کا اختیار ہوتا۔ کیونکہ وہ اگر کسی قانون کو رد کرنے کے مجاز ہو سکتے تھے تو اسی بنیاد پر تو ہو سکتے تھے کہ وہ اصل دستور (یعنی قرآن وسنت) کے خلاف ہے۔ اور قانون وہاں سرے سے کسی ایسے معاملہ میں بنایا ہی نہیں جاتا تھا جس کے متعلق قرآن وسنت میں واضح حکم موجود ہو۔ قانون سازی کی ضرورت صرف ان معاملات میں پیش آتی تھی جن میں نص موجود نہ ہونے کی وجہ سے اجتہاد ناگزیر ہوتا تھا۔ اور ایسے معاملات میں ظاہر ہے کہ انفرادی اجتہاد کی بہ نسبت اجتماعی اجتہاد زیادہ قابل اعتماد ہو سکتا تھا، خواہ بعض افراد کا ذاتی اجتہاد اس سے مختلف ہی کیوں نہ ہو۔

اب ظاہر ہے کہ اُس وقت کی یہ دستوری نظیر آج کے حالات پر کسی طرح بھی چسپاں نہیں ہوتی۔ نہ آج کے حکمران اور مجالس قانون ساز کے ارکان خلفائے راشدین اور ان کی مجلس شوریٰ سے کوئی نسبت رکھتے ہیں، نہ آج کے جج اس وقت کے قاضیوں جیسے ہیں اور نہ اس دور کی قانون سازی ان حدود کی پابند ہے جن کی پابندی اُس دور میں کی جاتی تھی۔ اس لیے اب آخر اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ ہم اپنے دستوری ضابطے اس وقت کے حالات کو سامنے رکھ کر تجویز کریں اور خلافت راشدہ کی نظیروں پر عمل شروع کرنے سے پہلے وہ حالات پیدا کرنے کی فکر کریں جن سے

وہ نظیریں عملاً تعلق رکھتی تھیں۔ موجودہ حالات میں جہاں تک شرعی معاملات کا تعلق ہے، آخری فیصلہ نہ انتظامیہ پر چھوڑا جا سکتا ہے، نہ مقننہ پر، نہ عدلیہ پر اور نہ مشاورتی کونسل پر۔ ان میں سے کوئی بھی اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ مسلمان شرعی امور میں ان پر کامل اعتماد کر سکیں۔ شریعت کو مسخ کرنے والے اجتہادات سے امن میسر آنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ مسلمانوں کی رائے عام کو بیدار کیا جائے اور قوم بحیثیت مجموعی اس قسم کے ہر اجتہاد کی مزاحمت کے لیے تیار ہو۔ رہے عام دستوری مسائل، جن میں شریعت کوئی منفی یا مثبت احکام نہیں دیتی، ان میں مقننہ کو آخری فیصلہ کن اختیارات دے دینا بحالات موجودہ خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک غیر جانبدار ادارہ ایسا موجود ہونا چاہیے جو یہ دیکھ سکے کہ مقننہ نے کوئی قانون بنانے میں دستور کے حدود سے تجاوز تو نہیں کیا ہے۔ اور ایسا ادارہ ظاہر ہے کہ عدلیہ ہی ہو سکتا ہے۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۹، عدد ۳۔ دسمبر ۱۹۶۲ء)

اسلام اور جمہوریت

سوال: جمہوریت کو آجکل ایک بہترین نظام قرار دیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام سیاست کے بارے میں بھی یہی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بہت بڑی حد تک جمہوری اصولوں پر مبنی ہے۔ مگر میری نگاہ میں جمہوریت کے بعض نقائص ایسے ہیں جن کے متعلق میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں

کہ اسلام انہیں کس طرح دور کر سکتا ہے وہ نقائص درج ذیل ہیں :۔

۱۔ دوسرے سیاسی نظاموں کی طرح جمہوریت میں بھی عملاً آخر کار اقتدار جمہور کے ہاتھوں سے چھن کر اور چند افراد میں مرتکز ہو کر جنگ زرگری کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور (Plutocracy) یا (Obgrachy) کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا کیا حل ممکن ہے ؟

۲۔ عوام کے متنوع اور متضاد مفادات کی بیک وقت رعایت ملحوظ رکھنا نفسیاتی طور پر ایک بڑا مشکل کام ہے۔ جمہوریت اس عوامی ذمہ داری سے کس شکل میں عہدہ برآ ہو سکتی ہے ؟

۳۔ عوام کی اکثریت جاہل، سادہ لوح، بے حس اور شخصیت پرست ہے۔ اور خود غرض عناصر انہیں برابر گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں نیابتی اور جمہوری ادارات کے لیے کامیابی سے کام کرنا بڑا دشوار ہے۔

۴۔ عوام کی تائید سے جو انتخابی اور نمائندہ مجالس وجود میں آتی ہیں، ان کے ارکان کی تعداد اچھی خاصی ہوتی ہے اور ان کے مابین باہمی بحث و مشاورت اور آخری فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے

آپ رہنمائی فرمائیں کہ آپ کے خیال میں اسلام اپنے جمہوری ادارات میں ان خرابیوں کو راہ پانے سے کیسے روکے گا۔

جواب :۔ آپ نے جمہوریت کے بارے میں جو تنقید کی ہے اس کے تمام نکات اپنی

جگہ درست ہیں، لیکن اس مسئلے میں آخری رائے قائم کرنے سے پہلے چند اور نکات کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

اوّلین سوال یہ ہے کہ انسانی معاملات کو چلانے کے لیے اصولاً کونسا طریقہ صحیح ہے؟ آیا یہ کہ وہ معاملات جن لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں ان کی مرضی سے سربراہ کار مقرر کیے جائیں اور وہ ان کے مشورے اور رضامندی سے معاملات چلائیں اور جب تک ان کا اعتماد سربراہ کاروں کو حاصل رہے اسی وقت تک وہ سربراہ کار رہیں؟ یا یہ کہ کوئی شخص یا گروہ خود سربراہ کار بن بیٹھے اور اپنی مرضی سے معاملات چلاتے اور اس کے تقرر اور علیحدگی اور کارپردازی میں سے کسی چیز میں بھی ان لوگوں کی مرضی و رائے کا کوئی دخل نہ ہو جن کے معاملات وہ چلا رہا ہو؟ اگر ان میں سے پہلی صورت ہی صحیح اور مبنی بر انصاف ہے تو ہمارے لیے دوسری صورت کی طرف جانے کا راستہ پہلے ہی قدم پر بند ہو جانا چاہیے، اور ساری بحث اس پر ہونی چاہیئے کہ پہلی صورت کو عمل میں لانے کا زیادہ سے زیادہ بہتر طریقہ کیا ہے

دوسری بات جو نگاہ میں رہنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ جمہوریت کے اصول کو عمل میں لانے کی جو بے شمار شکلیں مختلف زمانوں میں اختیار کی گئی ہیں یا تجویز کی گئی ہیں، ان کی تفصیلات سے قطع نظر کر کے اگر انہیں صرف اس لحاظ سے جانچا اور پرکھا جائے کہ جمہوریت کے اصول اور مقصد کو پورا کرنے میں وہ کہاں تک کامیاب ہوتی ہیں، تو کوتاہی کے بنیادی اسباب صرف تین ہی پائے جاتے ہیں۔

اوّل یہ کہ "جمہور" کو مختارِ مطلق اور حاکم مطلق (Sovereign) فرض کر لیا گیا اور اس بنا پر جمہوریت کو مطلق العنان بنانے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ جب

بجائے خود انسان ہی اس کائنات میں مختار مطلق نہیں ہے تو انسانوں پر مشتمل کوئی جمہور کیسے حاکمیت کا اہل ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر مطلق العنان جمہوریت قائم کرنے کی کوشش آخر کار جس چیز پر ختم ہوتی رہی ہے وہ جمہور پر چند آدمیوں کی عملی حاکمیت ہے۔ اسلام پہلے ہی قدم پر اس کا صحیح علاج کر دیتا ہے۔ وہ جمہوریت کو ایک ایسے بنیادی قانون کا پابند بناتا ہے جو کائنات کے اصل حاکم (Sovereign) نے مقرر کیا ہے۔ اس قانون کی پابندی جمہور اور اس کے سربراہ کاروں کو لازماً کرنی پڑتی ہے اور اس بنا پر وہ مطلق العنانی سرے سے پیدا ہی نہیں ہونے پاتی جو بالآخر جمہوریت کی ناکامی کا اصل سبب بنتی ہے۔

دوم یہ کہ کوئی جمہوریت اس وقت تک نہیں چل سکتی جب تک عوام میں اس کا بوجھ سہارنے کے لائق شعور اور مناسب اخلاق نہ ہوں۔ اسلام اسی لیے عام مسلمانوں کی فرداً فرداً تعلیم اور اخلاقی تربیت پر زور دیتا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ ایک ایک فرد مسلمان میں ایمان اور احساس ذمہ داری اور اسلام کے بنیادی احکام کا اور ان کی پابندی کا ارادہ پیدا ہو۔ یہ چیز جتنی کم ہوگی جمہوریت کی کامیابی کے امکانات کم ہوں گے۔ اور یہ جتنی زیادہ ہوگی امکانات اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔

سوم یہ کہ جمہوریت کے کامیابی کے ساتھ چلنے کا انحصار ایک بیدار مضبوط رائے عام پر ہے اور اس طرح کی رائے عام اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب معاشرہ اچھے افراد پر مشتمل ہو، ان افراد کو صالح بنیادوں پر ایک اجتماعی نظام میں منسلک کیا گیا ہو اور اس اجتماعی نظام میں اتنی طاقت موجود ہو کہ برائی اور برے اس

میں نہ پھل پھول سکیں اور نیکی اور نیک لوگ ہی اس میں ابھر سکیں۔ اسلام نے اس کے لیے بھی ہم کو تمام ضروری ہدایات دے دی ہیں۔

اگر مندرجہ بالا تینوں اسباب فراہم ہو جائیں تو جمہوریت پر عمل درآمد کی مشینری خواہ کسی طرح کی بنائی جائے، وہ کامیابی کے ساتھ چل سکتی ہے۔ اور اس مشینری میں کسی جگہ کوئی قباحت محسوس ہو تو اس کی اصلاح کر کے بہتر مشینری بھی بنائی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد اصلاح و ارتقاء کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ جمہوریت کو تجربے کا موقع ملے۔ تجربات سے بتدریج ایک ناقص مشینری بہتر اور کامل تر بنتی چلی جائے گی۔

(ترجمان القرآن جلد ۶۰، عدد ۳۔ جون ۱۹۶۳ء)

صدر ریاست کو ویٹو کا حق

سوال: کچھ عرصہ سے اخبارات کے ذریعہ سے تجاویز پیش کی جا رہی ہیں کہ صدر پاکستان کو خلیفۃ المسلمین یا امیر المومنین کے معزز خطاب سے آراستہ کیا جائے۔ اس تصور میں مزید جان ڈالنے کے لیے یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ صدر کو حق تنسیخ ملنا چاہیے کیونکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جلیل القدر صحابہ کے مقابلے میں ویٹو سے کام لیا اور منکرین زکوٰۃ و مدعیان نبوت کی سرکوبی کے لیے جہاد کا حکم دے کر صحابہؓ کی رائے کو رد کر دیا۔ گویا اس دلیل سے شرعی حیثیت کے ساتھ ویٹو جیسے

دھاندلی آمیز قانون کو مستحکم فرمایا جا رہا ہے۔

ان حالات کی روشنی میں جناب والا کی خدمت میں چند سوالات پیش کیے جا رہے ہیں امید ہے کہ بصراحت جوابات سے مطمئن فرمائیں گے۔

۱۔ کیا حضرت ابو بکرؓ نے آج کے معنوں میں ویٹو استعمال فرمایا تھا؛ اور

۲۔ اگر استعمال فرمایا تھا تو ان کے پاس کوئی شرعی دلیل تھی یا نہیں

جواب: خلفائے راشدین کی حکومت کے نظام اور آج کل کے صدارتی نظام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان دونوں کو ایک چیز صرف وہی لوگ قرار دے سکتے ہیں جو اسلام کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں۔ میں نے اس فرق پر مفصل بحث اپنی کتاب اسلامی ریاست میں صفحہ ۳۳۱-۳۲۲ پر کی ہے۔ اسے ملاحظہ فرمائیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جس چیز کو خلافت کے نظام میں "ویٹو" کے اختیارات سے تعبیر کیا جا رہا ہے وہ موجودہ زمانے کی دستوری اصطلاح سے بالکل مختلف چیز تھی۔ حضرت ابو بکرؓ کے صرف دو فیصلے ہیں جن کو اس معاملہ میں بنائے استدلال بنایا جاتا ہے۔ ایک جیشِ اسامہ کا معاملہ۔ دوسرے مرتدین کے خلاف جہاد کا مسئلہ۔ ان دونوں معاملات میں حضرت ابو بکرؓ نے محض اپنی ذاتی رائے پر فیصلہ نہیں کر دیا تھا۔ بلکہ اپنی رائے کے حق میں کتاب و سنت سے استدلال کیا تھا۔ جیشِ اسامہ کے معاملہ میں ان کا استدلال یہ تھا کہ جس کام کا فیصلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد میں کر چکے تھے اسے حضورؐ کا خلیفہ ہونے کی حیثیت

سے انجام دینا میرا فرض ہے۔ میں اسے بدل دینے کے اختیارات نہیں رکھتا مرتدین کے معاملہ میں ان کا استدلال یہ تھا کہ جو شخص یا گروہ بھی نماز اور زکواۃ میں فرق کرتا ہو اور یہ کہے کہ میں نماز تو پڑھوں گا مگر زکواۃ ادا نہیں کروں گا۔ وہ مرتد ہے، اسے مسلمان سمجھنا ہی غلط ہے، لہذا ان لوگوں کی دلیل قابل قبول نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ لاالہ الا اللہ کے قائلین پر تم کیسے تلوار اٹھاؤں گے۔ یہی دلائل تھے جن کی بنا پر صحابہ کرامؓ نے حضرت ابوبکرؓ صدیق کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا۔ یہ اگر "ویٹو" ہے تو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کا ویٹو ہے نہ کہ سربراہ ریاست کا۔

حقیقت میں اسے ویٹو کہنا ہی سرے سے غلط ہے کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کے استدلال کو تسلیم کر لینے کے بعد اختلاف کرنے والے صحابہ کرامؓ اس کی صحت کے قائل ہو گئے تھے اور اپنی سابقہ رائے سے انہوں نے رجوع کر لیا تھا۔

(ترجمان القرآن جلد ۶۱، عدد ۲ - نومبر ۱۹۶۳ء)

تحریکِ اسلامی سے متعلق

اقامتِ دین کے بارے میں چند ذہنی اشکالات

سوال : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کی ذمہ داریاں جن جلیل القدر صحابہ کے کاندھوں پر ڈالی گئیں ان کے بارے میں بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ نوعِ انسانیت کے گُل سرسبد تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خلافت راشدہ کا نظام جلد درہم برہم ہو گیا اور جنگ جمل اور جنگِ صفین جیسے حادثات رونما ہوتے جن کا اسلامی تحریک کے ارتقاء پر ناخوشگوار اثر پڑا۔ ان حالات سے پیدا شدہ چند سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جن کے جوابات مطلوب ہیں۔ سوالات حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے قریبی زمانے میں اور عہد نبوی میں تربیت یافتہ صحابہ کی موجودگی میں اگر مسلم سوسائٹی میں خلفشار پیدا ہو سکتا ہے تو آج ہم لوگ جو ان سلف صالحین کی بلندیوں کے تصور سے بھی عاجز ہیں، کس چیز پر فخر کر سکتے ہیں اور کیسے یہ دعوے کر سکتے ہیں کہ ہم ایک مکمل اسلامی ریاست قائم کر سکیں گے؟

۲۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسلام اس تیز رفتاری سے پھیل رہا تھا کہ اس مناسبت سے اس میں داخل اور شامل ہونے والوں کی تربیت کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا تو اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلفاء اسلام نے نظامِ اسلامی اور مسلم معاشرہ کو پورے طور پر استوار اور مستحکم (Consolidate)

کیسے بغیر اس کی توسیع (Expansion) کیوں ہونے دی؟

۳۔ اگر ہمارے پیشرو لغزشوں سے محفوظ نہیں رہ سکے تو ہمارا دامن کیسے پاک رہ سکتا ہے اور اقامتِ دین کے لیے ہم میں جرأت عمل کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟

جواب: آپ کے سوالات جتنے آسان اور مختصر معلوم ہوتے ہیں ان کا جواب اتنے اختصار اور آسانی سے دینا محال ہے۔ ان مسائل پر مفصل بحث سردست مشکل ہے صرف مجمل جوابی اشارات عرض ہیں۔ اللہ نے چاہا تو انہی سے آپ کی تشفی ہو جائے گی۔

۱۔ اپنی قومی تاریخ میں ہمیں محض دھبوں ہی کی تلاش نہیں کرنی چاہیئے اور صرف ان ہی کے تصور پر شرما کر نہیں رہ جانا چاہیئے۔ ہماری تاریخ بہت سے روشن نشانات کی بھی حامل ہے۔ ہمیں ان پر بھی فخر کرنا چاہیئے اور انہیں نگاہ میں رکھ کر امید اور اعتماد کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیئے۔ روشن نشانات کو دیکھنے سے گریز کرنا اور صرف دھبوں کا خیال کر کے دل مسوس کر بیٹھ جانا بہت بیجا قسم کی قنوطیت ہے۔

۲۔ توسیع اور استحکام کے درمیان توازن و تناسب ذہنی دنیا میں تو قائم کیا جا سکتا ہے مگر عملی دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے۔ ایک شخص اگر آپ کے پاس شرک یا کفر سے توبہ کرنے کے لیے آتے تو آخر کس عذر کی بنا پر آپ اُسے الٹا واپس کر دیں گے؟ کیا آپ اس سے یہ کہیں گے کہ اس وقت میں استحکام میں مصروف ہوں اور توسیع کا کام میں نے فی الحال بند کر رکھا ہے؟

۴۔ انسان جب تک انسان ہے اُس کی سعی بشریت کے تقاضوں اور محدودیتوں سے پاک نہیں ہو سکتی۔ ہر شخص کو اپنی حد تک اپنا فرض بہتر سے بہتر طریقہ سے انجام دینے کی کوشش کرنی چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ اللہ سے دعا کرتے رہنا چاہیئے کہ وہ ہمیں ارادی لغزشوں سے بچائے اور غیر ارادی لغزشوں کو معاف فرمائے۔

(ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۵۲ء)

ایک مصالحانہ تجویز

سوال :- پاکستان دستور سازی کے نازک مرحلہ سے گزر رہا ہے۔ پاکستان کا ایک خاص طبقہ دستورِ اسلامی سے گلو خلاصی حاصل کرنے کی فکر میں ہے۔ ایسے حالات میں جماعت اسلامی اور علمائے کرام کی باہمی چپقلش افسوسناک ہے۔ جماعت اسلامی جس کے بنیادی مقاصد میں دستورِ اسلامی کا عنوان اُبھرا ہوا رکھا گیا ہے، بھی اس اختلاف کے میدان میں ایک ایک فریق کی حیثیت اختیار کر کے خم ٹھونک کر ڈٹ گئی ہے۔ کیا اس معاملہ کو اس طرح نہیں سلجھایا جاسکتا کہ چند نامور علماء کو (اس مقام پر مکتوب نگار نے پانچ بزرگوں کے نام دیئے ہیں، ہم نے مصلحتاً ناموں کی اس فہرست کو حذف کر کے چند نامور علماء کے الفاظ لکھ دیئے ہیں) ثالث تسلیم کرتے ہوئے جماعت اسلامی فریقِ ثانی کو دعوت دے کہ وہ جماعت اسلامی

کی تمام قابلِ اعتراض عبارتوں کو ان حضرات کی خدمت میں پیش کر دے ان علمائے کرام کی غیر جانبداری، علم و تقویٰ اور پرہیزگاری شک و شبہ سے بالا ہے (کمال یہ ہے کہ ان پانچ غیر جانبدار حضرات میں سے ایک گزشتہ انتخاباتِ پنجاب میں جماعت اسلامی کی مخالفت میں سرگرم رہ چکے ہیں اور دو بزرگ ان دنوں "جہاد" میں مصروف ہیں) اگر کوئی عبارت قابلِ اعتراض نہ ہو تو مولانا مودودی کی عزت میں یقیناً اضافہ ہو گا۔ اور اگر علمائے کرام ان عبارتوں کو قابلِ اعتراض قرار دیں تو مولانا مودودی صاحب ان سے دست برداری کا اعلان فرما دیں۔ یہ تمام مراحل اس صورت میں طے ہو سکتے ہیں کہ اخلاص اور آخرت مطلوب ہو۔

نوٹ :۔ اس تجویز کی نقول اخبار تسنیم، نوائے وقت اور نوائے پاکستان کو ارسال کر دی گئی ہیں)

جواب :۔ آپ کا رجسٹری شدہ نامہ گرامی ملا جس میں آپ نے مجھے مخاطب کر کے ایک مصالحانہ تجویز پیش فرمائی ہے۔ پہلی بات تو میری سمجھ میں یہ نہیں آئی کہ آپ نے اس مصالحانہ تجویز کا مخاطب مجھے کیسے فرمایا۔ کیا آپ کو یہ نظر نہیں آتا کہ ابھی میں جیل ہی میں تھا کہ میرے خلاف بہتان و افترا کی ایک مہم شروع کر دی گئی اور اس کے بعد میرے باہر آتے ہی الزامات کا ایک طوفان کھڑا کر دیا گیا؟ پھر کیا آپ کو یہ خبر نہیں کہ جن حضرات نے مجھ پر یہ حملے کیے ان پر نہ پہلے میں نے کبھی کوئی حملہ کیا تھا اور نہ بعد ہی میں ان کی کسی زیادتی کا کوئی جواب دیا؟ اب آخر یہ کس جذبۂ انصاف نے آپ کو آمادہ کیا کہ مصالحت کی تجویز اُس شخص کے سامنے لے

جائیں جس نے کسی سے کوئی لڑائی نہ کی تھی۔

دوسری بات یہ بھی میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ نے کس بنا پر یہ فرمایا ہے کہ "جماعت اسلامی بھی اس اختلاف کے میدان میں ایک فریق کی حیثیت اختیار کر کے خم ٹھونک کر ڈٹ گئی ہے"۔ کیا یہ بات واقعی صداقت کے ساتھ کوئی شخص کہہ سکتا ہے؟ ایک طرف ان حملوں کو دیکھیے جو مجھ پر اور جماعت اسلامی پر کیے گئے۔ دوسری طرف یہ دیکھئے کہ میں خود اس معاملے میں برابر خاموش رہا ہوں۔ جماعت کا اخبار تسنیم بھی قریب قریب بالکل ہی خاموش رہا ہے۔ جماعت کے ارکان میں سے بعض لوگ جن کے اپنے اخبار اور رسالے ہیں، صبر نہ کر سکے اور انہوں نے کچھ چیزیں لکھیں۔ مگر اوّل تو ان کی لکھی ہوئی چیزوں کو ان تحریروں سے کوئی نسبت ہی نہیں جو میرے اور جماعت کے خلاف لکھی گئی تھیں، پھر ان میں سے بھی بعض میرے منع کرنے پر رک گئے اور بعض کو میں برابر روکنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اسے اگر آپ خم ٹھونک کر ڈٹ جانے سے تعبیر فرماتے ہیں تو میں اس کے سوا اور کیا کہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو انصاف کی توفیق دے۔

اب میں مختصراً آپ کی اس تجویز کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں جو آپ نے "مصالحانہ تجویز" کے نام سے پیش فرمائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ فلاں فلاں بزرگوں کو ثالث تسلیم کر کے جماعت اسلامی کی تمام قابلِ اعتراض عبارتوں کو ان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ صرف جماعتِ اسلامی ہی کی قابلِ اعتراض تحریریں کیوں۔ ان سب لوگوں کی تحریریں بھی کیوں نہیں جو کسی کے نزدیک قابلِ اعتراض ہوں؟ اصل بات یہ ہے کہ جو حضرات ہم پر معترض ہیں وہ بھی

زبانِ وحی سے کلام نہیں کرتے۔ ان کی تحریریں اور تقریریں بھی انسانی کلام ہی ہیں اور ان میں ہم کو بکثرت قابلِ اعتراض باتیں نظر آتی ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ ہم نے کبھی کسی کے ساتھ یہ بیہودگی نہیں کی کہ اس کی عبارتیں چن چن کر نکالیں اور اس کے خلاف مضمون بازی اور اشتہار بازی شروع کر دیں۔ بخلاف اس کے ہمارے ساتھ یہ بیہودگی برسوں سے کی جا رہی ہے اور آج بھی اس کا سلسلہ جاری ہے۔ اب کیا یہ ہم کو ہماری شرافت کا انعام دیا جا رہا ہے کہ سارے ملک میں سے صرف ہم ہی اس ثالثی کے حضور ملزم کی حیثیت سے پیش کیے جانے کے لیے منتخب فرمائے جاتے ہیں؟ اور کیا دوسرے لوگ صرف اس لیے بخش دیئے جاتے ہیں کہ ان کے خلاف ہم نے اس بیہودگی کا طوفان نہیں اٹھایا؟

ایک اور مغالطہ کا ازالہ اس موقع پر کر دینا بہت ضروری معلوم ہوتا ہے امر واقعہ یہ نہیں ہے کہ علمائے کرام بحیثیتِ مجموعی جماعت اسلامی کے خلاف محاذ آرا ہو گئے ہیں۔ بلکہ بیشتر سنجیدہ اور خداترس علماء اپنے اختلافات پر قائم رہتے ہوئے اقامت دین کے مشترکہ مقصد میں جماعت اسلامی کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں اور جماعت کے خلاف اٹھائے جانے والے طوفان کو دل سے ناپسند کرتے ہیں اور اسے روکنے کے لیے اپنی سی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ مخالفانہ طوفان اٹھانے والوں میں کچھ لوگ ضرور ایسے بھی ہیں جو علم رکھنے کے باوجود اپنے مقام کی حرمت کو محسوس نہیں کر رہے، لیکن یہ تمام تر "علمائے کرام" ہی نہیں ہیں، ان میں نہایت معمولی درجے کے سیاست باز حضرات بھی بکثرت شامل ہیں۔

آخری بات میں یہ عرض کیے دیتا ہوں کہ اس طرح کی تجویزوں سے آپ

مجھے معاف رکھیں۔ میرے نزدیک اس طرح کی بہتان تراشیوں کا علاج ثالثیاں نہیں ہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ آدمی ایسے لوگوں کو قطعاً نظرانداز کر کے اپنا کام کیے چلا جائے اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے تاکہ اگر یہ اپنی ساری عمر بھی اس بیہودہ مشغلے میں کھپا دینا چاہتے ہوں تو کھپاتے رہیں۔

(ترجمان القرآن محرم ۱۳۷۵ھ۔ ستمبر ۱۹۵۵ء)

بے بنیاد اندیشے

سوال: حال ہی میں (لاہور کا ایک اخبار) کے ذریعے علماء کے بعض حلقوں نے آپ کی تیرہ برس پہلے کی تحریروں کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے ان پر فتوے جڑ جڑ کر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن میں ان تحریروں سے گمراہ نہیں ہو سکا۔ لیکن آج ہی ایک شخص نے مجھے وہ مقالہ دکھایا جس میں آپ کی اور جمعیت العلماء پاکستان کے ایک اعلیٰ رکن کی گفتگو درج ہے۔ جس میں آپ کو کہا گیا ہے کہ آپ مہدی ہونے کا دعویٰ تو نہیں کریں گے، لیکن اندیشہ ہے کہ آپ کے معتقدین آپ کو مہدی سمجھنے لگ جائیں گے۔ چنانچہ مطالبہ کیا گیا کہ آپ اعلان فرمادیں کہ میرے بعد مجھے مہدی کوئی نہ کہے۔ لیکن آپ نے اس پر خاموشی اختیار کر لی جس پر لوگوں کو اور بھی شک گزر رہا ہے۔"

جواب: آپ برا نہ مانیں تو میں کہوں کہ مجھے آپ کی سادہ لوحی پر سخت تعجب ہے

آپ کے خط کو پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ افترا پردازی کی مہم چلانے والے لوگ آپ ہی جیسے اصحاب کو نگاہ میں رکھ کر اپنا کاروبار چلایا کرتے ہیں، کیونکہ وہ امید رکھتے ہیں کہ دس بیس فریبوں میں سے کوئی ایک فریب تو ان پر چل ہی جائے گا۔ اب آپ خود دیکھئے کہ آپ نے جو معاملہ میرے سامنے پیش کیا ہے اس میں آپ نے کس طرح فریب کھالیا۔

ایک شخص مجھ سے کہتا ہے کہ تو خود تو مہدی ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا اور یہ بھی کہتا ہے کہ میں انشاء اللہ اپنے رب کے پاس ہر طرح کے دعوؤں سے پاک دامن لے کر حاضر ہو جاؤں گا، پھر دیکھوں گا کہ جو لوگ مجھ پر یہ الزامات لگا رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا جواب دہی کرتے ہیں۔ لیکن اس بات کا تو اندیشہ ہے کہ تیرے مرنے کے بعد کچھ لوگ تجھے مہدی قرار دے دیں، لہٰذا تو یہ بھی اعلان کر دے کہ میرے بعد کوئی مجھے مہدی نہ کہے۔

ایک دیانت دار آدمی کو مطمئن کرنے کے لیے میرا یہ جواب کافی تھا۔ کیونکہ اس میں میں نے ایسے لوگوں کو جو میرے بعد میری طرف کوئی غلط بات منسوب کریں ان لوگوں سے تشبیہہ دی ہے جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیچھے ان کو خدا کا بیٹا قرار دیا۔ اس سے زیادہ سخت بات میں اور کیا کہہ سکتا تھا۔ مگر معترض نے اس بات کو نقل کر کے آپ جیسے لوگوں کو یہ فریب دیا کہ دیکھو اس شخص کے دل میں چور ہے، جبھی تو اُس بات کا اعلان کرنے سے گریز کرتا ہے جس کا ہم مطالبہ کر رہے ہیں۔ اور داد کے قابل ہے آپ کی سادہ لوحی کہ آپ یہ فریب قبول کر کے آج میرے سامنے وہی مطالبہ دہرانے کے لیے

تشریف لے آتے ہیں۔ جب تک آپ جیسے لوگ دنیا میں موجود ہیں، فریب کار لوگوں کا کاروبار بند ہونے کی توقع نہیں ہے۔

آخر میں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے نہ کسی دینی منصب کا دعویٰ کیا ہے، نہ اپنی ذات کی طرف دعوت دی ہے، اس لیے سرے سے میرے کوئی "معتقدین" ہیں ہی نہیں۔ میں اور میرے ساتھی سب اللہ اور اس کے رسول کے معتقدین ہیں اور ہمارا تعلق صرف راہ خدا میں ہمسفری کا ہے۔

(ترجمان القرآن محرم ۱۳۷۵ھ۔ ستمبر ۱۹۵۵ء)

اللہ کے حقوق اور والدین کے حقوق

سوال :۔ میں ایک سخت کشمکش میں مبتلا ہوں اور آپ کی رہنمائی کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ میں جماعت کا ہمہ وقتی کارکن ہوں اور اس وجہ سے گھر سے دُور رہنے پر مجبور ہوں۔ والدین کا شدید اصرار ہے کہ میں اُن کے پاس رہ کر تجارتی کاروبار شروع کروں۔ وہ مجھے بار بار خطوط لکھتے رہتے ہیں کہ تم والدین کے حقوق کو نظر انداز کر رہے ہو۔ میں اس بارے میں ہمیشہ مشوش رہتا ہوں۔ ایک طرف مجھے والدین کے حقوق کا بہت احساس ہے، دوسری طرف میں محسوس کرتا ہوں کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے میرا جماعت کا کارکن بن کر رہنا ضروری ہے۔ آپ اس معاملے میں مجھے صحیح مشورہ دیں تاکہ میں افراط و تفریط سے بچ سکوں۔ مجھے

یہ بھی معلوم ہے کہ خیالات کے اختلاف کی وجہ سے گھر میں میری زندگی سخت تکلیف کی ہو گی۔ لیکن شرعاً اگر ان کا مطالبہ واجب التعمیل ہے تو پھر بہتر ہے کہ میں اس تکلیف کو خوشی سے برداشت کروں۔ میرے والد صاحب میری ہر بات کو موردِ اعتراض بنا لیتے ہیں اور میری طرف سے اگر بہت ہی نرمی کے ساتھ جواب عرض کیا جاتے تو اسے بھی سننا گوارا نہیں فرماتے۔

جواب: والدین کی اطاعت اور دین کی خدمت کے درمیان توازن کا مسئلہ بالعموم اُن سب نوجوانوں کے لیے وجہ پریشانی بنا رہتا ہے جن کے والدین جماعت اسلامی اور اُس کے مقصد سے ہمدردی نہیں رکھتے۔ میں نے عموماً یہ دیکھا ہے کہ ایک بیٹا اگر سرکاری ملازمت میں ہو یا کسی اچھے کاروبار میں لگا ہوا ہو تو والدین اس کے ہزاروں میل دور رہنے کو بھی برداشت کر لیتے ہیں اور اس سے کبھی نہیں کہتے کہ تو ملازمت یا روزگار چھوڑ دے اور آکر ہماری خدمت کر۔ بیٹے کے اطوار اگر فاسقانہ بھی ہوں تو اعتراض کی زبان کھولنے کی ضرورت انہیں بالعموم محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اپنے سارے حقوق انہیں صرف اسی وقت یاد آجاتے ہیں جب کوئی بیٹا اپنے آپ کو دین کی خدمت کے لیے وقف کر دیتا ہے حتیٰ کہ اگر جماعت اسے معقول معاوضہ دے تب بھی وہ یہی ضد کرتے ہیں کہ بیٹا گھر میں بیٹھ کر اُن کے "حقوق" ادا کرے۔ بلکہ حقوق ادا کرنے پر بھی ان کا دل ٹھنڈا نہیں ہوتا، اس کی ہر بات انہیں کھٹکتی ہے اور اس کی کسی خدمت سے بھی وہ خوش نہیں ہوتے۔ یہ صورتِ حال میں ایک مدت سے دیکھ رہا ہوں اور

جماعت کے بکثرت نوجوانوں کو اس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا ہے اور کرنا پڑ رہا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کے ہاں فی الواقع کیا صورت حال ہے۔ اگر وہی کچھ ہے جو آپ کے بیان سے سمجھ میں آ رہی ہے تو یہ آپ کے والدین کی زیادتی ہے آپ جہاں کام کر رہے ہیں وہیں کرتے رہیں۔ جو کچھ مالی خدمت آپ کے بس میں ہو وہ بھی کرتے رہیں بلکہ اپنے اوپر تکلیف اٹھا کر اپنی مقدرت سے کچھ زیادہ ہی بھیجتے رہیں۔ اور حسبِ ضرورت وقتاً فوقتاً ان کے پاس ہو آیا کریں۔ لیکن اگر صورتِ حال اس سے مختلف ہو اور فی الواقع آپ کے والدین اس بات کے محتاج ہوں کہ آپ کے لیے ان کے پاس رہ کر ہی خدمت کرنا ضروری ہو تو پھر مناسب یہی ہے کہ آپ ان کی بات مان لیں۔

(ترجمان القرآن، جمادی الاول ۱۳۷۵ھ - جنوری ۱۹۵۶ء)

طریقِ انتخاب

سوال: مجھے آپ کی خدمت میں ایک وضاحت پیش کرنا ہے۔ میں نے کچھ عرصہ قبل اپنی ذاتی حیثیت میں تجربۃً دس سالوں کے لیے مخلوط انتخاب کی حمایت کی تھی۔ اپنے حق میں دلائل دینے کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی کہا تھا کہ مخلوط انتخاب کی مخالفت میں سب سے اونچی آواز جماعت اسلامی کی طرف سے اٹھائی جا رہی ہے۔ پھر میں نے کم و بیش

مندرجہ ذیل الفاظ کہے تھے۔ "جماعت اسلامی میں ایسے لوگ ہیں جن کے لیے میرے قلب وجگر میں انتہائی احترام وعقیدت کا سرمایہ ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جماعت نے پاکستان کے لیے جدوجہد نہیں کی تھی اور اگر ہندوستان تقسیم نہ ہوتا تو کیا اس صورت میں متحدہ ہندوستان میں جماعت اسلامی جداگانہ انتخابات کے حق میں آواز بلند کرتی؟" اس کے بعد جماعت کے بعض دوستوں نے مجھ سے گلہ کیا میں نے ان سے عرض کیا کہ میں ایک دلیل تعمیر کر رہا تھا جس سے مقصود جماعت اسلامی پر حملہ کرنا نہیں تھا، بلکہ اپنے نقطۂ نگاہ کے جواز میں وزن پیدا کرنا تھا۔ میں نے آپ کی خدمت میں بھی اس صراحت کو پیش کرنا ضروری سمجھا تاکہ غلط فہمی رفع ہو جائے۔"

جواب: میں نے اخبارات میں آپ کی تقریر کی رپورٹ تو پڑھی تھی لیکن میرے دل میں کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ آپ جانتے ہیں کہ اس سے بہت زیادہ سخت دوسرے کہتے اور لکھتے رہے ہیں اور مجھے کبھی کسی سے کوئی شکایت پیدا نہ ہوئی۔ اس لیے آپ کی وضاحت میرے لیے تو غیر ضروری ہی تھی۔ تاہم میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے بطور خود اس کی ضرورت محسوس کی۔

البتہ مخلوط انتخاب کے حق میں استدلال کرتے ہوئے جو بات آپ نے جماعت اسلامی کے بارے میں کہی ہے وہ بجائے خود صحیح نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پہلے بھی جماعت کی پوزیشن سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی اور اب بھی آپ اسے صحیح طور پر نہیں سمجھتے ہیں۔ پاکستان کے قیام کی جدوجہد میں جماعت

کی عدم شرکت سے یہ نتیجہ نکالنا کہ جماعت تقسیم کی مخالف تھی یا متحدہ ہندوستان کی حامی تھی، ایک بہت ہی غلط استنتاج ہے۔ اگر آپ میری اُس زمانے کی تحریریں تفصیل کے ساتھ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہو کہ میں اس راہنمائی اور اس طریقِ کار سے غیر مطمئن تھا جو مسلمانوں کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک طرف مسلم نیشنلسٹ گروہ اور دوسری طرف نیشلسٹ مسلم گروہ پیش کر رہا تھا۔ دونوں کے متعلق میرے اس وقت کے جو اندازے تھے بعد میں وہ لفظ بلفظ پورے ہوتے اور ہو رہے ہیں۔ اسی عدم اطمینان کی وجہ سے میں ان دونوں سے الگ رہا اور جو کچھ میرے نزدیک درست تھا اس کے لیے کام کرتا رہا۔ تقسیم ملک کی مخالفت اگر میں نے کسی روز کی ہو تو آپ اس کا حوالہ دیں۔ یا متحدہ قومیت یا متحدہ ہندوستان کی تائید میں کبھی میں نے کوئی بات کہی ہو تو اس کی نشاندہی بھی آپ فرما دیں۔ ایسی کسی چیز کی غیر موجودگی میں مجھ سے یا جماعت اسلامی سے یہ سوال کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ اگر ہندوستان متحد رہتا تو کیا تم جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کرتے۔

اس کے علاوہ اس معاملے میں ایک پہلو اور بھی ہے جسے آپ نظر انداز کر رہے ہیں اور وہ یہ ہے کہ غیر اسلامی نظامِ حکومت کے ساتھ کسی قسم کے تعاون یا اس میں کسی طرح کی حصہ داری کو جماعت اسلامی اصولاً غلط کہتی ہے۔ اسی وجہ سے تقسیم سے قبل کے انتخاب میں ہم نے سرے سے دلچسپی ہی نہیں لی۔ اگر خدانخواستہ ہندوستان متحد رہتا اور اس میں سیکولر نظام قائم ہوتا تو اس کے لادینی نظامِ حکومت کے انتخابات میں حصہ لینے کے سرے سے ہم قائل ہی نہ ہوتے، پھر جداگانہ یا مخلوط انتخاب کا سوال اس نظام میں ہمارے لیے کیسے پیدا ہوتا؟ جماعت

اسلامی اس طرح کے لادینی نظام میں کام کرنے کا جو نقشہ اپنے سامنے رکھتی تھی اُسے جماعت کے لٹریچر میں وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا گیا تھا۔ آپ ہمارے اس طریق کار کو غلط سمجھنے اور کہنے کا حق رکھتے ہیں، مگر ہمارے حقیقی منشا کیخلاف ہماری باتوں کو یہ معنی پہنانا کہ ہم متحدہ ہندوستان کے طالب اور تقسیم ملک کے مخالف تھے، ایک ایسی زیادتی ہے جس کی ہم کم از کم آپ جیسے معقول آدمیوں سے توقع نہیں رکھتے۔

(ترجمان القرآن ربیع الاول ۱۳۷۶ھ۔ نومبر ۱۹۵۶ء)

جماعت کا موقف اور طریق کار

سوال:۔ اگرچہ میں جماعت کا رکن نہیں ہوں، تاہم اس ملک میں مغربیت کے الحادی مضرات کا جماعت جس قدر مقابلہ کر رہی ہے اس نے مجھے بہت کچھ جماعت سے وابستہ کر رکھا ہے اور اسی وابستگی کے جذبہ کے تحت اپنی ناقص آرا پیش کر رہا ہوں۔

پاکستان میں دستور و انتخاب کا مسئلہ از سر نو قابل غور ہے اور نہایت احتیاط و تدبر سے کسی نتیجہ و فیصلہ پر پہنچنے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ موجودہ دستور اپنی پوری ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے قطعی طور پر اسلام کی حقیقی بالادستی کو تسلیم نہیں کرتا۔ کتاب و سنت سے ثابت شدہ متفق علیہ احکام کا اجراء و نفاذ بھی موجودہ دستور کی رو سے

لیجسلیچر اور صدر مملکت کی منظوری کا محتاج ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ ایسی صورت میں قوانین الٰہیہ بھی انسانی آرا کی منظوری کے محتاج بن جاتے ہیں، سخت اندیشہ ہے کہ تعبیرات کی تبدیلی سے بہت سے وہ کام جو اسلام کی نظر میں اب تک ناجائز نہیں رہے ہیں، اس ملک کی تعزیرات میں جرائم کی فہرست میں شامل ہو جائیں اور بہت سے وہ کام جنہیں اسلام قطعاً پسند نہیں کرتا مباحات کی فہرست میں داخل کر دیے جائیں۔ موجودہ دستور نے قرآن و سنت کو ایک طرف اسمبلی کی کثرت آراء کی منظوری و تعبیر فرمائی کا تابع بنا دیا ہے، دوسری طرف صدر مملکت کی رضامندی اور دستخطوں کا پابند بنا دیا ہے اور تیسری طرف عدالتوں کی تشریح و توضیح کا محتاج بنا دیا ہے۔ حالانکہ پورے دستور میں صدر مملکت، ارکان وزارت، ارکان اسمبلی اور ارکان عدالت کی اسلامی اہلیت کے لیے ایک دفعہ بھی بطور شرط لازم نہیں رکھی گئی ہے اور ان کے لیے اسلامی علم و تقویٰ کے معیار کو سرے سے ضروری سمجھا ہی نہیں گیا ہے، ایسی صورت میں اس دستور کو اسلامی دستور کہنا اور سمجھنا ہی قابل اعتراض ہے کجا کہ اسے قبول کرنا اور قابل عمل بنانا۔

مخلوط انتخاب سے پاکستان کی وہ حیثیت تو بلاشبہ کمزور ہو جاتی ہے جسے اسلام کے نام سے نمایاں کیا گیا ہے، لیکن جداگانہ انتخاب سے سوائے مسلم قوم پرستی کے اور کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ اسلام کے حق میں تو ایسا جداگانہ انتخاب قطعی بے معنی بلکہ نقصان رساں ہے

جس کے بعد بھی اسمبلی میں مسلم وغیر مسلم دونوں کو مساوی حق راستے دہی حاصل ہو، اسمبلی کا صدر و نائب صدر مسلم وغیر مسلم دونوں بن سکتے ہیں نمائندہ وزارت میں دونوں لیے جا سکتے ہوں اور احکام اسلامی کی توضیح و تنقید، اتفاق و اختلاف آرا۔ اور ووٹنگ میں کلمہ گو اور غیر کلمہ گو دونوں یکساں طور پر حصہ لے سکتے ہوں۔ ایسی صورت میں اسلام کا کوئی حقیقی فائدہ پہنچنے کی بجائے اسلام کی عمومیت و عالمگیریت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اسلام کا دوسروں کے مقابلہ میں فریق جنگ بن جانے کا خطرہ ہے۔ غیر مسلم قومیں خواہ مخواہ اسے اپنا سیاسی و معاشی حریف سمجھنے لگیں گی۔ غیر مسلموں کے دل اسلام کی طرف سے اور مقفل ہو جائیں گے۔ ملک میں دوسری قوموں سے کشمکش زیادہ سے زیادہ بڑھ ہی جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ آئندہ چل کر پاکستان میں اسلام بھی بنی اسرائیل کیطرح مسلمانوں کا قومی مذہب بن کر رہ جائے۔ اگر مسلمانوں کی پوزیشن اس ملک میں وہی رہے جو آج ہے، تو کوئی حقیقی اسلامی فائدہ حاصل ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔

ان معروضات میں اگر کوئی وزن اور حقیقت محسوس فرمائی جائے تو میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ ضرور اس پر غور فرمائیں اور ان نازک مواقع پر ملت اسلامیہ کی صحیح صحیح رہبری فرمانے سے دریغ نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اسے صحیح طور پر انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے اور مسلمانوں کے دل آپ کی حمایت و اعانت کے

لیے کھول دے۔"

جواب: آپ کے قیمتی خیالات قابلِ غور اور مفید مشورے لائق شکریہ ہیں۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جماعت سے دلچسپی رکھنے والے طبقے میں ایسے صاحبِ فکر لوگ موجود ہیں جو خود اپنی جگہ بھی معاملات پر غور کرتے ہیں اور اپنے مشوروں سے ہماری مدد کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔

آپ نے جن مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے ان کے متعلق ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہم اپنی تحریک خلا میں نہیں چلا رہے ہیں بلکہ واقعات کی دنیا میں چلا رہے ہیں۔ اگر ہمارا مقصد محض اعلان و اظہارِ حق ہوتا تو ہم ضرور صرف بے لاگ حق بات کہنے پر اکتفا کرتے۔ لیکن ہمیں چونکہ حق کو قائم بھی کرنے کی کوشش کرنی ہے اور اس کی اقامت کے لیے اسی واقعات کی دنیا میں سے راستہ نکالنا ہے، اس لیے ہمیں نظریات اور حکمتِ عملی کے درمیان توازن برقرار رکھتے ہوئے چلنا پڑتا ہے۔ آئیڈیلزم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے آخری مقصود کو نہ صرف خود پیش نظر رکھیں بلکہ دنیا کو بھی اس کی طرف بلاتے اور رغبت دلاتے رہیں۔ اور حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے مقصود کی طرف بتدریج بڑھیں اور واقعات کی دنیا میں ہم کو جن حالات سے سابقہ ہے ان کو اپنے مقصد کی طرف موڑنے، اس کے لیے مفید بنانے اور مزاحمتوں کو ہٹانے کی کوشش کرتے رہیں۔ اس غرض کے لیے ہمیں اپنے آخری مقصد کے راستے میں کچھ درمیانی مقاصد اور قریب الحصول مقاصد بھی سامنے رکھنے ہوتے ہیں، تاکہ ان میں سے ایک ایک

کو حاصل کرتے ہوتے ہم آگے بڑھتے جائیں۔

مثال کے طور پر بین الاقوامی دنیا میں ہمارا آخری مقصود ایک عالمگیر مثالی اسلامی ریاست ہے۔ اس کے راستے میں ایک طرف مغربی استعمار، اور روسی اشتراکیت بڑی عظیم رکاوٹیں ہیں۔ دوسری طرف مسلمان قوموں کی موجودہ حالت بڑی رکاوٹ ہے۔ ان رکاوٹوں کو دُور کرنا ہمارے درمیانی مقاصد میں شامل ہے۔ مسلمان ریاستوں کی باہمی پھوٹ، ان کا مختلف بلاکوں میں بٹ جانا، ان کے اندر وطنی نیشنلزم کا پیدا ہونا اور ان میں لادینی نظریات پر حکومتیں قائم ہونا، یہ سب ہمارے راستے میں حائل ہیں اور ان سب سے ہمیں عہدہ برآ ہونا ہے۔ اس غرض کے لیے اگر ہم کبھی کسی قریبی مقصود کے لیے کوئی بات کہیں یا کریں تو آپ کو یہ شبہ نہ ہونا چاہیئے کہ ہم نے اپنے آخری مقصود کو چھوڑ دیا ہے یا اس کے خلاف کوئی بات کی ہے۔

اسی طرح دستور اسلامی کے بارے میں جو باتیں آپ نے لکھی ہیں ان میں سے کوئی بھی ہم سے پوشیدہ نہیں ہے نہ کبھی پوشیدہ تھی۔ لیکن یہاں ایک کھلی کھلی لادینی ریاست کا قائم ہو جانا ہمارے مقصد کے لیے اس سے بہت زیادہ نقصان دہ ہوتا جتنا اب اس نیم دینی نظام کا نقصان آپ کو نظر آرہا ہے۔ بلاشبہ ہم نے پوری چیز حاصل نہیں کی ہے مگر کشمکش کے پہلے مرحلے میں ہم نے اتنا فائدہ ضرور حاصل کیا ہے کہ ریاست کو ایک قطعی لادینی ریاست بننے سے روک دیا، اور اسلام کی چند ایسی بنیادی باتیں منوالیں جن پر آگے کام کیا جا سکتا ہے۔ ہم اس غلط فہمی میں نہیں ہیں کہ ہمارا مقصود حاصل ہو گیا ہے۔ ہم اس مقام پر ٹھہر

جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ بلکہ جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے اسے مزید مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں اور اب ہم پیش قدمی کے لیے اس سے بہتر پوزیشن میں ہیں جو اس قریبی مقصد کے حاصل نہ ہونے کی صورت میں ہماری ہوتی۔

طریق انتخاب کے بارے میں بھی آپ نے ہمارے نقطۂ نظر کو اچھی طرح نہیں سمجھا ہے۔ میں نے اپنے پمفلٹ "مخلوط انتخاب کیوں اور کیوں نہیں" کے آخری حصہ میں جو کچھ عرض کیا ہے اسے پھر بغور ملاحظہ فرمائیں اور خود بھی غور کریں کہ اگر مخلوط انتخاب اپنے وطنی قومیت کے نظریے اور لادینی پس منظر کے ساتھ رائج ہو تو وہ ہمارے آخری مقصود کی راہ میں زیادہ رکاوٹ ہوگا یا جداگانہ انتخاب اُن قباحتوں کے ساتھ جن کی آپ نشان دہی کر رہے ہیں، زیادہ رکاوٹ ثابت ہوگا، نیز یہ کہ جداگانہ انتخاب سے پیدا ہونے والی قباحتوں کو رفع کرنا زیادہ آسان ہے یا مخلوط انتخاب کی قباحتوں کو؟ ان امور پر غور کر کے آپ خود ایک رائے قائم کریں اور اس بات کو نہ بھولیں کہ ہمارا آخری مقصود کبھی ہماری نگاہ سے اوجھل نہیں ہوا ہے۔ ہمیں بڑھنا اسی کی طرف ہے، مگر درمیانی مقاصد کو حاصل کرتے ہوئے اور راہ کی رکاوٹوں کو ہٹاتے ہوتے ہی ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ دفعۃً چھلانگ لگا کر پہنچ جانا ممکن نہیں ہے۔

سوال ۲: اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے میری معروضات پر توجہ فرمائی اور انہیں قابل التفات سمجھا۔ آپ کے حوصلہ افزا جواب کے بعد اس سلسلہ میں چند اور گذارشات آپ تک پہنچا دینا ضروری سمجھتا

ہوں، اسے خدانخواستہ تحریری مباحثہ نہ تصور فرمالیا جاتے، بلکہ یہ ایک ایسے شخص کے افکار پریشاں ہیں، جو سالہا سال سے مسلمانوں کی سیاست اور عالمی پیچیدگیوں کا طالب علمانہ مطالعہ کرتا چلا آ رہا ہے، اور اس بات کو اپنا ایمان و یقین تصوّر کرتا ہے کہ اسلام ہی انسانیت کا دنیا و آخرت میں واحد ذریعہ نجات ہے۔

اگر انتخابات سے ہمارا آخری مقصود یہ ہی ہے کہ موجودہ نیم دینی دستور کو کامل اسلامی دستور میں تبدیل کرانے کی کوشش کی جائے اور دستور کے اسلامی تقاضوں کو بغیر کسی تحریف کے صحیح طور پر پورا کیا جا سکے، تو اس کے لیے پہلا اور زیادہ بہتر طریقہ یہی تھا کہ کتاب و سنت کا علم رکھنے والے، اہلِ تقویٰ اور اہلِ بصیرت، مسلمانوں پر مشتمل، لیجسلیچر کا قیام عمل میں لایا جاتے اور براہ راست اس کے لیے جدوجہد کی جاتی رہے۔ بالخصوص ایسے وقت میں اس براہ راست کوشش کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے، جب کہ ملک بھر میں مختلف و متضاد طبقے، دستور کے نام پر اسلام کی عجیب و جدید تعبیر کرنے میں لگے ہوتے ہیں۔ لیکن جماعت کے اہل الرائے حضرات کی اکثریت اگر اسے مناسب نہیں سمجھتی ہے، تو پھر جداگانہ اور مخلوط طریق انتخاب کے درمیان پوری توجہ کے ساتھ تمیز کی جانی چاہیے کہ کونسا طریقہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے زیادہ آسان اور اقرب الی الصواب ہے جداگانہ انتخاب کے ساتھ مسلمانوں کی وابستگی، نفسیاتی وابستگی

ہے، جو گذشتہ پچاس ساٹھ سال سے برابر چلی آرہی ہے۔ جداگانہ انتخاب، الیکشن میں بطور نمائندگی کے، ہندوؤں کی عددی اکثریت کے مقابلہ پر وجود میں آیا تھا، اور بد قسمتی سے یہ مسلمانان ہند کی سیاست کا واحد شاہکار بن کر رہ گیا۔ اب اگر اس ذریعہ کو اسلامی دستور کے مقاصد کے حصول کے لیے پاکستان میں استعمال کیا گیا تو بوجوہ ذیل ان مقاصد کا حاصل کرنا نہایت مشکل ہو جائے گا۔

اوّلاً اس صورت میں اسلامی پروگرام رکھنے والے فریق کی بہ نسبت اسلامی نام اور غیر مسلموں کی مخالفت کے نعروں اور سنسنیوں سے ووٹروں کو اپیل کرنے والا فریق ہمیشہ پیش پیش رہے گا جیسا کہ گزشتہ پچاس سال سے وہ پیش پیش رہتا چلا آرہا ہے۔ اس فریق نے پہلے بھی اسلام کا مقدس نام اپنی خواہشات کے لیے استعمال کیا اور اسلام کی غلط نمائندگی کی۔ آج بھی اس کی ذہنیت اور عملی زندگی بدستور سابق ہے، اور پہلے کی بہ نسبت کامیابی کے ذرائع آج اس کے پاس بہت زیادہ ہیں۔

ثانیاً، مسلمان کثرت تعداد کے باوجود خود غرض سیاست دانوں کی دانش فریبیوں کے ہاتھوں غیر مسلموں کے مقابلہ میں خوف و احساس کمتری کی ہسٹریائی کیفیت میں بآسانی مبتلا رکھے جائیں گے

ثالثاً مسلمان رائے دہندوں کے سامنے اپنے حلقوں سے تعلق رکھنے والے مسلمان امیدواروں کو کامیاب بنا دینا ہی اسلام

کا سب سے بڑا مسئلہ بن کر رہ جایا کرے گا۔

رابعاً مسلم حلقوں میں ایک سے زیادہ مسلمان امیدواروں کے درمیان اسلام کے نام پر جو کشمکش برپا کی جاتی رہے گی، وہ بجائے خود اسلام اور مسلمانوں کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔

خامساً، غیر مسلم حلقے زیادہ سے زیادہ متحد ہوتے رہیں گے اور آگے چل کر وہ ایک ایسا متحدہ بلاک بن سکتے ہیں جو غیر ملکی طاقتوں کا آلہ کار ہو سکتا ہے اور جن کی ہمدردی میں غیر ملکی طاقتیں معاملات میں ایسی مداخلتیں کر سکتی ہیں جن سے ملک میں اعصابی جنگ اور کشمکش جاری رہے۔

سادساً آئندہ خطرہ ہے کہ ملک کی اس فرقہ وارانہ سیاست میں اسلام کی حیثیت ثانوی نہ رہ جائے، اسلام کی عمومی دعوت کے امکانات کم سے کم نہ ہوتے جائیں اور ملک کے اندر یا باہر غیر مسلم حلقے، اسلام کے مستقل حریف نہ بنتے جائیں۔

سابعاً، غیر اسلامی ملکوں میں اسلام کے قیام کے لیے کام کرنے والوں کے واسطے یہ ایک ایسی مثال ہو گی جس سے ان کی مشکلات میں بے اندازہ اضافہ ہو جائے گا، اور وہ غیر مسلم اقوام و عوام کو انسانیت کی سطح پر اپیل کرنے کی پوزیشن میں ہرگز نہیں رہیں گے۔

اور آخر میں یہ کہ ہمارے اس ملک میں اہل ثروت و اہل ریاست کو جو اثر حاصل ہے اور جس طرح وہ فسق و فجور کی امامت میں پیش پیش

ہیں، جداگانہ انتخاب کے بعد ان کے ہاتھ اور مضبوط ہو جائیں گے۔ ان کے حلقے الیکشن کے لیے جس طرح آج ان کی بلا شرکت غیرے میراث بنے ہوتے ہیں، جداگانہ انتخاب سے وہ مستحکم تر ہوتے چلے جائیں گے۔ اب یا تو ان کی ثروت و ریاست ختم ہو، یا ان کے مزاج اسلامی بنیں اور یہ دونوں چیزیں اللہ کی خاص مہربانی سے ہی ممکن ہیں، بندوں کے اختیار و تدبیر سے مشکل ہیں۔

اس کے برخلاف، مخلوط انتخاب کی صورت میں، جسے بجائے مخلوط کے عمومی انتخابات کہنا زیادہ موزوں ہوگا، پارٹی پروگرام پر کامیابی کی بنیاد رہ جائے گی، اگرچہ اس وقت اسلام کے لیے جد و جہد کرنے والی جماعت کو پوری پوری تندہی اور جانفشانی سے کام لینا ہوگا لیکن وہ اسلام کو پارٹی پروگرام بنا کر، اوّل تو ملک کے تمام باشندوں کو اپیل کرنے کی پوزیشن میں آجائے گی، دوسرے یہ کہ وہ اس پروگرام کو نظری طور پر بین الاقوامی تحریک کی پوزیشن میں لا سکے گی، اور اسلام کے لیے، اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں کام کرنے والوں کے درمیان نقطہ اتحاد کا کام دے سکے گی۔ تیسرے یہ کہ مقابلہ اشخاص سے اشخاص کا نہیں رہے گا بلکہ جماعتوں کے اصول اور پروگرام کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوگا۔ ہم اسلام کے اصول اور پروگرام کو لے کر پوری قوم اور پورے ملک کے پاس جائیں گے۔ اس طرح اصول اور پروگرام پر دوسرے خود غرض اور مفاد پرست گروہوں سے کھلا ہوا آزادانہ اور مساویانہ مقابلہ ممکن ہو

سکے گا۔ اور چوتھے یہ کہ جب بھی اسلامی جماعت کامیاب ہوگی، دوسرے عناصر کے تعاون کی محتاج ہوئے بغیر نہایت آسانی سے ملک کی پوری ہیئت ترکیبی کو اسلامی قالب میں تبدیل کر سکے گی، اور ایک مثالی اسلامی ریاست کا نمونہ پیش کرنے کے قابل بن سکے گی۔ آپ کے پمفلٹ "مخلوط انتخاب کیوں اور کیوں نہیں" میں اس حیثیت سے مسئلہ انتخاب کا تجزیہ نہیں کیا گیا ہے۔ میں گذارش کروں گا آپ ان پہلوؤں پر بھی غور فرمائیں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ مخلوط انتخاب کے موجودہ حامیوں کے ساتھ میں ہرگز متفق نہیں ہوں، اس لیے کہ ان کا مقصد اس سے ایک ایسی پاکستانی نیشن بنانا ہے جس میں نہ کوئی مسلمان مسلمان رہے اور نہ کوئی ہندو ہندو، جب کہ میرا مقصد اس سے پاکستان میں ایک ایسی نیشن بنانا ہے جو خالص مسلمان ہی مسلمان ہو۔ اگر سوء تدبیر سے مخلوط انتخاب کو اوّل مقصد کے لیے ذریعہ بنایا گیا تو یقیناً میرا تعاون جداگانہ انتخاب کے ساتھ ہوگا۔ تاہم میری ہنوز دیانت دارانہ اور مخلصانہ رائے یہی ہے کہ اسلام کو، پارٹی پروگرام بنا کر، مخلوط انتخابات کو ذریعہ نمائندگی بنایا جائے بشرطیکہ خالص اسلامی لیجسلیچر کا قیام فی الوقت ممکن نہ ہو۔ اس طرح اسلامی مقاصد بہتر طریقہ پر اور آسانی سے حاصل کیے جا سکیں گے، اور جداگانہ انتخاب کے مقابلہ میں کم رکاوٹیں پیش آئیں گی۔

آپ نے اپنے مکتوب کے دوسرے پیراگراف کے آخری حصہ میں

تحریر فرمایا ہے کہ ہمیں اپنے آخری مقصود کے راستے میں کچھ درمیانی مقاصد اور قریب الحصول مقاصد بھی سامنے رکھنے ہوتے ہیں، تاکہ ان میں سے ایک ایک کو حاصل کرتے ہوتے ہم آگے بڑھتے جائیں۔ دراصل یہ ایک سخت مغالطہ ہے جو بہت سی تحریکات کو، بالخصوص مسلمانوں کی بیشتر جماعتوں کو پیش آتا رہا اور وہ کسی قریب الحصول مقصد میں ایسے ڈوبے کہ:

دریں ورطہ کشتی فروشد ہزار!
کہ پیدا نہ شد تختۂ بر کنار

کا مصداق بن کر رہ گئے۔ حالانکہ درمیانی چیزوں کو زیادہ سے زیادہ کوئی حیثیت حاصل ہے تو محض ایک ذریعہ ہونے کی ہے۔ اگرچہ آپ کا یہ اہتمام قابلِ ستائش ہے کہ "وہ آخری مقصود نگاہوں سے اوجھل نہ رہنے" لیکن میرے نزدیک درمیانی چیزوں کو قریب الحصول مقصد کا درجہ دینا ہی خطرے سے خالی نہیں۔ ان کی حیثیت محض ذریعہ کی رہنی چاہیئے مقصد کی حیثیت سے ان پر ہرگز زور نہ دینا چاہیئے۔

آئیڈیلزم اور حکمتِ عملی کے درمیان توازن برقرار رکھنے کا صحیح طریقہ جماعت کے مقصد اور طریقِ کار میں یکسانیت و ہمواریت کا برقرار رہنا ہے۔ نیز مقصد اور طریقِ کار کے درمیان ایسا ربط قائم رکھنا ہے جو ہر معاملہ پر راستہ کے ہر موڑ کو منزل کی طرف پھیر دینے والا ہو، موجودہ دور کے ذہنی انتشار اور پراگندگیٔ افکار پر غالب آنے کے لیے سب

سے بڑی دانائی اور حکمت عملی یہ ہی ہے کہ مقصد کی ہمہ گیری کو کمزور نہ ہونے دیا جائے۔

لادینی دستور کی موجودگی میں ہماری جنگ ایک کھلے دشمن کے ساتھ تھی۔ فرعون اور ابولہب کی ذہنیتوں سے مقابلہ درپیش تھا۔ آہن وسیف اور خار و آتش سے گذرنے والا وہ راستہ اگرچہ خوفناک ضرور تھا مگر فریب ناک نہیں تھا۔ لیکن ایک نیم دینی دستور کی موجودگی میں ہمارا سابقہ منافقانہ ذہنیتوں سے پڑجاتا ہے۔ جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہٗ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو پیش آیا تھا۔ پھر نیم ملّا خطرۂ ایمان کی مشہور کہاوت سے بھی آپ بے خبر نہیں ہوں گے۔ میرے نزدیک جہاں ریاست کو ایک قطعی لادینی ریاست بننے سے روک دینا ایک بڑی کامیابی ہے، وہاں ریاست کا نیم دینی ریاست بن کر رہ جانا بھی ایک بہت بڑے خطرے کا آغاز ہو سکتا ہے جس سے نہ صرف پاکستان کے مسلمانوں کے لیے ہی بلکہ اسلام کے لیے بھی بہت سے داخلی فتنے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس لیے اس صورت حال کا جلد سے جلد تدارک کیا جانا نہایت ضروری ہے ورنہ دستور کا نام اسلامی دستور ہونا برعکس نہند نام زنگی کافور کا مصداق ہو جائے گا اور دستور کا یہ اعلان کہ کوئی قانون، کتاب وسنت کے خلاف نہ بنایا جائے گا۔ ۱۸۵۸ء کے ملکہ وکٹوریہ کے مشہور اعلان کی طرح کا محض کاغذی محضر بن کر رہ جائے گا جس میں کہا گیا تھا کہ "مذہبی معاملات میں حکومت کی طرف سے کسی قسم کی مداخلت نہیں

کی جائے گی"۔

فی الحقیقت، جب تک خدا کی حاکمیت کو واضح طور پر نہ تسلیم کر جائے، کتاب و سنت کو مثبت طور پر قانون سازی کا ماخذ اور دستور پر بالادست نہ مان لیا جائے، کتاب و سنت کا علم رکھنے والے اہلِ تقویٰ و اہلِ بصیرت ارکان پر مشتمل یجسلیچر کا قیام عمل میں نہ آجائے اور کتاب و سنت کی تعبیر و توضیح کا حق اصول سلف کے مطابق، ماہرین علوم اسلامیہ و حاملینِ شریعت کے لیے خاص نہ کر دیا جائے، اس وقت تک ذرا سی غفلت سے موجودہ دستور کو غیر اسلامی مقاصد کے لیے بڑی آسانی اور آزادی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے اور پھر ان مردود مقاصد کو اسلامی مقاصد کی حیثیت سے عام کیا جا سکتا ہے۔

آخر میں جماعت کے متعلق بھی مجھے عرض کرنا ہے میرے قریبی حلقوں میں جماعت کے کارکن حضرات جن کے اخلاص، دیانت اور سرگرمی کا میں دل سے قدرداں ہوں اور جن کے احترام سے میرا قلب ہر وقت معمور رہتا ہے وہ اپنے عام اجتماعات میں نہ تو دستور کے ان ناقص پہلوؤں پر عوام کو توجہ دلاتے ہیں اور نہ مسئلہ انتخابات کے سلسلہ میں خالص اسلامی مجلس شوریٰ کا نظریہ عوام کے سامنے رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں کہ ہمارے ملک کا دستور کامل اسلامی دستور بن چکا ہے، صرف جداگانہ انتخاب کی ایک آخری اسلامی مہم باقی ہے۔ پھر عوام سے ربط بڑھانے کا طریقہ

بھی تنقیدی اور منفی ڈھنگ کا ہوتا ہے جس سے خواہ مخواہ مقامی شخصی اور جزوی اختلافات کو ابھرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ جماعتی عصبیت میں اتنے کلیت پسند بن جاتے ہیں کہ بعض سیاسی و مذہبی امور پر جزوی و فروعی اختلاف کو بھی جماعت سے ذاتی یا گروہی عناد کا درجہ دے دیتے ہیں اور اس ملک کی گذشتہ سیاسی و مذہبی تاریخ سے شاید پوری طرح واقف نہ ہونے کی بنا پر یا جماعتی غلو کے غیر شعوری جذبہ کی بنا۔پر موجودہ حالات کو گذشتہ معاملات سے اس طرح کڑی در کڑی ملاتے ہیں کہ پیش رووں کے کاموں کی اکثر غلط ترجمانی ہوتی ہے اور اسلاف کی بصیرت اسلامی اور خلوص مشکوک نظر آنے لگتا ہے۔ اگرچہ اس بارے میں جماعت کے بعض اہل قلم اور آپ سے بھی کم و بیش شکایت ہو سکتی ہے، لیکن ہمارے قریبی کارکن اور معزز ارکان جماعت تو اس بارے میں بجائے خود بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ اور اس وقت اور اس ماحول کے معیار پر گذشتہ معاملات کو قیاس کرنے کے عادی سے بن گئے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وسیع النظری اور وسیع القلبی سے کام لیا جائے اور مقصد سے نیچے نہ آیا جائے۔ بایں ہمہ موجودہ سوسائٹی میں مجھے یہ سب سے زیادہ عزیز اور قابلِ احترام ہیں اللہ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنے دین کی صحیح صحیح خدمت لینے کے قابل بنائے۔

جواب: افسوس ہے کہ آپ نے میرے پچھلے خط کے اس فقرے پر غور نہیں کیا کہ ہم

اپنی تحریک خلا میں نہیں چلا رہے ہیں بلکہ واقعات کی دنیا میں چلا رہے ہیں اور ہمیں محض اعلان و اظہار حق ہی نہیں کرنا ہے بلکہ اقامت حق کے لیے بھی کوشش کرنی ہے جس کے لیے ہم کو اسی واقعات کی دنیا میں سے راستہ نکالنا ہوگا۔ یہ بات میں نے اپنے جواب کی ابتدا ہی میں اس لیے لکھ دی تھی کہ مجھے آپ کے خط کو پڑھ کر یہ محسوس ہو گیا تھا کہ آپ اپنے خیالات کی دنیا میں اس قدر گم ہیں کہ واقعات کی اس دنیا پر آپ کی نگاہ نہیں جاتی جس میں ہم اپنے مقصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ میرے اس اندیشے کی تصدیق آپ کے دوسرے خط سے ہو گئی اور معلوم ہوا کہ میرے توجہ دلانے پر بھی آپ اس پہلو کی طرف دیکھنے پر مائل نہیں ہو سکے ہیں۔

دوسری بات میں نے ابتدا ہی میں یہ عرض کی تھی کہ جسے واقعات کی دنیا میں صرف اعلان حق ہی نہیں بلکہ اقامتِ حق کا کام بھی کرنا ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ نظریت اور حکمت عملی کے درمیان زیادہ سے زیادہ توازن برقرار رکھے۔ اس بات کو بھی آپ نے پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ جب تک یہ دوسری بات بھی اچھی طرح آپ کے ذہن نشین نہ ہو جاتے آپ کے لیے ہماری تحریک کے طریقِ کار کو سمجھنا مشکل ہوگا۔ اس لیے آپ کے ارشادات پر کلام کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ میں ان دونوں باتوں کو پھر کھول کر بیان کر دوں

ہم جس ملک اور جس آبادی میں بھی ایک قائم شدہ نظام کو تبدیل کر کے دوسرا نظام قائم کرنے کی کوشش کریں گے وہاں ایسا خلا ہم کو کبھی نہ ملے گا کہ ہم بس اطمینان سے "براہ راست" اپنے مقصود کی طرف بڑھتے چلے جائیں۔ لامحالہ اس ملک کی کوئی تاریخ ہوگی۔ اس آبادی کی مجموعی طور پر اور اس کے مختلف عناصر کی انفرادی طور

پر کچھ روایات ہوں گی۔ کوئی ذہنی اور اخلاقی اور نفسیاتی فضا بھی وہاں موجود ہوگی ہم
طرح کچھ دوسرے دماغ اور دست وپا بھی وہاں پاتے جاتے ہوں گے جو کسی او
طرح سوچنے والے اور کسی اور راستے کی طرف اس ملک اور اس آبادی کو لے
چلنے کی سعی کرنے والے ہوں گے۔ ان مختلف عوامل میں سے کچھ ہمارے موافق
ہوں گے تو کچھ ناموافق اور مزاحم بھی ہوں گے۔ اور قائم شدہ نظام کا کسی کم یا زیادہ
مدت سے وہاں قائم ہونا خود اس بات کی دلیل ہوگا کہ یہ عوامل ہماری موافقت
میں کم اور اس کی موافقت میں زیادہ ہیں۔ علاوہ بریں یہ بات بالکل فطری اور عین متوقع
ہے کہ ہمارے مقابلہ میں یہ نظام ضرور ان تمام عوامل سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے
گا جو اس کے لیے سازگار ہیں یا بن سکتے ہیں اور ایسے تمام عوامل کو ہمارے لیے
ناموافق یا کم از کم غیر مفید بنانے کی بھی سعی کرے گا جنہیں وہ سمجھتا ہے کہ وہ ہمارے
حق میں سازگار ہیں۔ اور وہ تمام دوسری تحریکیں بھی جو ہمارے مقصد کی مخالف ہیں
یا تو قائم شدہ نظام کی حمایت کریں گی، یا پھر موجود الوقت عوامل کو حتی الامکان ہمارے
خلاف استعمال کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گی۔

ان حالات میں نہ تو اس امر کا کوئی امکان ہے کہ ہم کہیں اور سے پوری تیاری
کر کے آئیں اور یکایک اس نظام کو بدل ڈالیں جو ملک کے ماضی اور حال میں اپنی
گہری جڑیں رکھتا ہے، نہ یہ ممکن ہے کہ اسی ماحول میں رہ کر کشمکش کیے بغیر کہیں الگ
بیٹھے ہوتے اتنی تیاری کر لیں کہ میدان مقابلہ میں اترتے ہی سیدھے منزل مقصود پر
پہنچ جائیں اور نہ اس بات ہی کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ ہم اس کشمکش میں سے
گزرتے ہوتے کسی طرح "براہ راست" اپنے مقصود تک جا پہنچیں۔ ہمیں لامحالہ

واقعات کی اس دنیا میں موافق عوامل سے مدد لیتے ہوئے اور مزاحم طاقتوں سے کشمکش کرتے ہوتے بتدریج اپنا راستہ نکالنا ہوگا۔ ہر قدم جس کے لیے گنجائش نکل آتے فوراً اور بروقت اٹھا دینا ہوگا۔ دوسرے قدم کی گنجائش پیدا کرنے کے لیے پورا زور لگانا پڑے گا اور سمت مخالف کی دھکا پیل اگر ہمیں پیچھے دھکیلے تو اس بات کی کوشش کرنی ہوگی کہ پہلے قدم کی جگہ پاؤں تلے سے نہ نکل جائے۔ اس کشمکش کے دوران میں جتنی ضروری بات یہ ہے کہ ہمارا آخری اور اصلی مقصود ہماری نگاہوں سے اوجھل نہ ہو اتنی ہی ضروری یہ بات بھی ہے کہ ہم اس کی سمت میں بڑھنے کے لیے ہر درمیانی قدم کو مقصدی اہمیت دیں، جو قدم رکھا جا چکا ہے اسے زیادہ سے زیادہ مضبوط بنائیں، آگے کے قدم کے لیے زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کریں، اور جونہی کہ اس کے لیے جگہ پیدا ہو اس پر فوراً قبضہ کرلیں۔ آخری مقصود پر نگاہ جمانا اگر اس لیے ضروری ہے کہ ہمارا کوئی قدم غلط سمت میں نہ اٹھے، تو درمیان کے ہر قدم کو اس کے وقت پر قریبی مطمح نظر (Immediate objective) کی حیثیت دینا اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر پیش قدمی کا امکان ہی نہیں رہتا۔ جسے صرف تمنائیں بیان کرنے پر اکتفا کرنا نہ ہو بلکہ منزل مقصود کی طرف واقعی چلنا بھی ہو اسے تو ہر قدم جمانے اور دوسرا قدم اٹھانے کے لیے تمام ممکن الحصول موافق طاقتوں سے اس طرح کام لینا اور تمام موجود مزاحمتوں کو ہٹانے کے لیے اس طرح لڑنا ہوگا کہ گویا اس وقت کرنے کا کام یہی ہے۔

اس معاملہ میں صرف نظریت کام نہیں دیتی بلکہ اس کے ساتھ عملی حکمت ناگزیر ہے۔ اس حکمت کو نظر انداز کر دینے والا نظری آدمی طرح طرح کی باتیں کرسکتا ہے۔

کیونکہ وہ یا تو قافلے میں شامل ہی نہیں ہوتا، یا پھر قافلے کو لے کر چلنے کی ذمہ داری اس پر نہیں ہوتی۔ مگر جسے چلنا ہی نہ ہو بلکہ چلانا بھی ہو وہ ہر بات کو محض اس کے خیالی حسن کی بنیاد پر قبول نہیں کر سکتا۔ اسے تو عملی نقطۂ نظر سے تول کر دیکھنا ہوتا ہے کہ جن حالات میں وہ کام کر رہا ہے، جو قوت اس وقت اس کے پاس موجود ہے یا فراہم ہونی ممکن ہے اور جو جو مزاحمتیں راستے میں موجود ہیں ان سب کو دیکھتے ہوئے کونسی بات قابلِ قبول ہے اور کونسی نہیں، اور یہ کہ کس بات کو قبول کرنے کے نتائج کیا ہوں گے۔ نظری آدمی تو بے تکلف کسی مرحلے پر بھی کہہ سکتا ہے کہ ایک ایک قدم اٹھانے اور قدم قدم کی جگہ کے لیے کشمکش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ "براہ راست" کیوں نہیں بڑھ جاتے۔ مگر کام کرنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ راستے کی مزاحم طاقتوں کے ہجوم میں سے آخر براہ راست کیسے بڑھ جاؤں؟ اُن کے سر پر سے چھلانگ لگا کر جاؤں؟ زمین کے نیچے سے سرنگ لگا کر جا پہنچوں؟ یا کوئی تعویذ ایسا لاؤں کہ اسے دیکھتے ہی یہ سارا ہجوم چھٹ جائے اور میں اپنے قافلے کو لیے ہوئے سیدھا اپنی منزل کی طرف بڑھتا چلا جاؤں؟ نظری آدمی اس کشمکش کے دوران میں کسی جگہ بھی ٹھہر جانے یا پیچھے ہٹ جانے کا بڑے اطمینان سے مشورہ دے سکتا ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ ٹھہر کر یا پیچھے ہٹ کر تیاری کرو اور پھر اس شان سے آؤ کہ بس ایک ہی ہلّے میں سابق نظام ختم اور نیا نظام پورا کا پورا قائم ہو جائے۔ مگر کام کرنے والے کو ایسے مشورے قبول کرنے سے پہلے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ مزاحم طاقتوں کی موجودگی میں کشمکش روک کر ٹھیر جانا ممکن بھی ہے یا نہیں؟ پیچھے ہٹوں تو یک وہلہ منزل پر پہنچنا تو درکنار اس جگہ واپس آنے کا بھی کوئی امکان باقی رہ جاتا ہے جہاں سے پلٹنے کے لیے کہا

کہا جا رہا ہے؟ اور کیا میرے ٹھیرنے یا ہٹنے کی صورت میں مزاحم طاقتیں بھی ٹھیر یا ہٹ جائیں گی کہ وہ ماحول کو میرے لیے اور زیادہ ناسازگار بنانے سے رک جائیں اور میں اسے خوب سازگار بنا کر اور خود پوری طرح تیار ہو کر بڑے اطمینان سے ایک بھرپور حملہ کرسکوں؟ غرض نظری آدمی کے لیے ہر قابلِ تصور تجویز لے آنا ممکن ہے کیونکہ جن تخیلات کے عالم میں وہ رہتا ہے وہاں حالات اور واقعات موجود نہیں ہوتے صرف خیالات ہی خیالات ہوتے ہیں، مگر کام کرنے والا واقعات کی دنیا میں کام کرتا ہے اور اس پر کام چلانے کی ذمہ داری ہوتی ہے، اس لیے وہ عملی مسائل کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کرسکتا۔

ایک اور حیثیت سے بھی نظریت اور حکمت عملی میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم رکھنا اُس شخص کے لیے ضروری ہے جو واقعات کی دنیا میں عملاً اپنے نصب العین تک پہنچنا چاہتا ہو۔ آئیڈیلزم کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے نصب العین کی انتہائی منزل سے کم کسی چیز کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے، اور جن اصولوں کو وہ پیش کرتا ہے ان پر سختی کے ساتھ جما رہے۔ مگر واقعات کی دنیا میں یہ بات جوں کی توں کبھی نہیں چل سکتی۔ یہاں نصب العین تک پہنچنے کا انحصار ایک طرف اُن ذرائع پر ہے جو کام کرنے والے کو بہم پہنچیں۔ دوسری طرف اُن مواقع پر ہے جو اسے کام کرنے کے لیے حاصل ہوں اور تیسری طرف موافق اور ناموافق حالات کے اُس گھٹتے بڑھتے تناسب پر ہے جس سے مختلف مراحل میں اسے سابقہ پیش آئے۔ یہ تینوں چیزیں مشکل ہی سے کسی کو بالکل سازگار مل سکتی ہیں۔ کم از کم اہل حق کو تو یہ کبھی سازگار نہیں ملی ہیں اور نہ آج ملنے کے کوئی آثار ہیں۔ اس صورت حال میں جو شخص یہ چاہے کہ پہلا قدم آخری منزل ہی

پر رکھوں گا، اور پھر دوران سعی میں کسی مصلحت و ضرورت کی خاطر اپنے اصولوں میں کسی استثنا۔ اور کسی لچک کی گنجائش بھی نہ رکھوں گا وہ عملاً اس مقصد کے لیے کوئی کام نہیں کر سکتا۔ یہاں آئیڈیلزم کے ساتھ برابر کے تناسب سے حکمتِ عملی کا ملنا ضروری ہے۔ وہی یہ طے کرتی ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے راستے کی کن چیزوں کو آگے کی پیش قدمی کا ذریعہ بنانا چاہیئے، کن کن مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے کن کن موانع کے ہٹانے کو مقصدی اہمیت دینی چاہیئے اور اپنے اصولوں میں سے کن میں بے لچک ہونا اور کن میں اہم تر مصالح کی خاطر حسبِ ضرورت لچک کی گنجائش نکالنا چاہیئے۔

اس معاملہ میں توازن کا بہترین نمونہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل میں ملتا ہے۔ آپ کی زندگی میں اس کی جو بے شمار مثالیں ملتی ہیں ان میں سے میں یہاں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ آپ جو نظامِ زندگی قائم کرنے کے لیے مبعوث ہوئے تھے وہ پوری نوعِ انسانی کے لیے تھا، صرف عرب کے لیے نہ تھا۔ مگر عرب میں اس کا قائم ہونا اور پوری طرح جم جانا دنیا میں اس کے قیام کا ایک ناگزیر ذریعہ تھا۔ کیونکہ آپ کو اپنے مشن کی کامیابی کے لیے جو مواقع عرب میں حاصل تھے وہ اور کہیں نہ تھے۔ اس لیے آپ نے اُس کو مقصدی اہمیت دی، بیرونی دنیا میں دعوت پہنچانے کی صرف ابتدائی تدبیروں پر اکتفا فرمایا، اپنی پوری توجہ اور پوری طاقت صرف عرب میں اقامتِ دین پر صرف فرمائی اور بین الاقوامیت کی خاطر کوئی ایسا کام نہ کیا جو عرب میں اس مقصدِ عظیم کی کامیابی کے لیے نقصان دہ ہو۔ اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل

ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرقِ مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضور نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا، بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی، لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ الائمۃ من قریش[1] "امام قریش میں سے ہوں"۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص معاملہ میں یہ ہدایت، مساوات کے اُس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے ایسے اہم اصول میں اتنے بڑے استثناء کی گنجائش کیوں پیدا کی گئی؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اُس وقت عرب کے حالات میں کسی غیر عرب تو درکنار کسی غیر قریشی کی خلافت بھی عملاً کامیاب نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے حضور نے خلافت کے معاملہ میں مساوات کے اِس عام اصول پر عمل کرنے سے صحابہ کو روک دیا، کیونکہ اگر عرب ہی میں حضورؐ کے بعد اسلامی نظام درہم برہم ہو جاتا تو دنیا میں اقامتِ دین کا فریضہ کون انجام دیتا۔ یہ اس بات کی صریح مثال ہے کہ ایک اصول کو قائم کرنے پر ایسا اصرار جس سے اس اصول کی بہ نسبت بہت زیادہ اہم دینی مقاصد کو نقصان پہنچ جائے، حکمتِ عملی ہی نہیں حکمتِ دین کے بھی خلاف ہے۔ مگر یہ معاملہ اسلام کے سارے اصولوں کے بارے میں یکساں نہیں ہے۔ جن اصولوں پر دین کی اساس قائم ہے مثلاً توحید اور رسالت وغیرہ، ان میں

---

[1] اس پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو رسائل و مسائل حصہ اول صفحہ ۷۶ - ۸۲

عملی مصالح کے لحاظ سے لچک پیدا کرنے کی کوئی مثال حضور کی سیرت میں نہیں ملتی، نہ اس کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔

ان امور کو آپ ذہن نشین کرلیں تو خود ہی اپنی بہت سی باتوں کا جواب پا سکتے ہیں۔ تاہم میں کوشش کروں گا کہ آپ کی باتوں پر سلسلہ وار مختصر گفتگو کرکے بھی اپنا موقف واضح کردوں۔

۱۔ آپ کا خیال ہے کہ موجودہ نیم اسلامی دستور کو کامل اسلامی دستور میں تبدیل کرنے کے لیے پہلا اور زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ کتاب و سنّت کا علم رکھنے والے اہل تقویٰ اور اہل بصیرت مسلمانوں پر مشتمل لیجسلیچر کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس غرض کے لیے آپ براہ راست جدوجہد کو ترجیح دیتے ہیں اور اس براہ راست جدوجہد کی ضرورت آپ کے نزدیک اس بنا پر اور بھی زیادہ ہے کہ ملک میں مختلف و متضاد طبقے دستور کے نام پر اسلام کی عجیب و غریب اور جدید تعبیریں کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ تاہم آپ بدرجۂ آخر یہ گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں کہ اس مقصد کے لیے انتخابات کو ذریعہ بنایا جائے۔

اس ارشاد میں جتنی باتیں آپ نے فرمائی ہیں ان میں سے کسی کے بھی عملی پہلو پر آپ نے غور نہیں فرمایا۔ واقعات کی دنیا میں ہم جس صورتِ حال سے دوچار ہیں وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں مجالس قانون ساز کے قیام کی ابتدا انگریزوں کے دورِ حکومت میں ہوئی۔ اس نظام کو انھوں نے اپنے نظریات کے مطابق قومی جمہوری، لادینی ریاست کے اصولوں پر قائم کیا۔ انہی اصولوں پر سالہا سال تک اس کا مسلسل ارتقا ہوتا رہا اور انہی اصولوں پر نہ صرف پوری ریاست کا نظام تعمیر

ہوا، بلکہ نظام تعلیم نے ان کے مطابق ذہن تیار کیے۔ ہمارے معاشرے کے مختلف باا ثر طبقات نے ان کو پوری طرح اپنا لیا، اور بحیثیت مجموعی سارے معاشرے نے ان کے ساتھ مطابقت پیدا کر لی۔ ان واقعات کی موجودگی میں جتنے کچھ ذرائع ہمارے (یعنی دینی نظام کے حامیوں کے) پاس تھے ان کو دیکھتے ہوئے یہ بھی کوئی آسان کام نہ تھا کہ کم از کم آئینی حیثیت سے اس عمارت کی اصل کا فرانہ بنیاد (لادینیت) کو بدلوا کر اس کی جگہ وہ بنیاد رکھ دی گئی جس کی بنا پر آپ موجودہ دستور کو نیم دینی تسلیم کر رہے ہیں۔ پچھلے نو سال میں یہ کام جن مشکلوں سے ہوا ہے ان کو آپ بھول نہ جائیں، اور اب بھی لادینی رجحانات رکھنے والے باا ثر طبقے اس کو ڈھا دینے کے لیے جس طرح زور لگا رہے ہیں اس کی طرف سے آنکھیں بند نہ کر لیں۔ کیا ان حالات میں یہ بات عملاً ممکن تھی کہ ٹھیٹھ اسلامی تصور کے مطابق ایک لیجسلیچر قائم ہو سکتی؟ اور کیا ہماری طرف سے یہ عقلمندی ہوتی کہ جو کم سے کم قابلِ قبول چیز اس وقت حاصل ہو رہی ہے اُسے لے کر آئندہ کی پیش قدمی کا ذریعہ بنانے کے بجائے ہم پوری مطلوب چیز پر اصرار کرتے اور نہ ملتی تو جو کچھ مل رہا تھا اسے بھی رد کر دیتے؟

اب اس نیم اسلامی دستور کو کامل اسلامی دستور میں تبدیل کرانے کا مسئلہ ہمارے سامنے درپیش ہے تاکہ آپ کے بقول "دستور کے اسلامی تقاضوں کو بغیر کسی تحریف کے صحیح طور پر پورا کیا جا سکے"۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ اس کے لیے ایک ایسی لیجسلیچر کی ضرورت ہے جو کتاب و سنت کا علم رکھنے والے اہل تقویٰ و اہل بصیرت مسلمانوں پر مشتمل ہو۔ مگر اس کے لیے آپ انتخابات کے بجائے براہ راست جدوجہد کو ترجیح دیتے ہیں۔ ذرا اس کا عملی پہلو بھی دیکھیے۔ اس طرح کی لیجسلیچر کے لیے موزوں آدمی

نامزد کرنے کا کام تو ظاہر ہے کہ کسی کو نہیں سونپا جا سکتا۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ان افراد کے انتخاب کا حق صرف مدارس دینیہ اور مذہبی جماعتوں اور دیندار لوگوں تک محدود رکھا جائے۔ اور اگر ایسا کیا بھی جائے تو ان کے ووٹوں سے بحالت موجودہ جیسے لوگ منتخب ہو کر آئیں گے ان کے ہاتھوں شاید ہمیشہ کے لیے اسلامی ریاست کے تصور ہی کی مٹی پلید ہو جائے۔ حالات کو دیکھتے ہوئے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ عوام کے حق رائے دہندگی کے سوا انتخاب کی اور کوئی صورت نہ تو ممکن ہے اور نہ مقابلتاً زیادہ مناسب۔ اس بات کو آپ سمجھ لیں تو یہ بات بھی آپ کی سمجھ میں خود بخود آ جائے گی کہ اب اس نیم دینی دستور کے کامل اسلامی دستور میں تبدیل ہونے اور اس کے اسلامی تقاضوں کو بلا تحریف پورا کرنے کا سارا انحصار اس پر ہے کہ ملک کی عام آبادی کو ذہنی اور اخلاقی حیثیت سے اس قابل بنانے کی کوشش کی جائے کہ وہ کتاب و سنت کا علم رکھنے والے اہل تقویٰ و اہل بصیرت لوگوں کے طالب بھی ہوں اور ان کی تلاش بھی کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بتدریج ایک طویل ہمہ گیر اور جاں گسل محنت سے ہوگا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ کام خلا میں نہ ہوگا بلکہ ایسی حالت میں ہوگا کہ مزاحم طاقتیں بہت بڑے پیمانے پر زبردست ذرائع اور قوتوں کے ساتھ اسی آبادی کے ذہن اور اخلاق کو بالکل برعکس نوعیت کے انتخاب کے لیے تیار کرتی رہیں گی اور ساتھ ساتھ اپنی اس تیاری کی فصل ہر انتخاب میں کاٹتی بھی رہیں گی جس سے ان کی قوتِ مزاحمت یا تو بڑھے گی یا کم از کم برقرار رہے گی۔ اس حالت میں انتخابات کو نظر انداز کر کے صرف براہِ راست جدوجہد پر اکتفا کرنے کا آخر کیا حاصل آپ کی سمجھ میں آتا ہے؟ "براہ راست جدوجہد" کو خواہ اس معنی میں لیا جائے کہ آپ خارجی دباؤ

ڈال کر مطلوبہ نوعیت کی لیجسلیچر کو از روئے دستور لازم کرانا چاہتے ہیں۔ یا اس معنی میں کہ آپ ملک میں وہ عام ذہنی و اخلاقی انقلاب لانا چاہتے ہیں جس سے کتاب و سنت کا علم رکھنے والے اہل تقویٰ و اہل بصیرت لوگ لیجسلیچر پر غالب یا پوری طرح قابض ہو جائیں، دونوں صورتوں میں یہ نتیجہ عملاً جب بھی رونما ہو گا محض باہر سے براہ راست نہ ہو گا، بلکہ انتخابی نظام کے توسط ہی سے ہو گا، خواہ اس واسطہ کو آپ آج استعمال کریں یا دس بیس یا پچاس سال کے بعد۔ پھر جب صورتِ واقعہ یہ ہے تو یہ براہ راست جدوجہد انتخابات کو نظر انداز کرنے کے بجائے ان کے ساتھ ساتھ کیوں نہ ہو؟ کیوں نہ ایسا ہو کہ عام ذہنی و اخلاقی انقلاب کے لیے براہ راست جدوجہد بھی پوری طاقت کے ساتھ کی جائے، اور اس میں جتنی جتنی کامیابی نصیب ہو اسے انتخابات پر بالواسطہ یا بلا واسطہ اثر انداز ہونے کے لیے استعمال بھی کیا جاتا رہے۔ اس محاذ کو مزاحم طاقتوں کے لیے بالکل کھلا چھوڑ دینے میں آپ کیا فائدہ دیکھتے ہیں اور کیا آپ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جتنی مدت بھی آپ اسے ان کے لیے خالی چھوڑنے کے بعد اس کی طرف رجوع کریں گے (اور رجوع بہرحال آپ کو اپنے مقصد کے لیے کبھی نہ کبھی کرنا پڑے گا) قدم رکھنے کی جگہ کو تنگ سے تنگ تر ہی پائیں گے۔

۴۔ مخلوط انتخاب کے حق میں جو بحث آپ نے کی ہے اس سے پھر بھی محسوس ہوتا ہے کہ آپ واقعی صورت حال کو نظر انداز کر کے ایک ایسا خلا فرض کر رہے ہیں جس میں آپ کی خیالی تجویزیں آپ کے حسب منشا نافذ ہو سکتی ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ یہاں مجرد ایک انسانی آبادی رہتی ہے جس کا نہ کوئی ماضی ہے نہ حال۔ اس سادہ و بے رنگ مجموعے کے سامنے بس ایک اسلامی پروگرام رکھ دینا ہے۔ حالانکہ یہاں

ایک ایسی آبادی رہتی ہے جس پر ایک طویل مدت سے جمہوریت، لادینیت اور وطنی قومیت کے تصورات پر مبنی ایک نظام عملاً مسلط رہا ہے۔ اس نظام کی جڑیں نہ صرف نظام حکومت میں، بلکہ نظام تعلیم اور نظام تمدن میں بھی دُور دُور تک پھیلی ہوئی اور گہری جمی ہوتی ہیں اور اس نظام کے تینوں بنیادی تصورات ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم کی طرح جڑے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ دوسرا امر واقعی جس سے ہم دوچار ہیں یہ ہے کہ اس آبادی میں صرف انسان نہیں ہیں بلکہ مسلمان اور غیر مسلم دو بڑے عنصر بستے ہیں اور غیر مسلم عنصر کا بڑا حصہ ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ مسلمانوں میں سے جس طبقے یا جن طبقات کے ہاتھ میں عملاً اس وقت زمام کار ہے وہ ذہنی طور پر اس دینی نظام کا مخالف ہے جس کی طرف ہم ملک کو کھینچ رہے ہیں اور اس لادینیت کا حامی ہے جو ایک مدتِ دراز سے مسلط چلی آرہی تھی۔ غیر مسلموں میں جس ہندو عنصر کی غالب اکثریت ہے اس کو وطنی قومیت کے تصور سے نہ صرف جذباتی وابستگی ہے بلکہ اس کی ساری تمنائیں اور اس کے سارے مفاد اس امر سے وابستہ ہیں کہ یہاں اسی تصورِ قومیت پر لادینی جمہوری نظام قائم ہو۔ ان حالات میں مخلوط انتخاب اس سادہ شکل میں نہ آئے گا جس میں آپ اسے اسلامی پروگرام پیش کرنے کے لیے موزوں سمجھتے ہیں، بلکہ اپنے اس پورے تاریخی اور موجودہ پس منظر کے ساتھ آئے گا، اور اُن تمام عناصر کا آلۂ کار بن کر آئے گا جو وطنی قومیت اور لادینیت کے حامی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ مشرقی پاکستان کے حالات پر جس کی نگاہ ہو وہ کبھی اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ وہاں مخلوط انتخاب لادینی اور بنگلہ قوم پرستی کی بہ نسبت اسلامی پروگرام کے لیے زیادہ سازگار ہو سکے گا۔ دونوں کی پشت پر جو قوتیں اور جو موافق اسباب و وسائل

وہاں موجود ہیں ان کا موازنہ کرنے سے یہ خوش فہمی بآسانی دور ہو سکتی ہے۔ جداگانہ انتخاب کے جتنے نقصانات اور مخلوط انتخاب کے جتنے فوائد بھی آپ گنائیں اُن کو جوں کا توں مان لینے کے بعد بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ جس واقعی صورت حال سے ہم کو اس وقت سابقہ درپیش ہے اس کو نظر انداز کر کے ان کے درمیان موازنہ کرنا اور ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کر لینا حکمت عملی کے لحاظ سے کہاں تک درست ہے۔

اس بحث میں آپ اس بات کو بھی بھول گئے ہیں کہ اسلامی پروگرام پیش کرنے کا ہر جگہ ایک ہی لگا بندھا طریقہ نہیں ہے بلکہ حال اور مقام کے لحاظ سے اس کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ ایک جگہ وہ ہوتی ہے جہاں سب غیر مومن ہوتے ہیں۔ دوسری جگہ وہ ہوتی ہے جہاں اگرچہ مومن موجود ہوتے ہیں مگر غلبہ کفار کا ہوتا ہے اور کفر ہی کا نظام مسلط رہتا ہے۔ تیسری جگہ وہ ہوتی ہے جہاں اسلام کا اقرار کرنے والوں کا غلبہ ہوتا ہے مگر وہ غافل اور گمراہ ہو کر سراسر کافرانہ نظام پر چل رہے ہوتے ہیں۔ ایک اور جگہ ایسی ہوتی ہے جہاں تسلّط تو کافرانہ نظام کا ہی ہوتا ہے مگر اقرار اسلام کرنے والوں کی اکثریت اسلامی نظام کی خواہشمند ہوتی ہے۔ اور ان سب سے مختلف پوزیشن اس جگہ کی ہوتی ہے جہاں اسلام کا اقرار کرنے والے نہ صرف غالب ہوتے ہیں بلکہ اسلامی نظام کی نیو بھی رکھی جا چکی ہوتی ہے اور پیش نظر یہ ہوتا ہے کہ اب اس ادھورے کام کی تکمیل کرنی ہے۔ پاکستان میں ہم پہلی چار حالتوں سے نہیں بلکہ اس آخری حالت سے دوچار ہیں۔ یہاں آپ کو سب سے پہلے ان لوگوں کو پکارنا ہے جو اسلام کا اقرار کرتے ہیں، اس غرض کے لیے پکارنا ہے کہ وہ اس ادھوری تعمیر کی تکمیل کے لیے تیار ہوں، اور وہ پروگرام پیش کرنا ہے جو اس مرحلے

کے لیے درکار ہے۔ اس موقع پر اگر طریق انتخاب مخلوط ہوگا تو آپ کو بہت پیچھے ہٹ کر اُس جگہ سے دعوت کا آغاز کرنا ہوگا جو مسلم اور غیر مسلم سب کو یکساں اپیل کر سکے اور رکھی ہوئی نیو کو نظر انداز کر کے بجائے خود نیو رکھنے کی بات شروع کرنی پڑے گی، جس پر ہر وہ شخص آپ کی عقلمندی پر ہنس دے گا جو واقعی صورت حال کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اور اگر آپ ایسا نہ کریں گے بلکہ پروگرام اس ادھورے کام کی تکمیل ہی کے لیے پیش کریں گے تو مجھے بتائیے کس عقل کی رو سے آپ غیر مسلم آبادی کے پاس یہ دعوت لے کر جائیں گے کہ نیم دینی دستور کو کامل اسلامی دستور میں تبدیل کرنے اور دستور اسلامی کے تقاضوں کو بلا تحریف پورا کرنے کے لیے کتاب وسنت کا علم رکھنے والے اہل تقویٰ و اہل بصیرت درکار ہیں، آؤ ہمارے ساتھ تم بھی مل کر ان کا انتخاب کرو اور چھوڑ دو ان لوگوں کو جو اس رکھی ہوئی نیو کو ڈھا کر وطنی قومیت کی تصویر پر لادینی نظام تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

پھر یہاں سوال صرف عقل و حکمت ہی کا نہیں، اسلام کے اس آئین کا بھی ہے جو قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ یہ آئین اسلام کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کو بہرحال ایک حیثیت میں نہیں رکھتا۔ ماننے والے خواہ ایمان اور عمل کے لحاظ سے کتنے ہی مختلف مراتب میں ہوں، خواہ ان میں سے کوئی صدیقیت کا مرتبہ رکھتا ہو اور کوئی اسلام کی بالکل ابتدائی سرحد پر کھڑا ہو، بہرحال آئینی پوزیشن میں وہ سب برابر کے شریک ہیں اور نہ ماننے والوں کی آئینی پوزیشن ان سے مختلف ہے۔ اسلامی نظام جب بھی قائم ہوگا اسلام کے آئین کی رو سے اس کی عمارت مسلم معاشرے کی بنیاد ہی پر اٹھائی جائے گی۔ اس کے مدار کار وہی لوگ ہوں گے جو اس

کے حق ہونے کا اقرار کرتے ہیں نہ کہ وہ جو اس کا اقرار نہیں کرتے۔ اور اس کے اصحابِ امر کا انتخاب اور ان کا عزل و نصب ماننے والوں ہی کے ہاتھ میں ہوگا نہ کہ نہ ماننے والوں کے ہاتھ میں۔ یہ امتیاز اسلام خود قائم کرتا ہے۔ اس کا پورا تقاضا تو یہ ہے کہ اسلامی ریاست کی مجلس شوریٰ صرف مسلمانوں پر مشتمل ہو۔ لیکن اگر وقت اور حالات کی رعایت سے اس میں غیر مسلموں کی شرکت بھی قبول کر لی جائے تو کم از کم اس کے مسلم ارکان کو مسلمانوں کی رائے سے منتخب ہونا چاہیئے، اس میں غیر مسلموں کی رائے کا دخل ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اس سے تعصب پیدا ہوتا ہے تو ہو۔ دعوتِ اسلامی میں رکاوٹیں پڑتی ہیں تو پڑا کریں۔ ہم اسلام کے موجد تو نہیں ہیں کہ اپنی مرضی سے جیسا چاہیں پروگرام بنائیں اور دعوتِ اسلامی کا مفاد جس طریقے میں ہم کو نظر آئے اس کو اختیار کر لیں۔ خود اسلام ہی جب اپنے نظام میں مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز کرتا ہے تو ہم اسلام سے بڑھ کر اس کے مفاد کو جاننے والے کون ہیں کہ اس امتیاز کو نظر انداز کر کے ایک نرالے اسلامی نظام کی تعمیر کا پروگرام لے کر اٹھیں۔

۳۔ آپ نے موجودہ نیم اسلامی دستور کے جتنے خطرات بتاتے ہیں وہ سب صحیح ہیں۔ اس میں فریب کے جتنے پہلو آپ نے گنائے ہیں ان سے بہت زیادہ کے ہم قائل ہیں۔ اس کو پورے اسلامی دستور سے بدلنے کی جدوجہد پر جتنا بھی زور آپ دیں بالکل حق بجانب ہے۔ مگر جب ان چیزوں کے بیان میں آپ اتنا مبالغہ کرتے ہیں کہ اس نیم دینی دستور کی بہ نسبت لادینی دستور بن جانا قابلِ ترجیح ٹھیرتا ہے تو آپ سے اتفاق کرنا ہمارے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کفار کی ریاست کا کفر پر قائم ہونا اور چیز ہے اور مسلمانوں کی قومی ریاست کا کفر پر قائم ہو جانا بالکل ایک

دوسری ہی چیز۔ ان دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اگر شروع ہی میں پاکستان کی اس نوزائیدہ ریاست کو اس راستے پر جانے سے روکنے کی کوشش شروع نہ کر دی جاتی اور مسلمانوں کے قومی جذبات کو اسلامی ریاست کے مطالبے کی طرف نہ موڑ دیا جاتا تو یہاں تھوڑی ہی مدت کے اندر اسلامی نظام کی جدوجہد کے راستے میں موجودہ حالت کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ سخت مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ یہ کوئی عقلمندی نہیں ہے کہ آدمی محض کوہ کنی کے ذوق میں اپنے آگے مشکلات کے پہاڑ قائم ہو جانے دے، پھر ان کو توڑنے کی فکر کرے۔ سب سے بڑی سہولت جو اس نیم دینی دستور کی ساری پر فریبیوں اور خطرناکیوں کے باوجود ہمارے لیے پیدا ہو گئی ہے وہ یہ ہے کہ اب آئینی و جمہوری طریقوں سے مطلوبہ تبدیلی لانے کا راستہ کھل گیا ہے۔ اب ہم صحیح توازن کے ساتھ یہ کوشش کر سکتے ہیں کہ ایک طرف باشندگانِ ملک کے افکار و تصورات اور اخلاقی قدروں کو بدلتے چلے جائیں اور دوسری طرف جتنی جتنی یہ تبدیلی ہوتی جائے اسی تناسب کے ساتھ ہم انتخابات پر اثر انداز ہو کر وہ طاقت پیدا کرتے جائیں جس سے ملک کے نظامِ زندگی کو عملاً اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لیے ریاست کے ذرائع استعمال کیے جا سکیں۔ یہاں تک کہ اس تدریجی نشوونما سے ایک وقت وہ آجائے جب معاشرہ اور ریاست دونوں ٹھیک اسلام کے مطابق ہو جائیں۔ خالص لادینی دستور بن جانے کی صورت میں یہ راستہ ہمارے لیے بالکل بند رہتا۔ ہمیں اس مقصد کے لیے دوسرے بدرجہا زیادہ کٹھن راستے ڈھونڈنے پڑتے۔ اور پھر بھی آخر وقت تک یہ سوال ہمارے لیے سخت پریشان کن رہتا کہ وہ آخری فعل (Final Act) کیا ہو جس سے ریاست کی کافرانہ نوعیت عملاً اسلامی نوعیت میں تبدیل ہو جائے۔

علاوہ بریں یہ بات کہ ہم نے پچھلے آٹھ نو سال کی جدوجہد میں صرف اتنا ہی کام کیا ہے کہ ریاست کو ایک قطعی لادینی ریاست بن جانے سے روک دیا اور ایک نیم دینی دستور بنوا لیا، ایک بہت بڑی غلط فہمی اور اصل حقیقت کا بڑا غلط اندازہ ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ ہماری دستوری جدوجہد محض دستور بنوا لینے کی جدوجہد تھی ہی نہیں۔ وہ دراصل یہاں دو رجحانات کی کشمکش تھی۔ ایک لادینی رجحان پوری طرح ملک پر قابض تھا۔ اس کی پشت پر صرف حکومت ہی کے تمام ذرائع نہ تھے بلکہ پوری دنیا کے غالب نظام کا فکری سرمایہ اور ہماری اپنی قوم کے سب سے زیادہ طاقتور اور ذی اثر طبقوں کا ذہنی اور عملی تعاون بھی تھا اور اسی رجحان کو یہ فیصلہ کرنے کے آئینی اختیارات بھی کلیتہً حاصل تھے کہ اس نوزائیدہ مملکت کا آئندہ نظام کن تصورات اور کن اصولوں پر قائم ہو۔ کیونکہ دستور ساز اسمبلی ایک فرد واحد کے سوا پوری کی پوری ان لوگوں پر مشتمل تھی جو یا تو بالکل لادینی رجحانات رکھتے تھے یا اسلامی رجحان کے معاملہ میں کم از کم بے پروا تھے۔ دوسری طرف اسلامی رجحان کی پشت پر اسلام کے ساتھ مسلمان عوام کی جذباتی وابستگی کے سوا کوئی دنیوی طاقت نہ تھی اور اس جذباتی وابستگی کا حال یہ تھا کہ اسے مذہب کے نام پر کوئی نمائشی کھلونا دے کر بہلایا جا سکتا تھا، بلکہ پیٹ اور روٹی کے نام پر اس کا رخ اشتراکیت تک کی طرف موڑ دینا ممکن تھا۔ اسلامی حکومت کی جو مبہم سی خواہش لوگوں میں پائی جاتی تھی اس کا کوئی واضح تصور ذہنوں میں موجود نہ تھا، حتیٰ کہ اچھے خاصے اہل علم اصحاب کے ذہن کی رسائی بھی شیخ الاسلامی اور قضاء شرعی سے آگے کسی چیز تک نہ جاتی تھی۔ اس مقام سے جدوجہد کی ابتدا ہو کر موجودہ نیم دینی دستور بننے تک جو نوبت پہنچی تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کام بحیثیت مجموعی

دینی رجحان کی طاقت بڑھنے اور لادینی رجحان کا زور گھٹنے کے بغیر ہی ہو گیا یا ہو سکتا تھا؟ یہ تو ایک صریح پیمانہ ہے اس امر کا کہ اس آٹھ نو سال کی مدت میں دونوں رجحانات کی طاقتوں کا تناسب کس حد تک بدلا ہے۔ آخر یہ نتیجہ محض ایک مطالبۂ دستوری ہی سے تو رونما نہیں ہو گیا ہے جو کچھ آج آپ کے سامنے ہے وہ اس چیز کا نتیجہ ہے کہ عوام کے جذبات کو جو کسی رُخ پر بھی موڑے جا سکتے تھے، قطعیت کے ساتھ اسلامی رجحان کی طرف موڑ دیا گیا۔ اسلامی نظام اور اسلامی ریاست کا ایک صاف اور واضح تصوّر ان کے سامنے لایا گیا۔ ان کے اندر اس کی اتنی پہچان پیدا کی گئی کہ کسی نمائشی لیبل سے دھوکا نہ کھا سکیں۔ ان میں اس کی پیاس نہیں تو کم از کم اتنی طلب پیدا کر دی گئی کہ اس کے سوا کسی چیز پر راضی نہ ہو سکیں۔ ان کی رائے عام کو ہموار کر کے اسلامی نظام کی پشت اتنی مضبوط کر دی گئی کہ ملک کو کسی اور طرف لے جانا مشکل ہو گیا اور اب جہاں تک قدم بڑھ چکا ہے اس سے پیچھے ہٹنا بھی آسان نہ رہا۔ پھر ذہین طبقے کو بھی اسلامی نظامِ زندگی، اسلامی قانون اور اسلامی دستور کے بارے میں مطمئن کرنے اور ان کی ذہنی اُلجھنوں کو دُور کرنے کے لیے اچھا خاصا کام کیا گیا ہے جس کی بدولت آج اس طبقے کا جتنا حصہ لادینی نظام کا مؤید ہے اس سے زیادہ حصہ اسلامی نظام کی طرف مائل ہے۔ اس پر مزید یہ کہ اسی مدت میں اسلام کے لیے عملاً کام کرنے والوں اور ان کا ساتھ دینے والوں کی تعداد میں بھی معتدبہ اضافہ ہوا جس کو اس جد و جہد کے آغاز کی حالت کے مقابلے میں دیکھا جائے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج اس رجحان کی خدمت کے لیے پہلے سے بہت زیادہ ہاتھ اور دماغ اور وسائل فراہم ہو چکے ہیں۔ یہ سب کچھ نیم دینی دستور بنوا کر ختم نہیں ہو گیا ہے۔ یہی ہمارے آگے کے کام کا سرمایہ

ہے۔ خدا کے فضل کے بعد اگر کسی چیز کے بل بوتے پر ہم آگے کی تعمیر و اصلاح کے لیے کچھ سوچ سکتے ہیں تو وہ یہی پچھلے کام کا فراہم کیا ہوا سرمایہ ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں مبالغہ جتنا غلط ہے اتنا ہی غلط اس کا کم اندازہ کرنا بھی ہے۔ حقیقت سے زیادہ اندازہ کرنے کا نتیجہ اگر یہ ہوگا کہ ہم وہ کام کرنے کے لیے چل پڑیں گے جس کی طاقت ہمارے پاس نہیں ہے تو حقیقت سے کم اندازہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو کچھ ہم اس وقت کر سکتے ہیں اس کے لیے اقدام کرنے سے رہ جائیں گے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس کے مواقع پھر نہ ملیں یا آج کی بہ نسبت بہت کم رہ جائیں۔

۴۔ جماعت اسلامی کے جن لوگوں نے اپنی باتوں سے یا اپنے طرزِ عمل سے آپ کو اس شکایت کا موقع دیا ہے جو آپ نے اپنے عنایت نامہ کے آخری حصّہ میں بیان کی ہے ان کے حال پر مجھے افسوس ہے۔ اگر ہمیں معلوم ہو کہ وہ کون لوگ ہیں تو ہم تحقیق کریں گے اور ان کی اصلاح کے لیے کوشش میں دریغ نہ کریں گے۔ مگر جماعت نے بحیثیت مجموعی نہ تو موجودہ دستور کے ناقص پہلو بیان کرنے اور کامل اسلامی دستور کا تصوّر دلانے میں کوتاہی کی ہے اور نہ کبھی عوام کو اس غلط فہمی میں مبتلا کیا ہے کہ اسلامی دستور تو پورا کا پورا بن چکا ہے، اب صرف طریق انتخاب کی آخری مہم باقی ہے۔ دوسری جن کوتاہیوں کا آپ نے ذکر فرمایا ہے انہیں دور کرنے کی انشاء اللہ ضرور کوشش کی جائے گی۔ بہرحال انسانی کام بالکل معیارِ کمال پر پہنچے ہوئے تو نہیں ہو سکتے۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں گا اگر آپ جماعت کی کوتاہیوں سے بھی مجھے خبردار کرتے رہیں اور میری اپنی کوتاہیوں سے بھی۔ خصوصیّت کے

ساتھ مجھے یہ ضرور بتائیے کہ میں نے کہاں پیش رووں کے کاموں کی غلط ترجمانی کی ہے یا اسلاف کی اسلامی بصیرت اور خلوص کو مشکوک بنایا ہے۔ میں اپنی ہر بات کی اصلاح کے لیے تیار ہوں جس کے غلط ہونے پر مجھے مطمئن کر دیا جائے۔ آپ یقین کریں کہ ایسا کوئی کام مجھ سے ہوا بھی ہے تو دانستہ نہیں ہوا ہے۔

کیا اقامتِ دین فرضِ عین ہے؟

سوال: خاکسار کچھ سوالات کر کے جناب کو جواب دینے کی زحمت دینا چاہتا ہے اگرچہ جناب کی مصروفیتوں کے پیشِ نظر یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا، تاہم میں جناب ہی سے ان سوالات کے جوابات معلوم کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں کیونکہ ان میں بعض اہم سوالات اس نصب العین اور اس تنظیم سے متعلق ہیں جن کا شہود اور جس کا وجود اس دور میں آپ کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ میں ۹ سال سے اس جماعت سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس عرصہ میں میں نے اس کی تقریباً تمام کتابیں پورے غور و خوض کے ساتھ پڑھیں اور ایک قلبی احساسِ فرض کے تحت بلکہ ایک اندرونی دباؤ کے تحت اس میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کی۔ میں نے قرآن وسنت کے دلائل سے مطمئن ہو کر اس جماعت کے نظم سے منسلک ہونا اپنے ایمان و اصلاح کا تقاضا سمجھا۔ میں جذباتی طور پر نہیں بلکہ پورے

عقل و ہوش کے ساتھ یہ خیالات رکھتا ہوں کہ جس شخص پر اس جماعت کا حق ہونا واضح نہ ہوا ہو اس کا معاملہ تو اللہ تعالیٰ کے یہاں لائق عفو و درگذر ہے لیکن جس شخص کے دل و دماغ نے پکار کر یہ کہہ دیا ہو کہ اس برصغیر میں یہی ایک جماعت ایسی ہے جو اس دوَر میں حق کا کام صحیح طریق پر کر رہی ہے اور اس جماعت کے علاوہ اس سرزمین میں اور کوئی جماعت ایسی نہیں جس کا دامنِ فکر و کردار من حیث الجماعت اس طرح ہر آمیزش سے پاک ہو، تو اس پر عند اللہ یہ فرض عین ہو جاتا ہے کہ وہ اس جماعت سے منسلک ہو اور اگر وہ اس وقت کسی دنیوی مصلحت کے پیشِ نظر یا کسی نفسانیت کی بنا پر اس جماعت سے اپنا تعلق منقطع کرے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس سے مواخذہ ہوگا۔ اللہ جانتا ہے کہ میں نے ان سطور میں کسی گروہی عصبیت یا مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے بلکہ اس ناچیز نے جو کچھ سمجھا ہے وہ ظاہر کر دیا ہے۔ اگر اس میں غلط فہمی کام کر رہی ہے تو اسے رفع فرمائیے۔

یہاں میں سات آٹھ ماہ سے مقیم ہوں اور میری ایک ایسے بزرگ سے ملاقات ہے جو عالم دین ہیں، جماعت کی دعوت اور طریق کار کو عین حق سمجھتے ہیں اور جماعت کے باقاعدہ متفق بھی ہیں۔ اس کے باوجود ان کا خیال یہ ہے کہ فریضہ اقامتِ دین جس کے لیے یہ جماعت کام کر رہی ہے وہ فرض عین نہیں بلکہ فرض کفایہ ہے۔ اس لیے جب اس میں کچھ لوگ حصہ لے رہے ہیں تو کوئی ضروری نہیں کہ اس میں ہر

ایک شخص حصہ لے۔ اگر کسی شخص کی دینوی مصلحتیں اسے اس کام سے روکتی ہیں اور وہ ان کی وجہ سے اس جماعت سے ہر قسم کا تعلق توڑ لیتا ہے اور اقامتِ دین کے لیے ذاتی طور پر بھی علیحدہ سے کوئی کام نہیں کرتا تو وہ کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا اور اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ اس کی مثال تو بس نمازِ جنازہ کی سی ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس وقت اور فرصت ہے اور اس کی طبیعت چاہتی ہے تو وہ اس میں شرکت کرے اور اگر وقت وفرصت نہیں ہے اور طبیعت نہیں چاہی تو اسے پورا اختیار ہے کہ اس میں حصہ نہ لے۔

یہ بات تو وہ فریضۂ اقامتِ دین کے بارے میں کہتے ہیں۔ اب رہی جماعت کی تنظیم، اس سے منسلک ہونا، اس کے امیر کی اطاعت اس راہ میں آنے والی مشکلات پر صبر اور اس نصب العین کے لیے ہر قسم کی جانی ومالی قربانیاں، تو ان امور کو وہ بالکل نوافل کا درجہ دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ صاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ یہ امور تو ایسے ہیں جیسے نمازِ تہجد جو اللہ تعالیٰ کے یہاں مراتبِ عالیہ کے حصول کے لیے تو ضروری ہے لیکن محض بخشش ونجات کے لیے ضروری نہیں ہے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں نے اس راہ پر اپنی جانیں نثار کردیں اور اپنی اولاد اور اپنے خاندان کی مستقبل کی زندگیوں کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تو کیا انہوں نے یہ سب کچھ محض ایک نفل کام کے لیے کیا؟ تو وہ اس کا جواب اثبات میں دیتے ہیں اور صاف کہتے ہیں کہ ان کی وہ ساری

قربانیاں محض بلند مراتب کے حصول کے لیے تھیں ورنہ ایسا کرنا آپ پر فرض نہیں تھا۔ انہوں نے یہ باتیں اس وقت کہیں جب ان کے سامنے اخوان کی مثال پیش کی گئی۔ ان کا انداز استدلال اس قسم کا ہے کہ اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جاتے تو اخوان اور ایسے ہی دوسرے اہل حق جنہوں نے اللہ کے لیے اپنی جانیں نثار کردیں وہ لائق ستائش ٹھہرنے کے بجاتے الٹے لائق ملامت ٹھہریں گے کیونکہ محض نفل کام کے لیے اپنی جان دینا اور اپنے پسماندگان کو کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ جانا غلو فی الدین نہیں تو اور کیا ہے اور اس کا مرتکب اللہ کے نزدیک مستحق عذاب ہی ہو سکتا ہے

نظم جماعت کی پابندی اور اطاعت امیر کا جب ذکر آتا ہے تو وہ کہتے ہیں ایسی مختلف تنظیمیں جو مختلف ادوار اور مختلف ممالک میں دین کا کام کرنے کے لیے قائم ہوں، ان کے نظم کی پابندی اور ان کے اولی الامر کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ اطاعت تو رسول اللہ اور خلفائے راشدین کی فرض تھی نہ کہ ایسی جماعتوں کے امراء کی جو وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں میں دین کا کام کرنے کے لیے تشکیل پاتی رہیں۔ گویا کہ اب کوئی اور کام کرنے کا رہا نہیں ہے حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ اس بات کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ اگر اس دور میں خلافت علی امنہاج النبوۃ قائم ہو جائے تو اس کے امیر کی اطاعت بھی اسی طرح فرض ہو گی جیسے خلفائے راشدین کے دور میں تھی۔

ایک عالم دین کی زبان سے یہ باتیں سن کر میں سکتے میں رہ جاتا ہوں

میں نے اپنے ناقص علم کی حد تک انہیں مطمئن کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کا اوّل اور آخر جملہ یہی ہے کہ یہ باتیں فرضِ عین نہیں بلکہ فرض کفایہ یا نفل کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ وہ اندازِ فکر ہے جو تحریکِ اسلامی کے نشوونما کے لیے سمِ قاتل ہے۔ اس کا کسی ایسے نوجوان کے کانوں میں پڑ جانا جس نے ابھی اس راہ میں قدم رکھا ہی ہو اس کے قوائے عمل کو مفلوج کر دینے کے لیے کافی ہے۔ پس اس لیے نہیں کہ ان صاحب کو مطمئن کرنا ہے بلکہ اس لیے کہ اس کے اثرات دوسروں پر متعدی ہو سکتے ہیں، ان غلط خیالات کی تردید بہت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یوں تو جماعت کا تمام لٹریچر ان کا جواب پیش کرتا ہے لیکن غالباً کسی ایک جگہ اس کا مختصر اور مدلل جواب موجود نہیں ہے۔

ان صاحب کا ذہن فقہی اصطلاحات میں اس طرح الجھا ہوا ہے کہ جماعت کے لٹریچر کے سارے دلائل انہیں بے وزن معلوم ہوتے وہ کہتے ہیں کہ جماعت کی کتابوں میں دلائل نہیں ہوتے پہلے تو میں ان کے اس جملہ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ کیونکہ جماعت کے لٹریچر کا دلائل سے مسلح ہونا ہی تو وہ وصف ہے جس کا لوہا مخالفین بھی مانتے ہیں۔ اس لیے جب ان سے وضاحت چاہی گئی تو کہنے لگے کہ اس میں فقہ حنفی یا دیگر مکاتبِ فقہ کی کتابوں کا حوالہ نہیں ہوتا۔ قرآن وسنت سے محض اپنے ہی سے استدلال کیا جاتا ہے۔ ان کی گفتگو کا لب لباب یہ ہے کہ اگر فقہ حنفی کی کسی کتاب میں یہ دکھا دیا جاتے کہ اقامتِ دین اور

اس کے لیے ایک جماعت کا قیام اور پھر اس کے نظم سے وابستگی اور اس کے امیر کی اطاعت فرضِ عین ہے تب تو وہ مانیں گے، ورنہ وہ اس کے لیے تیار ہیں کہ اگر جماعت کے اجتماعات میں شرکت پر ان سے اصرار کیا جاتے اور ہفتہ وار رپورٹ طلب کی جاتے تو وہ "متفقیت" سے بھی مستعفی ہو جائیں گے۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر جواب میں فقہ حنفی کی کتابوں کا حوالہ بھی ممکن ہو تو دیا جاتے شائد کہ ان کے دل کی گرہیں کھل جائیں

ایک سوال میں اپنی طرف سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اکثر میرے ذہن میں یہ سوال ابھرتا رہا ہے کہ اسلام کے ارکان کی حیثیت سے پانچ چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں فریضہ اقامتِ دین کی جدوجہد شامل نہیں ہے حالانکہ اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے چھٹے رکن کی حیثیت حاصل ہونی چاہیئے تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو اسلام محض نماز روزہ حج اور زکوٰۃ تک محدود نہیں رہ سکتا تھا بلکہ اس کے وہ تقاضے بھی ہر مسلمان کے سامنے ہمیشہ موجود رہتے جن کا شعور پیدا کرنے کے لیے علیحدہ سے ہر دور میں تحریکیں اٹھتی رہی ہیں۔ صراحتہً تحریر فرماتیے کہ دین کے اوامر میں فریضہ اقامتِ دین کی کیا حیثیت ہے۔

ایک اور بزرگ ہیں جو پہلے تو جماعت سے اس حد تک تعلق رکھتے تھے کہ رکنیت کی درخواست دینے والے تھے لیکن یکایک ان کے ذہن رسا میں ایک نکتہ پیدا ہوا اور وہ اپنا دامن جھاڑ کر جماعت سے اتنی دُور جا کھڑے ہوتے گویا انہیں جماعت سے کبھی کوئی تعلق رہا ہی نہیں تھا

وہ فرماتے ہیں کہ اسلامی دستور کی تشکیل کے بعد پاکستان ایک اسلامی ریاست بن چکا ہے اور یہاں تمام مسلمان شہری ایک نظامِ اطاعت میں منسلک ہو چکے ہیں۔ یہ نظامِ اطاعت سب کو جامع اور سب پر فائق ہے اب سب کی اطاعتیں اس بڑے نظامِ اطاعت کے گرد جمع ہو چکی ہیں۔ لہٰذا اس کی موجودگی میں کسی اور نظم کا قائم ہونا اور افراد سے اپنی اطاعت کا مطالبہ کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک حکومت کے اندر ایک متوازی حکومت کا قائم کرنا۔ خلاصہ یہ کہ اب کسی جماعت، کسی تنظیم اور کسی امیر کی ضرورت نہیں ہے۔ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے، حکومت اس کا تنظیمی مظہر ہے، تمام مسلمان شہری اب کسی جماعت کے نہیں بلکہ اس ریاست کی ہمہ گیر تنظیم کے رکن ہیں اور اب ان کی تمام اطاعتیں اور وفاداریاں اسی تنظیم کا حق ہیں نہ کہ کسی اور جماعت کا۔ اب اطاعت کسی کی نہیں بلکہ ریاست کے صدر کی ہونی چاہیئے۔ یہ وہ طرزِ استدلال ہے کہ اس کے نتیجہ میں شہریوں کا حقِ انجمن سازی (Right to form Associations) ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اور نہ صرف ختم ہو جاتا ہے بلکہ اس کا ذکر کرنا بھی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے مترادف ہے۔ آپ کے پاس اس استدلال کا کیا جواب ہے؟ کیا اسلامی ریاست واقعی ایک ایسی ریاست ہو گی جس میں کسی دوسری پارٹی کو جنم لینے اور جینے کا موقع نہیں ملے گا؟ اگر ملے گا تو ایک نظامِ اطاعت کے لحاظ سے اس کی کیا حیثیت ہو گی؟ کیا اب کسی مسلمان کا یہ استدلال درست ہے کہ اب اسے

اسلام کے اجتماعی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کسی جماعت میں شریک ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ ایک اسلامی ریاست کا ایک شہری ہے علمی حیثیت سے یہ سوالات خاص اہمیت رکھتے ہیں اور ان کا جواب علمی طریق پر ہی دیا جانا چاہیئے۔

ایک سوال یہ ہے کہ شریعت میں نماز باجماعت کی کیا حیثیت ہے؟ یہ واجب ہے یا سنت مؤکدہ ہے یا واجب بالکفایہ یا سنت مؤکدہ بالکفایہ ہے؟ کن حالات یا عذرات میں اس کے وجوب یا تاکید کی سختی کم ہوجاتی ہے؟ یہاں مسجدیں کم اور دور دور ہیں لہٰذا اکثر لوگ گھروں میں نماز پڑھتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ چاہیں تو تھوڑی سی زحمت گوارا کر کے مسجد میں پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن کوئی تو فاصلے کا عذر کرتا ہے، کوئی اندھیری رات کا، کوئی پانی اور کیچڑ اور راستے کی خرابی کا۔ کیا یہ عذر معقول ہیں؟ بعض لوگ ہیں جو اپنی دکان پر ہی نماز پڑھتے ہیں اور تنہا ہونے کا عذر پیش کرتے ہیں۔ ان میں جماعت کے ارکان اور متفقین بھی ہیں۔ یہ لوگ اجتماع کرتے رہتے ہیں اور جماعت کا وقت نکل جاتا ہے۔ بعد میں فرداً فرداً ادا فرماتے ہیں۔ تحریر فرمائیے کہ یہ سب باتیں کہاں تک درست ہیں؟

کبائر میں جھوٹ کا کیا درجہ ہے؟ کتاب و سنت میں اس کی جس قدر مذمت آئی ہے اور اس کے مرتکب کے لیے جتنی وعیدیں آئی ہیں بیان فرمائیے۔ کیا بعض حالات ایسے بھی ہیں جن میں جھوٹ بولنا مباح ہوجائے

اگر کسی شخص کے پاس ۵۲½ تولہ چاندی کی قیمت سے زیادہ قیمت

کا سونا لیکن ۱/۲ ۷ تولہ سے کم ہے اور چاندی بالکل نہیں ہے اور نہ روپیہ پس انداز ہو سکتا ہے تو اس پر زکواۃ واجب ہو گی یا نہیں؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ سونے کا نصاب ۱/۲ ۷ تولے ہے۔

اکثر لوگ وتر کی تیسری رکعت میں بالالتزام سورہ اخلاص پڑھتے ہیں اور یہ بات خاص طور سے رمضان میں نظر آتی ہے جب تراویح کے بعد وتر جماعت کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ کیا یہ التزام کسی دلیل پر مبنی ہے یا محض رواج پر؟ کیا یہ التزام درست ہے؟

فطرہ کی مقدار کے بارے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے کوئی سوا سیر گیہوں دیتا ہے تو کوئی پونے دو سیر اور کوئی سوا دو سیر۔ صحیح مقدار کیا ہے اور اس سلسلہ میں آپ کا عمل کیا ہے؟ فطرہ کے سلسلہ میں دوسری بات یہ دریافت کرتی ہے کہ اگر کوئی شخص خود صاحب نصاب نہیں ہے بلکہ اس کی بیوی صاحب نصاب ہے تو فطرہ محض بیوی پر واجب ہو گا یا شوہر پر بھی اور یہ کہ اولاد کی طرف سے بھی فطرہ دیا جائے گا یا نہیں؟

جواب:۔ جماعت کے متعلق آپ نے اپنا جو نقطۂ نظر بیان کیا ہے قریب قریب وہی نقطۂ نظر تشکیل جماعت کے موقع پر میں نے بیان کیا تھا اور اس کے بعد برابر میں یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کرتا رہا ہوں کہ حق واضح ہو جانے اور یہ بات سمجھ لینے کے بعد کہ یہ جماعت برسرحق ہے اس کا ساتھ نہ دینا اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل مواخذہ ہے۔ البتہ وہ لوگ معافی کے مستحق ہو سکتے ہیں جو جماعت کے موقف کے بارے میں کوئی شک رکھتے ہوں، یا اخلاص و دیانت کے ساتھ اس سے مطمئن نہ ہوں۔

آپ نے جن عالم دین کا ذکر کیا ہے ان کو یہ غلط فہمی ہے کہ اقامت دین کی

سعی ہر حال میں صرف فرض کفایہ ہے۔ حالانکہ یہ فرض کفایہ صرف اسی حالت میں ہے جب کہ آدمی کے اپنے ملک یا علاقے میں دین قائم ہو چکا ہو، اور کفّار کی طرف سے اس دارالاسلام پر کوئی ہجوم نہ ہو، اور پیشِ نظر یہ کام ہو کہ آس پاس کے علاقوں میں بھی اقامتِ دین کی سعی کی جائے۔ اس حالت میں اگر کوئی گروہ اس فریضے کو انجام دے رہا ہو، تو باقی لوگوں پر یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے اور معاملہ کی نوعیت نمازِ جنازہ کی سی ہوتی ہے۔ لیکن اگر دین خود اپنے ہی ملک میں مغلوب ہو، اور خدا کی شریعت متروک و منسوخ کر کے رکھ دی گئی ہو، اور علانیہ منکرات اور فواحش کا ظہور ہو رہا اور حدود اللہ پامال کی جا رہی ہوں، یا اپنا ملک دارالاسلام تو بن چکا ہو مگر اس پر کفار کے غلبے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہو، تو ایسی حالتوں میں یہ فرض کفایہ نہیں بلکہ فرض عین ہوتا ہے، اور ہر وہ شخص قابل مواخذہ ہو گا جو قدرت و استطاعت کے باوجود اقامتِ دین اور حفاظتِ دین کے لیے جان لڑانے سے گریز کرے گا۔ اس معاملے میں کتب فقیہہ کی ورق گردانی کرنے سے پہلے صاحب موصوف کو قرآن مجید پڑھنا چاہیئے جس میں جہاد سے جی چرانے والوں کو سخت وعیدیں سنائی گئی ہیں حتیٰ کہ انہیں منافق تک ٹھہرایا گیا ہے۔ حالانکہ وہ نماز روزے کے پابند تھے۔ قرآن اس طرح کے حالات میں جہاد ہی کو ایمان کی کسوٹی قرار دیتا ہے اور اس سے دانستہ گریز بلکہ تساہل برتنے والوں کی کسی اطاعت کو بھی لائق اعتنا نہیں سمجھتا۔ اس کے بعد اگر کسی توثیق کی ضرورت صاحب موصوف کو محسوس ہو تو وہ فقہ کی کتابوں میں جہاد کی بحث نکال کر دیکھ لیں کہ اس دارالاسلام پر ہجوم عدو کی صورت میں جہاد فرضِ کفایہ ہے یا فرضِ عین جس زمانے میں فقہ کی یہ کتابیں لکھی گئی تھیں اُس وقت تک اسلامیہ میں سے کسی جگہ بھی اسلامی قانون منسوخ نہیں ہوا تھا اور نہ حدود شرعیہ معطل ہوتی تھیں۔ اس

ہیے انہوں نے صرف ہجوم عدو ہی کی حالت کا حکم بیان کیا ہے۔ لیکن جب کہ مسل
کے اپنے وطن میں کفر کا قانون نافذ اور اسلام کا قانون منسوخ اور اختیار اُن لوگوں
ہاتھ میں ہو جو حدود اللہ کی اقامت کو وحشیانہ فعل قرار دیتے ہیں تو معاملہ ہجوم ع
کی بہ نسبت کئی گناہ زیادہ سخت ہو جاتا ہے، اور اس صورت میں کوئی شخص جو دی
کا کچھ فہم بھی رکھتا ہو، اقامتِ دین کی سعی کو محض فرض کفایہ نہیں کہہ سکتا۔

رہا نظمِ جماعت تو اس کے بارے میں یہ بات واضح ہے کہ احکام کفر کے مقابل
میں احکام الٰہی کے اجرا کی کوشش بہر حال منظم اجتماعی جدوجہد کے بغیر نہیں ہو سکتی
لہٰذا اس کے لیے جماعت کا وجود اور جو جماعت موجود ہو اس کا التزام ضروری ہے
اس مضمون پر کثیر التعداد احادیث دلالت کرتی ہیں۔ البتہ جہاں تمام اہل ایمان کی
ایک جماعت موجود نہ ہو اور اس مقصدِ عظیم کے لیے اجتماعی قوت پیدا کرنے کی مختلف
کوششیں ہو رہی ہوں، تو التزام جماعت کے اُن احکام کا اطلاق تو نہ ہو گا جو الجماعت
کی موجودگی میں شارع نے دیتے ہیں، لیکن کوئی ایسا شخص جو اقامت دین کے معاملے
کی شرعی اہمیت سے واقف ہو اور اس معاملہ میں ایک مومن کے فرض کا احساس رکھتا
ہو، ان کوششوں کے ساتھ بے پروائی کا رویہ اختیار نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے لازم
ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ ان کا جائزہ لے اور جس کوشش کے بھی صحیح و برحق ہونے پر مطمئن
ہو جائے اس میں خود بھی حصّہ لے۔ پھر حصّہ لینے کی صورت میں (یعنی جب کہ آدمی
ایک جماعت کو برحق جان کر اس سے وابستہ ہو چکا ہو) نظم و اطاعت کا التزام نہ کرنا
سراسر ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ یہ اطاعت محض نفل نہیں بلکہ فرض ہے کیونکہ اس
کے بغیر فریضہ اقامت دین عملاً ادا نہیں ہو سکتا۔ احادیث میں اطاعتِ امر کے جو
احکام آتے ہیں اور خود قرآن میں اطاعتِ اولوالامر کا جو فرمانِ خداوندی آیا ہے

ان کے متعلق یہ سمجھنے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ احکام صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد کے لیے تھے۔ اگر یہ بات ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اب نہ کوئی اسلامی حکومت چل سکتی ہے اور نہ کبھی جہاد فی سبیل اللہ ہو سکتا ہے کیونکہ نظام کی پابندی اور سمع وطاعت کے بغیر ان چیزوں کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ میں سخت حیران ہوں کہ کوئی شخص جس کو علم دین کی ہوا بھی لگی ہو، ایسی بے سروپا باتیں کیسے کہہ سکتا ہے۔

دوسرے جن صاحب کا آپ نے ذکر کیا ہے ان کی عقل نے وہ نکتہ پیدا کیا جو ابھی تک موجودہ "امراء المؤمنین" کو بھی نہیں سوجھا ہے۔ اگر یہ بات انہیں سوجھ جائے تو ملک کی تمام جماعتوں کو بیک جنبش قلم ختم کر کے ہمیشہ کے لیے ہر اس شخص کا منہ بند کر دیں جو یہاں احکام اسلامی کے اجراء کا نام لے اور پھر یہاں صرف رقص و سرود اور فسق و فجور ہی ہوتا رہے۔ اس کے بعد تو یہاں اطمینان کے ساتھ انگریزی دور کے قوانین چلتے رہیں گے۔ اور شریعت کے نفاذ کی جد وجہد کرنے والے دنیا ہی میں نہیں آخرت میں بھی سیہ رو اور مستحق عذاب ٹھہریں گے، کیونکہ شرعاً وہ نفاذ شریعت کی سعی کرنے کے مجاز ہی نہ ہوں گے۔ مجھے تو یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ جن صاحب کی عقل و خرد کا یہ حال تھا وہ جماعت کو چھوڑ کر دور چلے گئے۔

اب آپ کے سوالات کا مختصر جواب عرض ہے۔

۱۔ فریضہ اقامت دین کی حیثیت سمجھنے میں آپ کو الجھن اس لیے پیدا آئی ہے کہ آپ ارکان اسلام اور فرائض اہل ایمان میں فرق نہیں کر رہے ہیں۔ ارکان اسلام وہ ہیں جن پر اسلامی زندگی کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اور فرائض اہل ایمان وہ مقتضیات ایمان ہیں جنہیں اسلامی زندگی کی تعمیر کے بعد پورا کیا جانا چاہیے۔ ارکان اسلام قائم نہ

ہوں تو سرے سے اسلامی زندگی کی عمارت کھڑی ہی نہ ہوگی۔ لیکن اس عمارت کے کھڑ
ہو جانے کے بعد اگر مقتضیاتِ ایمان پورے نہ کیے جائیں تو یہ ایسا ہوگا جیسے جنگل
میں ایک بے مصرف اور ویران عمارت کھڑی ہے۔ فریضۂ اقامتِ دین اسلام
کا ستون نہیں ہے بلکہ وہ اسلام کی عمارت تعمیر کرنے کے مقاصد میں سے اہم ترین
مقصد ہے اور مزید برآں اسی پر اس عمارت کے استحکام اور اس کی آبادی اور اس
کی توسیع کا انحصار ہے۔ اگر اس فرض کو مہمل چھوڑ دیا جائے تو اسلام کی عمارت بتدریج
بوسیدہ ہو جائے گی، اور اس میں فسق و کفر کو قدم جمانے کا موقع مل جائے گا، اور اس
کے وسیع ہو کر جمیع خلائق کے لیے پناہ گاہ بننے کا تو کوئی امکان ہی نہ ہوگا۔ اسی لیے اس
کام کو اسلام میں مسلمان کی زندگی کے مقصد کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ جعلناکم
امت وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس۔ اور کنتم خیر امۃ اخرجت للناس
تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔

۲۔ اسلامی ریاست کی ایک حالت وہ ہوتی ہے جس میں ریاست صرف
نظریے کے اعتبار ہی سے اسلامی نہ ہو بلکہ عملاً حکومت بھی اسلامی ہو۔ صالح و متقی
اہل ایمان اس کو چلا رہے ہوں، شوریٰ کا نظام اپنی حقیقی اسلامی روح کے ساتھ قائم
ہو اور پورا نظام حکومت ان مقاصد کے لیے کام کر رہا ہو جس کی خاطر اسلام اپنی
ریاست قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس صورت میں ریاست کا صدر ہی تمام اہل ایمان کا
لیڈر ہوگا اور اس کی قیادت میں تمام اہل ایمان ایک جماعت ہوں گے۔ اس وقت
جماعت کے اندر جماعت بنانے کی ہر کوشش غلط ہوگی اور ایک امام کے سوا کسی دوسرے
کی بیعت یا اطاعت کا کوئی جواز نہ ہوگا۔ دوسری حالت وہ ہے جس میں ریاست
صرف نظریے کے اعتبار سے اسلامی ہو۔ باقی خصوصیات اس میں نہ پائی جاتی ہوں۔

اس حالت کے مختلف مدارج ہیں اور ہر درجے کے احکام الگ ہیں۔ بہرحال ایسی حالت میں اصلاح کے لیے منظم اجتماعی کوشش کرنا ناجائز تو کسی طرح نہیں ہے اور بعض صورتوں میں ایسا کرنا فرض بھی ہو جاتا ہے۔ اسے ناجائز قرار دینے کا خیال اسلامی ریاست کے فاسق حکمران کریں تو کریں، لیکن یہ عجیب بات ہو گی کہ اس کے صالح شہری بھی اسے ناجائز مان لیں، درآنحالیکہ اس کے عدم جواز کی کوئی شرعی دلیل سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اگر یہ چیز ناجائز ہو تو آخر ان ائمہ مجتہدین کا کیا مقام قرار پائے گا۔ جنھوں نے بنی اُمیّہ کے خلاف اُٹھنے والوں کی خفیہ اور اعلانیہ تائید کی؟

نماز کے بارے میں شرعی حکم یہی ہے کہ جہاں تک اذان کی آواز پہنچتی ہو وہاں کے لوگوں کو مسجد میں حاضر ہونا چاہیے۔ الّا یہ کہ کوئی عذرِ شرعی مانع ہو۔ عذر شرعی یہ ہے کہ آدمی بیمار ہو، یا اسے کوئی خطرہ لاحق ہو، یا کوئی ایسی چیز مانع ہو جس کا شریعت میں اعتبار کیا گیا ہو۔ بارش اور کیچڑ پانی ایسے ہی موانع میں سے ہے۔ چنانچہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ اس حالت میں اذان کے ساتھ الا صلوا فی رحالکم کی آواز لگا دیتے تھے تاکہ لوگ اذان سن کر اپنی اپنی جگہ ہی نماز پڑھ لیں۔ جماعت کے لوگ اگر اجتماع کرتے رہیں اور نماز با جماعت پڑھنے کے بجائے بعد میں فرداً فرداً نماز پڑھ لیا کریں تو یہ چیز سخت قابلِ اعتراض ہے۔ اس کی اصلاح ہونی چاہیے۔

کبائر میں جھوٹ بہت بڑا گناہ ہے۔ حتیٰ کہ اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے علامتِ نفاق میں شمار کیا ہے اس کے جواز کی گنجائش صرف اسی صورت میں نکلتی ہے، جب کہ جھوٹ سے بڑی کسی برائی کو رفع کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہو۔

مثلاً کسی مظلوم کو ظالم کے چنگل سے چھڑانا، یا میاں بیوی کے درمیان تعلقات کی خرابی کو روکنا وغیرہ۔

اگر کسی کے پاس مقدار نصاب سے کم سونا ہو تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے خواہ اس کی قیمت چاندی کے نصاب کی قیمت سے کتنی ہی زیادہ ہو۔

کسی نماز میں کسی خاص سورت کا التزام کر لینا درست نہیں ہے۔ عادۃً پڑھنے میں مضائقہ نہیں مگر کبھی کبھی اس کے خلاف بھی کر لینا چاہیئے۔ تاکہ بدعت کی سی صورت نہ پیدا ہو۔

فطرے کی مقدار میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ عرب میں جو اوزان اور پیمانے اس وقت رائج تھے ان کو موجودہ زمانے کے اوزان اور پیمانوں کے مطابق بنانے میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ مختلف اہل علم نے اپنی تحقیق سے جو کچھ اوزان بیان کیے ہیں، عام لوگ ان میں سے جس کے مطابق بھی فطرہ دیں گے، سبکدوش ہو جائیں گے۔ اس معاملہ میں زیادہ تشدد کی ضرورت نہیں ہے۔ فطرہ ہر اُس شخص کو دینا چاہیئے جو عید کے روز اپنی ضرورت پوری کرنے کے بعد فطرہ نکالنے کی استطاعت رکھتا ہو اور بیوی مستطیع ہو تو وہ بیوی ہی پر واجب ہو گا، کیونکہ اس کے شوہر کا نفقہ اس کے ذمہ نہیں ہے۔ لیکن میرے خیال میں اسے اولاد کا فطرہ نکالنا چاہیئے۔

(ترجمان القرآن شوال ۱۳۷۶ھ۔ جولائی ۱۹۵۷ء)

تبلیغی جماعت کے ساتھ تعاون

سوال:- ایک بات عرصہ سے میرے ذہن میں گشت کر رہی ہے جو بسا اوقات میرے لیے ایک فکر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ میں اللہ سے خصوصی طور

پر اس امر کے لیے دعا کرتا ہوں کہ وہ اُن ذی علم اور با صلاحیت حضرات کو اس طرف متوجہ کر دے جن کی کوششوں میں بہت سی تاثیر پوشیدہ ہے، جن کے قلب و دماغ کی طاقت سے بہت کچھ بن سکتا ہے اور بگڑ سکتا ہے۔ امت کی اصلاح بھی ہو سکتی ہے، تفرقے بھی مٹ سکتے ہیں تعمیری انقلاب بھی برپا ہو سکتا ہے اور وہ سب کچھ ہو سکتا ہے جو ناممکن نظر آتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کی قوتِ فکر کی یکجائی اور ہم آہنگی کے لیے ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں۔

جس بات کو ہم کہنا چاہتے ہیں وہ بہت بڑی اور الجھی ہوئی ہے اور مجھ جیسے کم صلاحیت انسان کے لیے یہ ہرگز زیبا نہیں کہ ایسے اہم معاملہ پر قلم اٹھاتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی رحمت کے بھروسے ہم نے یہ مخاطبت شروع کی ہے۔ شاید کہ وہ کوئی مفید نتیجہ پیدا کر دے

آپ نے اپنی تحریرات میں متعدد جگہ اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ یہ کام ہم نے اللہ کے لیے اور اللہ کے ہی بھروسہ پر شروع کیا ہے اگر مجھ سے غلطی ہو رہی ہے تو وہ میری اصلاح کر دے۔ نیز آپ نے اس طرح کے اختلاف پر بھی فراخدلی کے ساتھ غور و خوض کرنے کا علی الاعلان اطمینان دلایا ہے جو حق پسندی اور نیک نیتی پر مبنی ہو، اور ہم اس بات پر پوری طرح مطمئن ہیں کہ آپ نے واقعتاً ایسے مواقع پر کسی طرح کی تنگدلی کا اظہار نہیں فرمایا ہے۔

آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ میں نے دین کا ابتدائی شعور تبلیغی جماعت

سے حاصل کیا۔ اب تک میرا تعلق اس جماعت سے قائم ہے۔ اللہ اس کو قائم رکھے اور اس سے زیادہ کی توفیق عطا فرماتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرا گہرا ربط جماعت اسلامی سے بھی پیدا ہو چکا ہے اور اب میرا زیادہ وقت اسی جماعت کے کاموں میں صرف ہوتا ہے میں فخر نہیں کرتا بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جماعت اسلامی اب ایک زندہ جماعت ہے اور دیندار طبقہ کی نگاہ بھی اب اس طرف مرکوز ہو رہی ہے۔ لیکن جو بات کہ میرے نزدیک انتہائی افسوسناک ہے وہ تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی کی کشاکش ہے۔ ہم نے اس سلسلہ میں اپنے تبلیغی احباب سے جو اس حلقہ میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں گفتگو کی اور بالکل بے تکلفانہ یہ اعتراض کیا کہ آپ غیر مسلموں کے قبولِ اسلام اور ہدایت کے لیے دعا کر سکتے ہیں لیکن آپ کے دل میں وسعت نہیں ہے تو صرف جماعت اسلامی کے لیے۔ آپ ایک فاسق و فاجر مسلمان کے عقیدہ و عمل کی اصلاح کے لیے ہر طرح کی محنت کر سکتے ہیں اور مشقت اٹھا سکتے ہیں۔ ان کی ہر بداخلاقی اور ٹھوکر کو برداشت کر سکتے ہیں۔ لیکن جماعت اسلامی جو آپ کی نگاہ میں گمراہ ہے وہ قابلِ توجہ نہیں ہے اور نہ اس کی ضرورت آپ کے نزدیک ہے۔ ان سے ملنا ان کی باتوں کو سننا اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کو سمجھنا بھی آپ کے نزدیک گمراہی کو دعوت دینا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جماعت اسلامی کے احباب کی حالت بھی اس لحاظ سے ان سے کچھ بہتر نہیں ہے۔

ہم اپنے تجربہ کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ تبلیغی لوگوں کو دیکھ کر ان میں ایک حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہم نے ہر چند ان سے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ تبلیغی جماعت دین ہی کی تبلیغ تو کرتی ہے، کوئی بد دینی تو نہیں پھیلاتی اگر صرف کلمہ اور نماز کی ہی حد تک مان لیا جائے تو کیا یہ دین کی تبلیغ نہیں ہے؟ کیا یہ بنیادی چیز نہیں ہے جس کے بغیر کوئی مسلمان خواہ وہ علم و عمل کے کسی مقام پر ہو، زندہ نہیں رہ سکتا؟ کیا ان کی شب و روز کی محنتیں خالصتاً لوجہ اللہ نہیں ہیں۔ ہم نے مانا کہ ان کے دماغ میں وہ وسعت نہیں ہے لیکن ایک کمزور اور نحیف شخص کی کمزور سی محنت جو دین کے لیے ہو کیا یہ اللہ کی بارگاہ میں قابلِ قبول نہیں ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ ایک سادہ لوح انسان جو اپنی تمام بیوقوفیوں اور کمزوریوں کے ساتھ اللہ کی رضا کے لیے اس کے دین کی سربلندی کی کوشش کرے وہ شاید اس اعتبار سے بڑھ جائے گی کہ اس میں آمیزش کا امکان نہیں ہے۔ بخلاف اس کے ایک ذی علم اور باصلاحیت انسان کے اس توشۂ معاد میں آمیزش کا امکان ہو سکتا ہے۔ اس کو اپنے علم و عمل و حکمت پر تکبر آ سکتا ہے۔

بہرحال یہ بات تو اپنے اپنے لیے ہوتی۔ جہاں تک دینی مفاد کا تعلق ہے نہ معلوم میرا یہ خیال کس حد تک صحیح ہے کہ ایسے ہی لوگ اگر ان کے ذہن میں اسلامی نظام کی اہمیت پیدا ہو جائے تو میرے لیے ممد ہو سکتے ہیں۔ ایسا مخلص گروہ جو اس دنیا میں رہتے ہوتے

دنیا کی ہوس نہ کرے بلکہ جو کچھ سوچے سمجھے اور چاہے وہ صرف آخرت کے لیے، اس سے زیادہ مفید انسان بنے بنائے اور کہاں مل سکتے ہیں۔ ہم اس پر اصرار تو نہیں کر سکتے لیکن اپنے علم و فہم کی حد تک اس خیال کو بہت قریب پاتے ہیں کہ خلافتِ راشدہ کا قیام ایسے ہی لوگوں پر تھا۔

میری اس مخاطبت کا اصل مدعا یہ ہے کہ اگر ہم ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں اور ان کو بڑھ کر اپنا لینے کی کوشش کریں تو یہ کس حد تک ممکن العمل اور موجبِ خیر ہوگا؟ میرا یہ مقصد نہیں کہ ایک جماعت دوسرے میں ضم ہو جائے۔ نہیں بلکہ جو جس طور پر کام کر رہا ہے کرتا جائے۔ اپنے اپنے حدود میں رہتے ہوئے ہم ان کے ہمدرد ہو جائیں اور وہ ہمارے دعا گو بن جائیں۔ مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان سے اختلاف کا مٹ جانا ہی بہت بڑی چیز ہے۔

جواب: دوسری دینی جماعتوں کے متعلق میرا نقطۂ نظر ہمیشہ سے یہ رہا ہے اور اس کا اظہار بھی کرتا رہا ہوں کہ جو جس درجہ میں بھی اللہ کے دین کی کوئی خدمت کر رہا ہے بسا غنیمت ہے۔ مخالفِ دین تحریکوں کے مقابلے میں دین کا کام کرنے والے سب حقیقت میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں، اور انہیں ایک دوسرے کو اپنا مددگار ہی سمجھنا چاہیئے۔ رقابت کا جذبہ اگر پیدا ہو سکتا ہے تو اسی وقت جبکہ ہم خدا کے نام پر دکانداری کر رہے ہوں۔ اس صورت میں تو بے شک ہر دوکاندار یہی چاہیے گا کہ میرے سوا اس بازار میں کوئی اور دوکان نظر نہ آئے۔ لیکن اگر ہم یہ دوکانداری

نہیں کر رہے ہیں بلکہ اخلاص کے ساتھ خدا کا کام کر رہے ہیں تو ہمیں خوش ہونا چاہیئے کہ ہمارے سوا کوئی اور بھی اسی خدا کا کام کر رہا ہے۔ اگر کوئی کلمہ پڑھوا رہا ہے تو وہ بھی بہر حال خدا ہی کی راہ میں ایک خدمت انجام دے رہا ہے اور اگر کوئی وضو اور غسل کے مسائل بتا رہا ہے تو وہ بھی اس راہ کی ایک خدمت ہی کر رہا ہے۔ آخر اس کو مجھ سے اور مجھے اس سے رقابت کیوں ہو اور ہم ایک دوسرے کی راہ میں روڑے کیوں اٹکائیں؟ کلماتِ خبیثہ کی اشاعت کرنے والوں کے مقابلہ میں تو کلمہ طیبہ پڑھوانے والا بھی مجھے محبوب ہی ہونا چاہیئے۔

میں نے جماعت اسلامی کے کارکنوں میں بھی ہمیشہ یہی جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے خلاف کسی روش کو میں نے کبھی پسند نہیں کیا ہے۔ اگر آپ نے کہیں جماعت میں اس سے مختلف کوئی جذبہ و عمل پایا ہو تو مجھے تعینِ مقام و اشخاص کے ساتھ اس کی خبر دیجیے تاکہ میں اس کی اصلاح کر سکوں۔

خاص طور پر تبلیغی جماعت کا چونکہ آپ نے ذکر کیا ہے اس لیے میں عرض کرتا ہوں کہ اس جماعت کے حق میں بھی میں نے ہمیشہ اپنے دل میں جذبۂ خیر ہی کو جگہ دی ہے اور اپنی زبان و قلم سے اس کے لیے کلمۂ خیر ہی ادا کیا ہے۔ مولانا محمد الیاس مرحوم کی زندگی میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ میوات کے علاقے میں ان کے ساتھ دورہ کر کے ان کے کام کا قریب سے مطالعہ کیا تھا۔ اس کے بعد ان کے کام میں جو پہلو میں نے خیر و برکت کے محسوس کیے تھے ان کا "ترجمان" کے ذریعے سے تفصیلی تعارف کرایا تھا اور جن پہلوؤں سے کوئی کمی یا تشنگی محسوس کی تھی، انہیں خاموشی کے ساتھ صرف مولانا مرحوم کی خدمت میں عرض کر دینے پر اکتفا

کیا تھا[1]۔ اس کے بعد سے آج تک کوئی مثال اس امر کی پیش نہیں کی جا سکتی کہ میں نے اس جماعت کے خلاف یا اس کے رہنماؤں کے خلاف کوئی بات کبھی کہی ہو یا لکھی ہو یا جماعت اسلامی کے کارکنوں نے کبھی اس کے کام میں روڑے اٹکاتے ہوں۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تبلیغی جماعت کا رویہ میرے اور جماعت اسلامی کے ساتھ اس سے بہت مختلف رہا ہے۔ اس کے عام کارکنوں ہی نے نہیں، اس کے اکابر تک نے جماعت اسلامی کے ساتھ متعدد مواقع پر ایسی روش اختیار کی ہے۔ جس کی مجھے ایک دفعہ تحریری شکایت بھی کرنی پڑی[2]۔ مگر انہوں نے کوئی اصلاح نہ کی۔ حال ہی اس کے ایک ممتاز رہنما نے اپنے رسالے میں مجھ پر اور جماعت اسلامی پر پے درپے جو عنایات فرمائی ہیں وہ بھی آپ نے دیکھی ہوں گی۔ پچھلے دنوں مشرقی پاکستان میں یہ حضرات جماعت اسلامی کے خلاف علماء دیوبند کے فتووں کی کاپیاں بھی بڑی تعداد میں پھیلا چکے ہیں۔ حالانکہ وہاں کی بڑھتی ہوئی بے دینی کی رَو کو روکنے کے لیے جماعت جو کوششیں کر رہی تھی کوئی خیر خواہ دین اگر ان کوششوں میں اس کا ہاتھ نہ بٹا سکتا تھا تو کم از کم اسے اس موقع پر بے دینوں کے مقابلے میں اس جماعت کو زک پہنچانے کی کوشش تو نہ کرنی چاہیے تھی۔ ان ساری باتوں کے بعد اب آپ مجھ سے کہتے ہیں کہ ہم ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔ دشمنی کا ہاتھ تو اُدھر سے بڑھتا رہا ہے اور اب بھی بڑھا ہوا ہے۔ دوستی کا ہاتھ آخر کہاں جا کر اس سے ملے؟ افسوس کہ

---

[1] ملاحظہ ہو ترجمان القرآن شعبان ۱۳۵۸ھ، اکتوبر ۱۹۳۹ء۔

[2] ملاحظہ ہو "رسائل و مسائل" جلد دوم صفحہ ۶۰۰-۵۹۲۔

ان کے ہاں کا اکرام مسلم بھی فسق و فجور کے علم برداروں کے لیے ہے، ہمارے لیے نہیں ہے اور کچھ نہیں تو یہ حضرات کم از کم یہی سوچیں کہ جس طرح وہ مجھے اور جماعت اسلامی کو مطعون فرماتے ہیں اگر اسی طرح میں بھی ان کو اور ان کی جماعت کو مطعون کرنا شروع کر دوں تو آخر کار اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ عام لوگوں کی نگاہ میں دونوں ہی ساقط الاعتبار ہو کر رہیں گے اور دین کا کام کرنے کے لائق نہ ہم رہیں گے نہ وہ۔ یہی کچھ نتائج دینی جماعتوں کے ایک، دوسرے پر حملہ آور ہونے اور ایک دوسرے کی بیخ کنی کرنے سے برآمد ہو سکتے ہیں۔ اس کا حاصل بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ بحیثیت مجموعی تمام اہل دین کی عزت، اور ان کا اعتماد عوام کی نگاہ میں ختم ہو جائے اور لادینی کی تحریکیں اس سے فائدہ اٹھائیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں صبر کے ساتھ اُن حملوں کو ٹالتا رہتا ہوں جو مجھ پر کیے جاتے ہیں اور جماعت کے لوگوں کو بھی صبر کی تلقین کرتا رہتا ہوں، ورنہ ظاہر ہے کہ اگر میں ان حضرات کو مطعون کرنے پر اُتر آؤں تو ان میں سے کوئی صاحب بھی زبانِ وحی سے کلام نہیں فرماتے ہیں کہ گرفت کرنے کے لیے کہیں کوئی گنجائش مجھے نہ مل سکے۔

(ترجمان القرآن، جلد ۵۰۔ عدد ۶۔ ستمبر ۱۹۵۸ء)

امارت شرعیہ بہار کا سوالنامہ اور اس کا جواب

دار الافتا امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ (ہند) کے پاس جماعت اسلامی سے متعلق سوالات آتے رہتے ہیں جن میں اس طرف زیادتی ہے۔ سوالات

میں زیادہ جماعت اسلامی اور اس کے ممبروں کی دینی حیثیت کے متعلق دریافت کیا جاتا ہے۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ جماعت اسلامی کے ذمہ داروں سے براہ راست ذیل کے دفعات (جن کے متعلق سوالات آتے ہیں) سے متعلق استفسار کرایا جائے اور آپ حضرات سے ان کے جوابات طلب کر لیے جائیں تاکہ ان جوابات کی روشنی میں ہمیں جماعت اسلامی اور اس کے ممبروں اور ہمدردوں کی دینی حیثیت کے متعلق رائے قائم کرنے میں اور شرعی حکم بتلانے میں سہولت ہو۔ ہمارے خیال میں اس طرح اطمینان حاصل کیے بغیر کوئی شرعی حکم لگانا احتیاط کے خلاف ہوگا۔ آپ سے عرض ہے کہ مندرجہ ذیل سوالات کے جواب پورے اختصار کے ساتھ حتی الامکان محض نفی واثبات میں اس طرح تحریر فرمائیں کہ ہمیں واضح طور پر معلوم ہو جائے کہ اس مسئلہ میں جماعت اور اس کے ذمہ داروں کا مسلک اور رائے یہ ہے۔ یہ خیال رہے کہ بعض دفعہ تطویل سے بات واضح ہو جانے کے بجائے اور مشتبہ ہو جاتی ہے۔ ہمارا مقصد آپ پر کوئی اعتراض کرنا نہیں ہے بلکہ جماعت کے متعلق مندرجہ ذیل مسائل میں تشفی کرنا ہے، اور جماعت اور اس کے ممبروں کی دینی حیثیت بتلانے میں اپنے لیے سہولت مہیا کرنا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ ہمدرد کے سوالات سمجھ کر جواب تحریر فرمائیں گے۔

۱۔ آپ حضرات کے خیال میں صحابہ کرام علیہم الرضوان کا اجماع شرعی طور پر حجت ہے یا نہیں؟

۲۔ صحابہ کرام (علیہم الرضوان) کو بُرا بھلا کہنے والا، ان کی طرف ایسی باتوں کو منسوب کرنے والا جو دینداروں کی شان سے بعید ہیں فاسق و گنہگار ہے یا نہیں؟

۳۔ فرائض کا تارک اور گناہ کبیرہ کا مرتکب آپ حضرات کے خیال میں مسلمان ہے یا نہیں؟

۴۔ تصوّف (مروجہ نہیں) جس کی دوسری تعبیر احسان و سلوک بھی ہے، جس کی تعلیم اکابر نقشبندیہ چشتیہ سہروردیہ قادریہ وغیرہ نے دی ہے، جیسے حضرت شیخ شہاب الدین محمد نقشبند۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی حضرۃ شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی علیہم الرحمۃ اس تصوف کو آپ حضرات دین کے لیے مفید سمجھتے ہیں یا مضر؟

۵۔ کسی روایت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف انتساب کرنے میں اوّل درجہ صحت روایت کو ہے یا درایت کو۔ وہ درایت جو حدیث کی صحت کی جانچ کے لیے مدار بنے آپ کے نزدیک اس کی تعریف کیا ہے؟

۶۔ جماعت اسلامی کے ممبروں اور ہمدردوں کے سوا ہندوستان کے عام مسلمان جو اپنے کو اہل سنت والجماعت کہتے ہیں اور جو آپ کی اصطلاح میں محض نسلی مسلمان ہیں وہ شرعی اعتبار سے دائرہ اسلام میں ہیں یا اس سے خارج؟

۷۔ آپ کے نزدیک معیارِ حق ہونے کا مطلب کیا ہے اور اس مطلب کے مطابق صحابہ کرام معیارِ حق ہیں یا نہیں؟

۸۔ ایک مسلمان کے لیے مسلمان ہونے کی حیثیت سے نفس تقلید فرض ہے یا نہیں اور تقلید شخصی کا درجہ آپ کے نزدیک کیا ہے اور آپ کے نزدیک تقلید شخصی کو واجب کہنے والے لائق تحسین ہیں یا قابلِ ملامت؟

۹۔ کیا آپ اس کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بالارادہ انبیاء کرام سے لغزش کرائی ہے۔

۱۰۔ نماز، روزہ، زکواۃ، حج اور جہاد ان عبادات میں شرعاً مقصود بالذات کون سی عبادت ہے اور اولی درجہ کس کو حاصل ہے کیا نماز، روزہ، حج، زکواۃ اسلام میں مقصود نہیں بلکہ ان کی حیثیت ذرائع اور وسائل کی ہے، مقصود دراصل جہاد ہے؟ یہ عقیدہ آپ کا ہے یا نہیں؟

۱۱۔ کلمہ شہادت پر اقرار کے چار پانچ روز یا چار پانچ گھنٹے بعد ایک شخص کی وفات ہو گئی اور باوجود استطاعت کے اس نے ایک مسلمان قرض خواہ کے قرض کو ادا نہیں کیا۔ آپ اس کو مسلمان سمجھتے ہوئے جنازہ کی نماز پڑھیں گے یا نہیں؟

۱۲۔ ایسے مسلمان جو سرکاری دفاتر میں ملازم ہیں یا گورنمنٹ کی عدالتوں میں جج اور مجسٹریٹ ہیں اور ان کے ہاتھوں قانون ہند کا

نفاذ ہوتا ہے یا مجالس قانون ساز کے رکن ہیں اور قانون سازی میں حصہ لیتے ہیں یہ لوگ آپ کے نقطہ نظر سے دائرہ اسلام میں داخل ہیں یا نہیں؟

اور آپ حضرات کے نزدیک شرعی نقطہ نظر سے ایسے لوگوں کا کیا حکم ہے

جواب: یاد فرمائی کا شکریہ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دوسروں کے متعلق فتوے دینے کی ذمہ داری آپ حضرات خواہ مخواہ اپنے ذمہ لیتے ہی کیوں ہیں۔ اگر کوئی شخص آپ لوگوں کے متعلق مجھ سے دریافت کرے تو میں پہلے ہی معذرت پیش کر دوں گا اور کوئی سوالنامہ مرتب کر کے آپ کے پاس نہ بھیجوں گا۔ تاہم چونکہ آپ نے یہ سوالات بھیجنے کی تکلیف اٹھائی ہے اس لیے مختصر جوابات حاضر ہیں۔

۱۔ جی ہاں۔ میرے نزدیک صحابہ کرام کا اجماع حجت ہے۔

۲۔ صحابہ کرام کو برا کہنے والا میرے نزدیک صرف فاسق ہی نہیں ہے، بلکہ اس کا ایمان بھی مشتبہ ہے۔ مَن ابغضهم فَبِبغضي ابغضهم

۳۔ ہم اسے مسلمان مانتے ہیں، مگر اس کی اصلاح کے لیے کوشش کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

۴۔ ہمارے نزدیک ہر وہ چیز جو کتاب اللہ وسنت رسول اللہ سے مطابقت رکھتی ہے وہ مفید ہے اور جو مطابقت نہیں رکھتی وہ مضر ہے۔ اسی کلیے میں تصوف بھی آجاتا ہے۔ تصوف میں بھی کتاب وسنت کے مطابق جو کچھ ہے، حق ہے، اس کا مفید ہونا شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ لیکن جو آمیزش بھی کتاب وسنت سے ہٹی ہوئی ہے اس سے ہم اجتناب کرتے ہیں، اور دوسروں کو بھی اس سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔

۵۔ احادیث کی تحقیق میں دیکھنے کی پہلی چیز حدیث کی سند ہے۔ اس کے بعد درایت کا درجہ آتا ہے۔ درایت سے مراد یہ ہے کہ حدیث کے مضمون پر غور کر کے دیکھا جاتا ہے کہ وہ قرآن مجید، اور سنّتِ ثابتہ کے خلاف تو نہیں پڑتی؛ اس کی تائید کرنے والی دوسری روایات موجود ہیں یا نہیں؟ کوئی بات اگر فرمائی گئی ہے یا کوئی عمل اگر کیا گیا ہے تو کس موقع پر کیا گیا ہے اور اس موقع سے اس کی مناسبت کیا ہے وغیرہ۔

۶۔ جماعت اسلامی میں شامل ہونا ہمارے نزدیک مسلمان ہونے کے لیے شرط نہ کبھی تھا نہ اب ہے، نہ ہم اس حماقت میں انشاء اللہ کبھی مبتلا ہو سکتے ہیں کہ جو اس جماعت میں نہیں ہے وہ مسلمان نہیں ہے۔ جماعت سے باہر کے تمام مسلمانوں کو ہم نے "نسلی مسلمان" نہیں کہا ہے بلکہ ان لوگوں کو کہا ہے جو دین کے علم و عمل سے بے بہرہ ہیں اور اپنے اخلاق و عادات اور اعمال میں اسلام کی کھلی کھلی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

۷۔ ہمارے نزدیک معیارِ حق سے مراد ہے وہ چیز جس سے مطابقت رکھنا حق ہو اور جس کے خلاف ہونا باطل ہو۔ اس لحاظ سے معیارِ حق صرف خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت ہے۔ صحابہ کرام معیارِ حق نہیں ہیں بلکہ کتاب و سنت کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ کتاب و سنت کے معیار پر ہی جانچ کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ گروہ برحق ہے۔ ان کے اجماع کو ہم اس بنا پر حجت مانتے ہیں کہ ان کا کتاب و سنت کی ادنیٰ سی خلاف ورزی پر بھی متفق ہو جانا ہمارے نزدیک ممکن نہیں ہے۔

۸۔ مسلمان کے لیے مسلمان ہونے کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید فرض ہے۔ رہی ائمہ مجتہدین میں سے کسی کی تقلید تو ہم ایسے مسلمانوں کے لیے اس کو ضروری سمجھتے ہیں جو خود مسائل شرعیہ کی تحقیق کرنے کے اہل نہ ہوں۔ رہے تحقیق کی قابلیت رکھنے والے لوگ، تو اگر وہ کسی امام مجتہد کے اقوال کی صحت پر مطمئن ہوں تو ہمارے نزدیک ان کا اتباع قابل اعتراض نہیں ہے۔ لیکن اگر تحقیق سے وہ کسی مسئلے میں اپنے امام کے سوا کسی دوسرے امام کے قول کو اوفق بالکتاب والسنہ سمجھتے ہوں، لیکن قصداً اپنے امام ہی کی تقلید کریں تو یہ ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے

۹۔ جی نہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں کام کرتے ہیں، اس لیے ان سے لغزش کا صدور اس بنا پر نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ کسی وقت ان سے غافل ہو گیا تھا، بلکہ اس بنا پر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے وہ لغزش ان سے صادر ہو جانے دی تاکہ دنیا پر یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ وہ بندے اور بشر ہی ہیں، خدائی صفات کے حامل نہیں ہیں۔

۱۰۔ میرے نزدیک مقصود دراصل اقامتِ دین ہے اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ اس دین کے ارکان ہیں جن پر یہ دین قائم ہوتا ہے اس لیے ان کو قائم کرنا اقامتِ دین کے لیے مطلوب ہے اور جہاد چونکہ دین کو اس کے پورے نظام کے ساتھ قائم کرنے کا ذریعہ ہے اس لیے وہ بھی اقامت دین ہی کے لیے مطلوب ہے۔ سوال کے آخری حصہ کا جواب حضرت معاذ بن جبل والی حدیث میں موجود ہے۔ الا ادلک براس الامر وعمودہ وذروۃ سنامہ؟ قال بلیٰ یا رسول اللہ۔ قال راس الامر الاسلام وعمودہ الصلوٰۃ وذروۃ

سنامہ الجہاد۔

۱۱۔ یقیناً میں اس کی نماز جنازہ پڑھوں گا۔

۱۲۔ میرے نزدیک وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں۔ میں ان کو مسلمان سمجھتے ہوتے ہی یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ تم وہ کام کر رہے ہو جو مسلمان کے کرنے کا نہیں ہے۔

(ترجمان القرآن۔ اگست ۶۱ء)

نظامِ اسلامی
مشاہیرِ اسلام کی نظر میں

مراکش سے انڈونیشیا تک

عالمِ اسلام کے ممتاز رہنماؤں کی نگارشات کا ایسا مجموعہ ـــــ جس میں

- اسلام کے جمالِ جہاں تاب کی دلکش تصویر کھینچی گئی ہے ـــــ
- احیائے دین کے لئے عالمِ اسلامی کے حقیقی جذبات کی عکاسی کی گئی ہے ـــ
- ملت کے پُرجوش ولولوں اور عزائم کی بیباک ترجمانی کی گئی ہے ـــ
- حرارتِ ایمانی سے لبریز پُرجوش خطبات و تقاریر ـــــ
- دولتِ یقین سے مالا مال مقالات ـــــ
- ملتِ اسلامیہ کے جسدِ خوابیدہ کو دعوتِ انقلاب و عمل ـــ
- معاندینِ اسلام کا بھرپور اور مدلل جواب
- اردو میں اپنی نوعیت کی واحد کتاب

چند اہم شخصیتیں جن کے مقالات درج ہیں

ڈاکٹر معروف دوالیبی، سابق وزیرِ اعظم شام ـ ڈاکٹر محمد ناصر سابق وزیرِ اعظم انڈونیشیا ـ ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی ـ پروفیسر مصطفےٰ احمد زرقاء
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ـ شیخ محمد ابو زہرہ وغیرہ وغیرہ۔

مرتبہ:ـ **مولانا خلیل احمد حامدی** ۔۔ ۵۰۰ صفحات سے زائد ـــــ قیمت صرف ۶/۵۰ روپیے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ـ ۳ ـ ای ـ شاہ عالم مارکیٹ ـ لاہور